یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

تفسیر القرآن
پارہ الٓمٓ (۱) تا لا یحب اللہ (٦)
مصنفہ
سید المفسرین
ادیب اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی
بانی جامعہ امامیہ وصدر جامعہ امامیہ کمیٹی
مصنف دوسوسترہ (۲۱۷) کتب
جلد اول
ناشر
ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ناظم آباد ۵ کراچی

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر القرآن

جلد اوّل

مفسّر

الحاج حضرت ادیبِ اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی

میں نے اِس تفسیر القرآن جلد اول کے متن کو بغور پڑھا ہے
اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس کے متن میں کوئی کمی
بیشی اور کتابت میں کوئی غلطی نہیں ہے

حافظ عبدالرؤف خاں بقلم خود

مورخہ ۱۶ ر جنوری سنہ ۱۹۷۷ء

(حافظ عبدالرؤف خاں)

ناشر: ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
ناظم آباد ۲ کراچی

مطبع : قریشی آرٹ پریس ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

کاتب : محمود ابن الماس رقم

بار : دوم — ہدیہ /۱۴۰ روپے — جولائی ۱۹۸۹ء

فہرست مضامین

آج تک ان کا قلم چلتا ہی رہا۔ چند کتابوں نے خصوصیت سے شہرت حاصل کی جیسے،

مصباح المجالس چہار جلد۔ تحفۃ الابرار ترجمہ جامع الاخبار۔ مجمع الفضائل ترجمہ مناقب ابن شہر آشوب۔ محافل و مجالس۔ الشافی ترجمہ اصولِ کافی ہر دو جلد۔ الشافی ترجمہ فروع کافی ہر دو جلد۔ رموز القرآن۔ حقائق القرآن۔ مجمع الآیات۔ قصص القرآن —— کافی کے ترجمہ کی طرف سب سے پہلے آپ ہی نے توجہ کی۔

۳۔ قومی معاملات کی طرف بھی آپنے پوری توجہ سے کام لیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب آپ بہ سلسلۂ ملازمت کانپور پہنچے تو وہاں مومنین کو توجہ دلاکر ایک شیعہ اسکول چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کھلوایا۔ ۱۹۲۰ء میں جب بہ سلسلۂ ملازمت مراد آباد آئے تو امروہہ میں شیعہ آرٹ سکول کھولا۔ ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں قیام کیا تو حضرت ثقۃ الاسلام علامہ محمد بشیر صاحب قبلہ کی تحریک سے مدرسۃ الواعظین عرف جامعہ امامیہ کی بنیاد ڈالی اور ایک عالیشان عمارت تعمیر کرا کر درس کا سلسلہ جاری کیا۔ بحمد للہ اس وقت سے اب تک آپ کی سرپرستی میں مدرسہ چل رہا ہے۔ کراچی میں قابلِ دید تعلیمی مرکز ہے۔ برسوں آپنے اس میں بلا معاوضہ تعلیم بھی دی اور کئی ہزار روپیہ اس کی ضرورتوں میں اپنی جیب سے خرچ کیا۔

۴۔ ۲۸ سال آپ کی سرپرستی میں رسالہ **نور** نکلتا رہا، جس میں زیادہ تر مضامین آپکے ہوتے تھے۔ یہ رسالہ قوم میں بیحد مقبول تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر ۱۹۶۸ء میں مجبوراً اسے بند کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ تمام قومی جرائد و اخبارات میں آپکے گرانقدر مضامین چھپتے رہے۔

۵۔ تقریر سے زیادہ آپ کو تحریر پسند ہے۔ فرمایا کرتے ہیں، تقریر ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ اِدھر آیا اُدھر گیا۔ اور تحریر ایک ایسا چشمۂ فیض ہے جو صدیوں لوگوں کی پیاس بجھاتا رہتا ہے۔ بحمد للہ باوجود کم توجہی کے آپ کا شمار واعظین کی صفِ اوّل میں ہے۔ یہ خصوصیت آج تک کسی واعظ کو نصیب نہیں ہوئی کہ آپ ۵۶ سال سے عشرۂ محرم کی مجالس ایک منبر پر پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان مجالس کے پڑھنے کا سلسلہ پٹیالہ میں وزیر صاحب کے امام باڑہ میں شروع ہوا تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد جب یہ خاندان لاہور میں قیام پذیر ہوا تو ان مجالس کا سلسلہ یہاں ۲۶۔ ایبٹ روڈ پر جو خلیفہ سعادت حسین صاحب کے زیرِ اہتمام ہوتی ہیں، قائم ہوا۔ اس وقت سے آج تک آپ یہ مجالس پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے علاوہ ۳۴ سال سے ایک عشرہ اربعین اندرون موچی دروازہ لاہور محلہ شیعاں میں پڑھتے ہیں۔ یہ عشرہ محمد عباس مرزا صاحب کی طرف سے ہوتا ہے۔

ابا جان قبلہ نہایت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ دنیوی آرائش سرو دستار سے کوسوں دور ہیں۔ امراء کی درباداری کو انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ خانہ نشین رہ کر مذہب و قوم کی خدمت بقدر امکان کرتے رہتے ہیں۔ اس تفسیر کی تحریک سب سے پہلے راقم الحروف نے کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ بڑی کد و کاوش کے بعد اس کی پہلی جلد آپکے سامنے آرہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ باقی جلدیں بھی جلد چھپ جائیں۔ امید ہے کہ مومنین کرام اس کارِ خیر میں حصہ لیں گے یہ سب سے بڑا کارِ ثواب ہے۔

راقم ناچیز
سید ندیم الحسن

عرضِ حال

اردو زبان میں شیعی تفاسیر ایسی ہیں جیسے آنکھوں میں سُرمہ یا آٹے میں نمک بلکہ اس سے بھی کم۔ گویا اس باغ میں بہار آئی ہی نہیں، دو چار پھول کھلے بھی تو ان کی مہک کہاں تک اور کتنی۔ پھر ان میں سے بھی کچھ کھلتے ہی مرجھا گئے۔ کچھ کا رنگ ایسا پھیکا پڑا کہ دلفریبی جاتی رہی۔ تفسیر عمدۃ البیان ایک بار چھپ کر رہ گئی۔ اب نگاہِ شوق اس کی زیارت کو ترستی ہے۔ تفسیر انوار النجف کی ضیا باری ۲۶ منزل تک جا کے رُک گئی۔ آگے کی چار منزلیں تاریک ہیں۔ خدا ان کو بھی جلد پُر نور بنائے۔

کچھ لوگوں نے مقدمات لکھ کر قلم روک لیے، خدا جانے ان پر کیا گزری —— رہے مترجم قرآن، ان سے تفسیری نوٹوں سے فائدہ تو خاصہ پہنچا مگر فیض کے چشمے اتنے ہی اُبل سکتے تھے جتنی حواشی کے تنگنائے میں گنجائش تھی۔ کوزہ میں دریا تو نہیں سما سکتا تاہم چلوؤں سے جتنی پیاس بجھ سکتی ہے بجھ گئی۔ ہمیں ان بزرگواروں کا شکر گزار ہونا چاہیئے جتنا کام ہوگیا ہزار غنیمت ہے۔ زمانے کا خاصہ ہے کہ جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے ابنائے روزگار کی طبیعتوں میں نئے سے نیا رنگ بھرتا جاتا ہے —— کل کی پری زاد جمال افروز دیویاں آج کی چڑیلیں کہی جاتی ہیں۔ کئے دن کی بات ہے کہ لیتھو کی چھپی ہوئی کتابیں سب کو پسند تھیں۔ ہوا کا رُخ بدلتے ہی اس کے چہرہ پہ بڑھاپے کی جھریاں نظر آنے لگیں۔ آفسٹ کی چھپائی نے وہ شیشہ جادو مارا کہ سارا رنگ روغن اُتر کر آنکھوں میں سمانے کے قابل نہ رہا۔

اب تو نوجوان طبقہ ایسی کتابیں پڑھنی چاہتا ہے کہ کاغذ پر حوروں کے رُخسار کی چمک اُتار کر پھیلادی ہو اور آن کی پتلیوں کی سیاہی سے کتابت کی گئی ہو۔ اب لوگ قرآن کریم کی ایسی خوشنما چھپی ہوئی تفسیریں ڈھونڈ رہے ہیں جن پر نظر کرتے ہی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بڑھ جائے۔ یہ تو رہی صورت، اب رہا باطنی کمال تو اس کے متعلق خواہش یہ ہے کہ:

۱۔ نہ تو زیادہ مختصر ہو نہ زیادہ طولانی خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا (درمیانی درجہ سب کاموں میں بہتر ہوتا ہے)۔ نہ تو پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے بور ہو جائے نہ اتنی مختصر کہ انسان لبِ شوق چاٹتا رہ جائے۔

۲۔ کُلُّهَا فِی التَّفْسِیْرِ اِلَّا التَّفْسِیْر کی مصداق نہ ہو۔ ضروری چیزیں بالاختصار آجائیں۔ ایسا نہ ہو کہ حج کا ذکر آئے تو تمام مسائل حج بیان کر دیئے جائیں۔ زکوٰۃ کا لفظ آجائے تو زکوٰۃ کا پورا نصاب نقل کر دیا جائے۔ انہیں تو فقہ کی کتابوں پر چھوڑ دیا جائے۔ یا اس تحقیق میں صفحہ کے صفحے بھر دیئے جائیں کہ نسلِ آدم کیسے چلی۔ حوّا کے بطن سے کتنی اولاد ہوئی۔ لڑکیاں کہاں بیاہی گئیں۔ لڑکوں کے لیے دلہنیں کہاں سے آئیں۔

۳۔ ایسی روایتیں درج نہ ہوں جو نہ تو روایتاً صحیح ہوں اور نہ قرآنِ کریم جیسی مقدس کتاب میں درج کرنے کے لائق طلسم ہوشربا یا الف لیلیٰ کی کہانیوں سے ملتی جلتی نہ ہوں۔ جیسے ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں زہرہ و مشتری کے قصّے۔ عوج بن عوق کے ناقابلِ فہم واقعات۔ سکندر کی تلاشِ آبحیات میں سرگردانی۔ شدّاد کے اِرم کا قصّہ۔ بُراق کا قصّہ۔

مُعاونین

اِس فہرست میں اُن تمام حضرات کے نام شامل ہیں جنہوں نے دامے درمے قدمے اور سخنے مدد فرمائی ہے۔

الحاج ڈاکٹر سیّد ندیم الحسن نقوی بی۔ایس سی، ایم۔بی۔بی ایس
سیّد شمیم الحسن نقوی ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ و ممبر ایگزیکٹو بورڈ آف یونائیٹڈ بنک
سیّد نسیم الحسن بی۔ایس سی انجینئر سپرنٹنڈنٹ پاور ہاؤس کراچی
سیّد قسیم الحسن بی۔ایس سی، بی ای، ایم ایس (گولڈ میڈلسٹ) پرنسپل سیفی کالج کراچی
سیّد شبیہ الحسن ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ یونائیٹڈ بنک کراچی
سیّد عرفان حسن زیدی ایم۔اے، بی ایڈ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر
سیّدہ پروین دولت صاحبہ
ڈاکٹر سیّدہ نازنین ایم۔ایس سی، پی ایچ۔ڈی
سیّد فردوس شمیم (انجینئرنگ کالج)
سیّد سبطین محمد مینجر یونائیٹڈ بنک
محترمہ بیگم صاحبہ خان بہادر الحاج نواب امیر علی خان صاحب بالقابہ مرحوم
مس این لاہوری آف لاڑکانہ
سیّد محمد مجو علی نقوی صاحب نائب مہتمم جامعہ امامیہ کراچی
مولانا سیّد عنایت حسین صاحب قبلہ جلالوی بانیِ مجلسِ ملّی پاکستان
خلیفہ سیّد سعادت حسین صاحب بی۔اے لاہور
سیّد آصف جاہ ایم۔ایس سی
ڈاکٹر سیّد خاقان حسن صاحب پی ایچ۔ڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُفسّر مدّظلہ العالی کی خدمات کا تعارف

از

الحاج ڈاکٹر سیّد ندیم الحسن بی ایس سی، ایم۔بی۔بی ایس

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے ایک ایسے عالمِ متبحر کی فرزندی کا شرف بخشا ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مذہب اور قوم کی خدمت میں اس انہماک سے گذارا ہے کہ نہ دن کو دن سمجھا ہے نہ رات کو رات۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ ان کے لیے ہر وقت کے لیے ایک کام ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت۔ انہوں نے جو کام اپنی زندگی میں بڑی دلچسپی سے انجام دیئے ان کا مختصر حال یہ ہے :

۱۔ اپنے سات بیٹوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی جو بحمد للہ سب اعلےٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت اس خوبی سے کی کہ ہر ایک مذہبی دائرہ کے اندر رہ کر اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ابا جان قبلہ اکثر اس پر فخر کیا کرتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کیا کرتے ہیں کہ میرے گھر میں کسی گوشہ سے حرام کا پیسہ نہیں آرہا اور کوئی لڑکا مذہبی فرائض انجام دینے سے بے خبر نہیں۔

۲۔ ابا جان قبلہ کی تصانیف اب دو سو سترہ تک پہنچ چکی ہیں اور بحمد للہ چند کتابوں کے سوا سب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ یہ تصانیف تین قسم کی ہیں)

الف : وہ کتابیں جو محکمۂ تعلیم کی ضرورت کے لحاظ سے لکھی گئیں۔

ب : وہ کتابیں جو اپنے ادبی اور تحقیقی ذوق کی بنا پر لکھیں۔

ج : وہ کتابیں جو مذہب حقہ جعفریہ کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھیں۔

مذہبی تصنیفات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس قسم کی تصنیفات کا سلسلہ یوں تو ۱۹۲۰ء سے چل رہا ہے لیکن دھیمی رفتار سے تھا۔ ۱۹۳۸ء سے قلم کی رفتار میں زیادہ تیزی آگئی۔ ۱۹۵۰ء میں جب ملازمت کی قید سے آزاد ہو کر واردِ پاکستان ہوئے تو اس وقت

۱ مولوی سیّد تہذیب الحسن صاحب فاضل علومِ شرقیہ (انڈیا) ۲ سیّد شمیم الحسن صاحب سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ و ممبر ایگزیکٹو بورڈ آف یونائیٹڈ بنک۔
۳ ڈاکٹر سیّد توصیف الحسن صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (انڈیا)
۴ سیّد نسیم الحسن صاحب بی ایس سی انجینئر سپرنٹنڈنٹ پاور ہاؤس کراچی ۵ سیّد ندیم الحسن بی ایس سی، ایم۔بی۔بی ایس
۶ سیّد قسیم الحسن بی ایس سی، بی ای، ایم ایس (گولڈ میڈلسٹ) پرنسپل سیفی کالج ۷ سیّد شبیہ الحسن ایم اے اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ یونائیٹڈ بنک کراچی

۴ - اُردو ایسی گنجلک نہ ہو کہ اس کا سمجھنا دماغ پر چوٹ دیتا ہو۔

۵ - عبارت ایسی فلسفیانہ نہ ہو کہ مسائل حل کرنے کے لیے افلاطون و ارسطو کو پکارا جائے۔

۶ - ایسے بھاری اور موٹے الفاظ نہ ہوں کہ کتابوں کی سطروں پر کوہِ ابوقبیس کی چٹانیں پڑی نظر آئیں اور صُراح و قاموس کی ورق گردانی کے بغیر بات ہی سمجھ میں نہ آئے۔

۷ - عبارت ایسی سادہ و سلیس ہو جیسے ریشم کے لچھے۔ عبارت پڑھتے ہی مطلب سمجھ میں آجائے۔

۸ - حواشی پر ایسی باریک تحریر نہ ہو کہ بڈھے بوڑھوں کو عینک منگانی پڑے۔

۹ - کاغذ ایسا بُودا نہ ہو کہ پڑھنے والا ابھی کتاب کے آخری حصّہ تک بھی نہیں پہنچا کہ وہ اس طرح اپنی جماعت سے الگ ہو گیا جیسے میدانِ جنگ سے بُودا سپاہی۔

۱۰ - عبارت ایسی دلچسپ ہو کہ پڑھنے والا صفحہ کتاب پر اس طرح نظر جمائے رہے جیسے کوئی حُسن پرست کسی حسین کے چہرے سے نظر ہٹانا نہیں چاہتا۔

۱۱ - مفسّر کہیں تفسیر بالرائے کر کے اپنے لیے جہنّم نہ خرید لے۔

۱۲ - کمزور روایات و احادیث کو درج کرنے سے گریز کرے۔

۱۳ - اگر کسی فرقہ کے خلاف کوئی بات کہنا ہو تو لطیف پیرایہ میں ذکر کرے کسی کا منہ نہ کھسوٹے۔ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ پر نظر رکھے۔ ورنہ کسی فتنہ کا ذمّہ دار وہ خود ہوگا۔ تبلیغ کے معنی لڑائی مُول لینا نہیں ہے۔

۱۴ - صرف ترجمہ پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ آیات کے مفہوم پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کو ضرور حل کیا جائے — تاکہ پڑھنے والوں کے دل میں کوئی خلش پیدا نہ ہو۔

۱۵ - سائنسی تحقیقات سے بھی مدد لی جائے۔

اپریل ۱۹۷۵ء میں جب میں رمُوز القرآن۔ حقائقُ القرآن اور قصصُ القرآن لکھنے سے فارغ ہُوا تو یکایک بڑھاپے نے قلم چھوڑ اسٹرائک کر کے اعلان کیا کہ اب ہمارے مطالبات پُورے کیجئے یعنی مجھے آرام سے وقت گزارنے دیجئے۔ ساٹھ برس سے آپ جو چکّی چلا رہے ہیں اس کا ہتّا ہاتھ سے چھوڑیئے۔ اب آپ پچاسی برس کے ہو چکے ناں کہئے۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر نے پایا تھا کہ میرے صاحبزادے میاں ندیم سلمہٗ آگئے اور مجھ سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی فرمائش کرنے لگے جس کی خصوصیات کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔ میں نے کہا صاحبزادے میری عُمر اب تفسیر لکھنے کی نہیں۔ میری عمر کا آفتاب لبِ بام سے بھی نیچے آچکا ہے۔ یہ ایسا معمُولی کام نہیں کہ اس گئی گزری عمر میں کیا جا سکے۔ جب جوانی میں یہ ہمّت نہ ہوئی تو اب کیا ہو گی۔ میری صد عیب اس خیال کو دل سے نکال دو۔ وہ ڈاکٹر تو تھے ہی اب مولوی بھی بنتے جا رہے ہیں۔ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ بھی جمع کر رکھا ہے۔ میرا کُتب خانہ بھی لُوٹ کر لے گئے۔ انہیں شوق چرّا رہا تھا کہ شیعوں میں ایک ایسی تفسیر ضرور ہو۔ دُوسرے دن انہوں نے ایک فنڈ بنایا جس میں پانچوں بھائی شریک تھے اور بہن (پروین دولت) اور بہنوئی (سیّد عرفان حسن ایم اے، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر) اور

سیّد سبطین محمد (میرے نواسے) یہ سب میرے پاس آئے اور سب نے اس حد تک اصرار کیا کہ مجھے انکار کرتے نہ بنی۔ اتنا ضرور کہا کہ تم مجھے ایک ایسے بار کے نیچے دبا رہے ہو جس کی برداشت شاید مجھ سے نہ ہو سکے ؂

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
چہ دانند حالِ ما سُبکسارانِ ساحل ہا

میں خاموش تو ہو رہا مگر ایک دہشت میرے اُوپر طاری تھی کہ اس عُمر میں میں یہ تفسیر پُوری کر سکوں گا یا نہیں۔ اگر بیچ میں مر گیا یا صحت خراب ہو گئی تو یہ محنت بیکار جائے گی۔ غرض جو کام ہونا ہوتا ہے اُس کے اسباب کھنچے چلے آتے ہیں۔ طے ہُوا کہ چھ چھ پاروں کی پانچ جلدیں تیار ہوں اور نہایت شاندار طریقہ سے چھپوایا جائے۔ تخمینہ کیا گیا تو ایک لاکھ پینتیس ہزار روپیہ ۵ جلدوں کی تیاری میں صَرف ہو گا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی صُورت میں کیا قلم اُٹھاؤں۔ اتنی کثیر رقم کہاں سے آئے گی۔ لڑکوں نے ہمّت بندھائی کہ حتی الامکان ہم اس کے چھپوانے کی کوشش کریں گے۔ کتابت کا کام سب سے مشکل تھا۔ لاہور کے ایک کاتب محمود ابنِ الماس رقم سے بیس روپیہ صفحہ طے ہُوا اور پندرہ سو رُوپے پیشگی ادا کیے۔

بہر حال میں نے خدا پر بھروسہ کر کے تیئسویں ماہِ صیام ۱۳۹۵ھ کی شب میں کہ شبِ قدر تھی استخارہ کر کے اور دو رکعت نماز پڑھ کے کام شروع کر دیا۔ اس شب کی برکت، خدا کی رحمت اور چہاردہ معصومین کی تائید سے بحمد للہ یہ کام پُورا ہو گیا۔

میں نے اس پیرانہ سالی میں دس دس گھنٹے روزانہ کام کیا مگر خدا کے فضل سے ناقابلِ برداشت زحمت نہ ہوئی۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے مقبولِ خاطرِ مومنین بنائے اور میری بخشش کا ذریعہ قرار دے۔ میں نے اختصار کو اس لیے مدِّ نظر رکھا کہ ضخیم ہونے کی صورت میں چھپوانا ناممکن ہو جاتا۔ میرے پیشِ نظر حسبِ ذیل تفاسیر رہیں اور جو جہاں سے مناسب سمجھا لے لیا ہے ؂

تمتّع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

تفسیر صافی۔ تفسیر مجمع البیان۔ لوامع التنزیل۔ تفسیر ابن عباس۔ تفسیر طنطاوی۔ تفسیر کبیر رازی۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر کشّاف۔ تفسیر تفہیم القرآن۔ اصولِ کافی (میں نے ترجمہ میں مولانا فرمان علی صاحب کے ترجمہ سے زیادہ مدد لی ہے)۔ میں نے کسی فرقہ کی دِل آزاری نہیں کی۔ بلکہ نہایت رواداری کے ساتھ پُوری تفسیر لکھی ہے۔

میں اپنے عزیز محترم خلیفہ سیّد سعادت حسین صاحب بی اے کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان سے مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ چُونکہ کتابت لاہور میں ہو رہی تھی لہٰذا میرے مسوّدات میں جو لفظ کاتب صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ اُنہیں بتاتے تھے اور جو اوراق کتابت ہو کر آتے جاتے تھے وہ ان کو غائرانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ اُجرت کا حساب بھی انہی سے متعلق تھا۔ گویا لاہور میں میری پوری پوری قائم مقامی کا حق ادا کیا۔ خلیفہ صاحب موصوف کی یہ خدمت انشاء اللہ باعثِ اجرِ عظیم ہو گی — حق ناشناسی ہو گی اگر میں ان چند حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کتابت شدہ اوراق پر غائرانہ نظر ڈالی اور ان میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں ان کو نوٹ کر کے کاتب صاحب سے درست کرایا۔ روزانہ کئی کئی گھنٹے اس مبارک خدمت میں انہوں نے صَرف کیے۔ حسبِ ذیل حضرات اس کارِ خیر میں شرکت فرماتے رہے ؎

اس بورڈ کے سربراہ جناب فاضلِ محترم مولانا سیّد عنایت حسین صاحب قبلہ جلالوی بانیٔ مجلسِ ملّی پاکستان، اُن کے معاون سیّد محمد کو علی نقوی صاحب، ڈاکٹر سیّد ندیم الحسن سلمہٗ۔ پروفیسر سیّد غلام عبّاس صاحب ایم اے (اِن انگلش)۔ سیّد محمود الحسن صاحب ایم اے ایل ایل بی رہے۔

سید ظفر حسن

مُقدّمہ

تَفْسِیْرُ الْقُرْآنْ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ وَالطَّاھِرِیْنَ

انسان عموماً نیکی سے زیادہ بدی کی طرف مائل رہتا ہے اس رجحان کے عوامل یوں تو بے شمار ہیں لیکن چند چیزیں ایسی ہیں کہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کے دل کو بدی کی طرف کھینچتی ہیں۔ خود غرضی۔ جاہ طلبی۔ شوقِ تفوق و برتری۔ عیش کوشی و تن آسانی سخت گیری و تشدد پسندی، جس دل میں یہ زہریلا خون دوڑتا ہو وہ انسانیت کی صراطِ مستقیم پر کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ اور جس جماعتی نظام میں ایسے شر پسند افراد جمع ہو جائیں وہاں اخلاقی قدروں کی چمک کا مارا جانا تمدنی و معاشرتی روابط میں فتنہ و فساد پیدا ہو جانا حتمی و اذعانی چیزیں ہیں جن سے کوئی عقلِ سلیم انکار نہیں کر سکتی۔

انسان مدنی الطبع ہے۔ امن و امان کے سایہ میں رہ کر اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ جب تک بنی نوع انسان کے حقوق کا بندوبست کسی معاشرہ میں نہ ہو کوئی فرد سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ خدا نے عقل انسان کو اس لیے دی ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرے اور اُسے شیطانی تسلط سے بچائے۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وساوسِ شیطانی کے جال میں پھنس کر اور جذبات کے طوفان میں غوطے کھا کر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اور واقعات کی کڑیوں کو جوڑ کر صحیح نتیجہ نکالنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں زندگی کا صحیح راستہ اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

انسانی زندگی کے دو ہی مقصد ہیں۔ ایک دُنیوی فلاح و بہبود دُوسرے اخروی نجات۔ دُنیوی فلاح سے میری مراد ہے نیک نامی سے زندگی بسر کرنا۔ اخروی فلاح سے میری مُراد یہ ہے کہ اس صحیح راستہ پر چلنا کہ اعمالِ صالحہ مقبول ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں راستے بڑے کٹھن ہیں۔ بغیر کسی کی رہنمائی کے یہ منزلیں طے نہیں ہو سکتیں۔

خدا نے اپنے لُطف و کرم سے بندوں کی ہدایت کا پُورا پُورا بندوبست کر دیا ہے۔ یعنی ایک دو نہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین کو ہر خطۂ ارض پر بھیج کر اپنی حجت تمام کر دی ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لیے کہ انبیاءؑ فرستادۂ خدا ہیں۔ ان کو معجزات عطا فرمائے۔ خطا و نسیان سے محفوظ کر کے ان کے اقوال و افعال پر اعتماد و اعتبار کی مُہر لگائی۔ اپنی سیرتوں کا مظہر بنا کے ان کی تاسّی کی طرف توجہ دلائی۔

اپنی کتابیں اور صحیفے نازل کر کے پسندیدہ زندگی کے قوانین سمجھائے۔ معاشرہ کے اُصول بتائے۔ نکوکاری و خیر پسندی کے حُدود قائم کیے۔

۱- آسمانی کتابوں کی ضرورت اور شانِ نزول

انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے خواہ کسی صورت میں ہو کچھ قواعد و قوانین کی ضرورت ہے جو کسی اقتدارِ اعلیٰ کے تحت نافذ ہوں تاکہ تمدّن میں امن و امان قائم رہ سکے اور ہر شخص اپنی علمی۔ فنی۔ اخلاقی اور رُوحانی صلاحیتوں کو پُر سکون فضا میں بروئے کار لا سکے۔

ہر ملک کا قانون جُداگانہ ہوتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ آغازِ آفرینش سے لے کر اب تک کسی تمدّن اور کسی مُلک میں کوئی قانون اب تک ایسا نہیں بنا جو نظامِ حیاتِ انسانی کو صحیح طور پہ چلانے کے لیے من جمیع الوجوہ مبنی بر عدل و انصاف ثابت ہو اور شکایتوں کے دفتر نہ کُھلے ہوں۔ لوگوں کی چیخ و پکار فضا میں نہ گُونجی ہو اور مخالفت کے جذبات نے جوش میں آکر بغاوت کی خاک نہ اُڑائی ہو۔ یہی کُھلا ثبوت اس بات کا ہے کہ اُن قوانین میں حقوق النّاس کے تحفّظ کا پُورا پُورا بندوبست نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ مجلسِ قانون ساز پر خود غرضی کا بھُوت سوار ہوتا ہے۔ وہ رعایا سے زیادہ تاج و حکومت کے مُفاد کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ اس تجربہ کی روشنی میں یہ ثابت ہو گیا کہ ایسا قانون جو ہر حیثیت سے مبنی بر عدل و انصاف ہو اور تمام افراد کے لیے ممکن العمل بھی ہو سوائے اس قادرِ قیّوم کے جس کی نظر میں شاہ و گدا سب برابر ہیں جس کی کوئی ذاتی غرض و پسند نہیں، کوئی نہیں بنا سکتا۔

لہٰذا ہر زمانہ میں انسان کی فطرتِ سلیم اس کی متمنّی رہی کہ اس کے تمدّن میں قانونِ قدرت نافذ ہو لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ قانون خواہ کتنا ہی اچھا ہو اگر اس کے نافذ کرنے والے اس کی دفعات کی رُوح سے پوری طرح واقف نہ ہوں یا اپنی اغراض کے ناپاک لفافہ میں لپیٹ کر اسے چلائیں تو پبلک کے لیے تسلّی بخش نہیں ہو سکتا۔ خدائی قانون کے چلانے والے خدا ہی کے فرستادہ بندے ہونے چاہئیں۔ جو پاکیزگیٔ سیرت کے لحاظ سے معصوم ہوں اور خوشنودیٔ خدا کا قدم قدم پر انہیں لحاظ ہو۔ مر جائیں مگر صراطِ مستقیم سے بال برابر ہٹنا انہیں گوارا نہ ہو۔

آسمانی کتابیں دو طریق سے نازل ہوئیں ایک بصُورتِ صحیفہ جن میں وقتی قانون ہوتے تھے بعض کے نزدیک ان کی تعداد ایک سو چودہ تھی بعض کے نزدیک زیادہ۔ جو کتابیں مستقل نظامِ حیات و ممات لے کر آئیں وہ چار ہیں۔ توریت۔ زبُور۔ انجیل اور قرآن۔ زبُور میں دُعائیں اور مناجاتیں تھیں۔ انہی میں قانون سموئے ہُوئے تھے۔

۱- توریت

یہ کتاب جنابِ موسیٰؑ پر نازل ہوئی۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ‌ۚ - (سورۂ مائدہ آیت ۴۴)۔ "ہم نے توریت کو نازل کیا جس میں ہدایت و نور ہے۔" یہ کتاب جنابِ موسیٰؑ کو بصُورتِ الواح ملی تھی۔ جو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے آئی تھی۔

۲- زبُور

حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی۔ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا (النسآء ۱۶۳/۶)۔ "ہم نے داؤدؑ کو زبُور عطا کی"۔ اس میں اخلاقی فضائل کا ذکر ہے۔ حضرت داؤدؑ بڑے خوش الحان تھے جب زبُور کو پڑھتے تھے تو درندے۔ چرندے۔ پرندے سب آپؑ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

۳- اِنجیل

حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ (پ۶، مائدہ آیت ۴۶) "ہم نے عیسیٰ کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت و نور ہے"۔

۴- قرآن

نبی آخر الزماں حضرت محمّد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ پر نازل ہُوا جس کا مُقدّمہ لکھنے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

۲- قرآن کی شانِ نزول

یہ کتابِ مقدس توریت کی طرح دفعتًہ واحِدَہ نازل نہیں ہُوئی بلکہ ۲۳ سال تک وقتاً فوقتاً حضرتؐ پر نازل ہوتی رہی ۱۳ برس مکہ میں اور ۱۰ برس مدینہ میں قرآنِ کریم کا نزُول تین صُورت سے ہُوا۔

۱- براہِ راست قلبِ رسولؐ پر نازل ہوتا۔ تَبٰرَكَ الَّذِىۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ- (پ۱۸، الفرقان ۲۵ آیۃ ۱) "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب کو نازل کیا تاکہ وہ تمام عالموں کو ڈرائے"

۲- یہ کہ فرشتہ کلامِ خدا لے کر آئے اور رسُولؐ تک پہنچائے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُۙ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ۙ (پارہ ۱۹، الشعراء ۲۶ آیت ۱۹۴)۔ "رُوح الامین نے اسے تیرے قلب پر اُتارا تاکہ تُو ڈرانے والوں میں سے ہو جائے۔"

۳- تیسرے یہ کہ خواب میں کوئی حکم دیا جائے جیسے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرتے دیکھا اور آنحضرتؐ نے بنی اُمیّہ کو اپنے منبر پہ بندروں کی طرح کُودتے دیکھا۔

خدا کے متکلّم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہماری طرح زبان سے بولتا ہے یعنی منہ کے اندر جب اس کی زبان حرکت کرتی ہے تو آواز نکلتی ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وُہ اپنی قُدرت سے جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر دے۔ اس کا ہر کام بغیر حرکات و آلہ کے ہوتا ہے۔ جیسے اُس نے کوہِ طُور پر حضرت موسیٰؑ کے لیے درخت سے آواز پیدا کر دی یا وادیٔ ایمن میں حضرت موسیٰؑ سے غیبی آواز نے کہا فَاخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ‌ۚ اِنَّكَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ ۲۰- آیت ۱۲) یہی مطلب ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۚ (پ۶، سورہ ۴- آیت ۱۶۴)۔

قرآنِ کریم کے نزُول کی سب سے پہلی منزل لَوحِ محفُوظ ہے جس پر شبِ قدر میں پُورا قرآن نازل ہُوا۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ

فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ (ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا۔) وہاں سے جبریل امین سیّد المرسلین کے پاس موقع موقع کے لحاظ سے لاتے رہے۔ منکرینِ قرآن آیہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ خود رسولؐ کا بنایا ہوا ہے لیکن یہ ایک بے وزن بات ہے۔ مفسرین نے دو طریق سے اس کا رَدّ فرمایا ہے۔ رسول سے مراد جبرئیل ہیں، جو آیاتِ الٰہیہ کو رسولؐ سے بیان کرتے تھے۔ دُوسرے حضرت رسُول قرآنِ کریم کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرتے تھے۔ لہٰذا مجازاً قولِ رسُول کہا گیا۔ یعنی منکرین کو بتایا گیا کہ یہ کسی شاعر یا کاہن یا مجنون کے منہ سے نکلا ہوا کلام نہیں بلکہ خدا کے رسُول کی زبان سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اس کے بیان میں اس قدر احتیاط مدِّ نظر رکھی گئی ہے کہ پارہ ۲۹ سورہ الحاقہ آیت ۴۶ میں فرماتا ہے۔

لَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ (الحاقہ آیت ۴۴ – ۴۶)

(اگر رسول ہماری طرف سے ایک بات بھی غلط بیان کر دے تو ہم اُسے پُوری قوت سے دھر پکڑیں گے اور اس کی گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔)

مزید احتیاط یہ ہے کہ خدا نے اپنے کلام کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر پ۱۴ آیت ۹)

(اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے حفاظت کرنے والے ہیں۔)

خدا نے قرآنِ کریم کو خالص عربی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (پ۲۵ الزخرف آیت ۳)
(ہم نے قرآن کو خالص عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھو)۔

یہ اعتراض احمقانہ ہے کہ اس کلام کا تعلق صرف اسی قوم سے ہو سکتا ہے جس کی مادری زبان عربی تھی۔ عربی نہ جاننے والوں سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔

جس رسول کے پاس بھی کوئی کتاب آئی وہ اُسی زبان میں بھیجی گئی جس کی طرف وہ رسول بھیجا گیا تھا تاکہ وہ پہلے اُن لوگوں کو سمجھائے جو اس کے سامنے ہوں۔ چُونکہ نبیٔ آخر الزماںؐ کی اُمّت قیامت تک ہونے والے لوگ ہیں لہٰذا قرآن کا تعلق اُن سب سے ہُوا پس یہ کیسے ممکن تھا کہ ان سب کی زبانوں میں کوئی کتاب نازل ہوتی۔ لامحالہ کسی ایک ہی زبان میں آنی تھی اور اب اس ایک زبان کی سب سے زیادہ مستحق وہی قوم تھی جو اس وقت حضورؐ کے سامنے تھی۔ رہیں دُوسری قومیں تو ان پر قرآن کے سمجھنے والوں پہ تبلیغ کرنا فرض قرار دیا۔

۳ - قرآن کی مثل لانا طاقتِ بشری سے باہر ہے

اس نقّارۂ فخر کی آواز کو کون دبا سکتا ہے اور اس اَنَا وَلَاغَیْرِی کے سیلاب کو کون روک سکتا ہے کہ عرب والوں کو فصاحت و بلاغت میں وہ کمال حاصل تھا کہ اپنے مقابلہ میں تمام دُنیا اُن کو عجم یعنی گُونگی نظر آتی تھی۔ عکاظ کے سالانہ میلوں میں نیستانِ شاعری کے شیر جب ڈکارتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سُننے والے کسی جادُو کے اثر میں جکڑے ہُوئے مدہوش کھڑے ہیں۔ ایک ایک شعر فصاحت و بلاغت کا وہ مستحکم قلعہ تھا جس کی کوئی ایک اینٹ جگہ سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ کیا کہنا ان کی شیریں کلامی کا

کہ ایک ایک لفظ سے رَس ٹپکتا تھا۔ معاشقہ ہو یا حماسہ۔ نسبی فخر ہو یا مہمان نوازی ہر منزل ان کے قدموں کو بوسے دیتی تھی اور انشاء پردازی ان کے ہر ایک لفظ کی چمک پر پروانہ وار نثار تھی۔ ایک عالمگیر مذاق تھا جو چھوٹے سے بڑے تک اور مَردوں سے لے کر عورتوں تک خُون کی طرح ان کی ایک ایک رگِ حیات میں موجیں مار رہا تھا۔

اپنے کمال پر غرور کا یہ عالم کہ سات قصیدے (سبعہ معلقہ) خانہ کعبہ کی دیواروں پر اس دعوٰی کے ساتھ لٹکائے تھے کہ ہے کوئی مائی کا لال کہ ایسا ایک قصیدہ بھی لکھ لائے۔ سالہا سال گزرتے چلے جاتے تھے۔ مگر اس طلسمِ ہوشربا کا ایک گوشہ کسی سے نہ ٹُوٹا۔

آخر جس کلام نے ان کے غرور کا سر نیچا کیا اور ان کی شیخیت کی ناک خاکِ ندامت پر رگڑی۔ ان کے دعوئے فصاحت و بلاغت کی کَل کَل توڑی۔ وہ مَلکِ علّام کا کلام معجز نظام یعنی قرآن واجب الاحترام تھا۔ جس کے سُنتے ہی بڑے بڑے باکمالوں کی عقل و فہم پر فالج گر گیا۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ اسے شاعری کہیں، جادُو کہیں یا از قسمِ کہانت کوئی صنفِ سخن قرار دیں۔ قرآن آیا اور بڑے طمطراق سے آیا۔ بڑی آن بان سے آیا۔ بڑے دعوے کے ساتھ آیا۔ جس نے عرب کی سخنوری کی تذلیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہلکے ہلکے نہیں ڈنکے کی چوٹ کہتا آیا۔ اے شعر و شاعری کے متوالو، فصاحت و بلاغت کے دیوتاؤ (پ۱۵ - بنی اسرائیل ۸۸) اگر تم تمام جنّ و انس مِل کر اس جیسا قرآن بنا کر لانا چاہو گے تو ہرگز نہ لا سکو گے۔ چاہے تم ایک دُوسرے کے مددگار بن کر بھی ایسا کرنا چاہو— انتظار کی گھڑیاں دن بنیں اور دن مہینے بنے اور مہینے برسوں میں تبدیل ہُوئے مگر منکروں کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ عاجز پا کر دُوسرا اعلان ہُوا۔ اچھا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب ہمارے رسول نے خود بنالی ہے تو اگر تم میں طاقت ہے تو ایسے من گھڑت دس ہی سورے بنا لو۔ (پ۱۲ سورۂ ہُود آیت ۱۳) منکروں نے بغلیں بجائیں لو اب تو بار ہلکا ہو گیا۔ اپنے فصاحت و بلاغت کے سرتاجوں سے کہا کس پنک میں ہو اب تو کافی وزن کم ہو گیا۔ اُٹھو اور عرب کے کمال کی لاج رکھ لو۔ وعدے ہوئے اور بڑے تاؤ دار ہوئے لیکن سب کو سانپ سُونگھ گیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔ قرآن نے پھر اعلان کیا۔ اچھا اگر دس سُورے ممکن نہیں تو ایک ہی سُورہ بنا لاؤ۔ (پ۱، البقرہ آیت ۲۳) جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پہ نازل کیا ہے اگر اس کے کلامِ خدا ہونے میں شک ہے تو سب مِل کر ایک ہی سورہ بنا لاؤ۔

اس اعلان کے بعد تو منکروں کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُچھلنے کُودنے لگے لو اب بات ہی کیا رہ گئی۔ یہ مسئلہ تو چٹکی بجاتے حل ہو جائے گا۔ ہمارے فصحا ایسے گئے گزرے تو نہیں ہیں کہ ایک سُورے کی مثل بھی بنا کر نہ لا سکیں۔ موسمِ حج آیا تو اس زمانہ کے چار نامور فصیح البیان جن کی قادر الکلامی کے ڈنکے سارے مُلک میں بج رہے تھے، وہاں آئے۔

ابنِ ابی العوجا - ابو شاکر دیصانی - ابنِ مقفّع - عبد الملک مصری۔

ساری قوم نے ان کو آ کر گھیر لیا۔ ہر طرف سے لعن طعن کی بوچھاڑ ہوئی۔ تم اب تک کس خوابِ خرگوش میں ہو۔ محمدؐ کی طرف سے آسانیوں پہ آسانیاں دی جا رہی ہیں اور تمہارے کان پر جُوں نہیں رینگتی۔ اگر بے حسی کا یہی عالم رہا تو پھر ہماری ناک تو کٹ گئی۔ عکاظ کے میلوں پہ تو بڑی بڑی ڈینگیں مارتے ہو۔ خم ٹھوک کر آتے ہو کہ ہے کوئی مائی کا لال کہ ہمارے مقابل میں آئے اور یہاں تمہاری غیرت و حمیت پر ایسے پتھر پڑے ہیں کہ سانس تک نہیں لیتے۔ چاروں نے وعدہ کیا کہ اگلے سال جب ہم آئیں گے تو اس

دعوئ قرآنی کی تردید لے کر آئیں گے۔ سال بھر تک چاروں اپنی دماغی صلاحیتوں کا تیل ٹپکاتے رہے اور فصاحت و بلاغت کی رگ رگ سے پسینہ نچوڑتے رہے لیکن ایک آیت کا جواب بھی نہ بن پڑا۔ اگلے سال جب وہ اس چہرے لیے ہوئے پھر حج کرنے آئے تو چاروں نے بیک زبان کہا۔ ہمارا فیصلہ یہ ہے مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ (یہ آدمی کا کلام نہیں)۔ یہ سن کر تمام قوم پر مُردنی چھا گئی۔ اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔

علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ جو چار آیتیں ان چاروں کے پورے سال زیرِ غور رہیں اور جواب نہ بن پڑا وہ یہ تھیں :

- ابوالعوجاء۔ فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا۔ (یوسف ۱۲)
- عبدالملک۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ۔ (الحج ۲۲، آیت ۷۳)
- ابوشاکر۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیا ۲۱، آیت ۲۲)
- ابنِ مقنع۔ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ۔ (ھود ۱۱، آیت ۴۴)

ایک سوال کا جواب

اگر قرآن کے کلامِ خدا ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اس کی مثل ممکن نہیں تو ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن کا جواب نہیں ہو سکا۔ جیسے مقاماتِ حریری۔ شاہنامہ فردوسی۔ گلستانِ سعدی اور دیوانِ غالب۔

جواب یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے نہ تو دعوئ نبوت کیا اور نہ یہ کہہ کر پیش کیا کہ کسی کا حوصلہ ہو تو ایسی کتاب پیش کرے۔ اگر دعوئ نبوت کے ساتھ یہ تحدی ہوتی تو خدا ضرور اس دعوے کو جھٹلا دیتا۔ جیسے مسیلمہ کذّاب کو جھٹلا کر ذلیل کیا۔

اگر کسی کتاب کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا تو خدا کو کیا پڑی ہے کہ ان کی عدیم المثالی کو ملیامیٹ کر دے۔ یہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی ہے کہ اُس نے دماغِ انسانی میں ایسی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں کہ بہتر سے بہتر کلام پیش کر رہے ہیں۔ وہ بلا وجہ اپنی مخلوق کے کلام پر کیوں پانی پھیرے۔ وہ کتنی ہی اچھی سہی مگر کلامِ خدا کا مقابلہ تو نہیں کر سکتیں۔ یہی عیب ان کے لیے کافی ہے کہ بیان میں تضاد ہے۔ کتابِ خدا اس عیب سے سرتاسر پاک ہے۔ اُس نے خود فرمایا ہے کہ اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں اختلافِ کثیر پایا جاتا۔

۴۔ قرآنِ مجید کی اعجازی شان

اس امر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا باعتبارِ الفاظ معجزہ ہے یا باعتبارِ معانی۔

۱۔ جو گروہ عبارت کو معجزہ کہتا ہے اس کا استدلال یہ ہے کہ خدا نے ہر رسول کو وہی معجزہ دیا جس میں اس کی قوم کو کمال حاصل تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادوگری انتہائی عروج پر تھی۔ لہٰذا ان کو عصا کا معجزہ دیا گیا جو سانپ بن جاتا تھا۔

جس سے اس زمانہ کے جادوگروں کا زور ٹوٹا اور انہوں نے سمجھا کہ جادو سے بالاتر بھی کوئی چیز ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طبیبوں نے امراض کے علاج میں کمال حاصل کیا تھا۔ لہٰذا ان کو مُردوں کے جلانے اور بیماروں کے اچھا کرنے کا معجزہ دیا گیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ طبِّ جسمانی اور چیز ہے اور طبِّ رُوحانی اور چیز ہے۔

حضور سرورِ انبیاءؐ کے زمانہ میں عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا لہٰذا ان کی رعونت کا سر کچلنے کے لیے قرآن نازل کیا جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے عرب کے نامور شاعروں اور باکمال انشاپردازوں کے کمالات سر جھکا کر رہ گئے۔ تحدی اسی میں ان سے کی گئی ورنہ معنوی کمالات میں کی جاتی تو وہ کہہ دیتے کہ ہمیں اس میں دعوئ فوقیت و برتری ہی نہیں لہٰذا ہم سے اس میں معارضہ و مقابلہ بالکل عبث ہے۔

لیکن اس نظریہ پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ قرآن کا دعوئ تحدی صرف عربوں ہی سے نہ تھا بلکہ قیامت تک کے تمام بنی آدم سے ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان عربی نہیں نہ ہمیں اس زبان کی فصاحت و بلاغت سے کوئی سروکار ہے لہٰذا اس تحدی کا تعلق ہم سے نہ ہونا چاہیے۔ اس بنا پر قرآن ہمارے لیے معجزہ نہیں۔ جس چیز کو ہم جانتے ہی نہیں اس میں ہم کو مدِ مقابل بنانا اور معارضہ کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے قرآن معجزہ ہے باعتبار اپنی ہدایت کے اس میں جس انداز سے ہدایت کی گئی ہے وہ دُنیا کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے فلسفیانہ دلائل اور حکیمانہ براہین ہر دعوے پر کچھ اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دو چار لفظوں میں اہم مسائل کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ایک فلسفی ایک منطقی لمبی چوڑی عبارتوں میں نہیں سمجھا سکتا مثلاً لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۲۲ چند الفاظ کی ایک عبارت ہے لیکن جو معنویت اس کے اندر ہے ایک فلسفی اس کو بیان کرے گا تو اس کو بہت سے دلائل پیش کرنا ہوں گے۔ قرآنِ کریم نہ شاعری کا کوئی صحیفہ ہے نہ انشاء پردازی کی کوئی کتاب۔ بلکہ بنی نوع کی نصیحتوں کا مرقع ہے اور نظامِ حیات و ممات کا ایک مکمل ضابطہ ہے۔ دینی و دُنیوی فلاح و بہبود کے جو قواعد اس میں بتائے گئے ہیں وہ اپنے مقام پر ایسے اٹل ہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتے ہیں وہ نہیں ہل سکتے۔ پس معارضہ طرزِ بیانِ ہدایت میں ہے نہ کہ الفاظ کی فصاحت و بلاغت میں یہ کوئی ادبی کتاب نہیں بلکہ ایک نُورانی و رُوحانی صحیفہ ہے جو اپنے انداز میں بالکل اچھوتا ہے۔

لیکن اس عقیدہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس صورت میں عرب سے معارضہ بالکل ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ایک قوم سے جو لٹیری، چور، قزّاق، خانہ بدوش، علم سے کوری، فلسفہ سے ناآشنا تھی جو معمولی معمولی بات پر چالیس چالیس سال لڑتی ہو، جس میں شیطانی رسم و رواج کی بھرمار ہو، فلسفیانہ دلائل اور منطقیانہ استدلالات سے معارضہ کرنا کیا معنی وہ کب اپنے کو حکیم یا فلسفی کہتے تھے کہ ان کا دعویٰ توڑنے کے لیے قرآن بطور معجزہ نازل کیا گیا۔ مقابلہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ایک کمال میں دونوں حریف شریک ہوں نہ یہ کہ ان کے حالات و کیفیات بالکل متضاد ہوں۔ جب ایک قوم کے ایسے خیالات ہونے ہی ناممکن تھے اور جو اجہل۔ غیر مہذب و ناتربیت یافتہ تھی تو اس سے ایک سورہ کا جواب نہ لانا قرآنِ معجز نظام کے لیے باعثِ فخر و مباہات نہیں ہو سکتا اور نہ اس قوم کی عاجزی اس کے لیے باعثِ توہین ہو سکتی ہے۔ ایک شخص پہاڑ کی چوٹی پر ہو دوسرا

زمین کی سطح پر اور پہاڑ پر کہے میں تجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ درآنحالیکہ تو اپنے مقام پر ہے اور میں اپنے مقام پر۔ تو یہ مقابلہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

۳۔ تیسری رائے جو صحیح رائے ہے وہ یہ ہے کہ قرآن لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے۔ لفظی فصاحت و بلاغت اور حسنِ بیان و جدتِ نگارش کی بنا پر تحدی ہے۔ قومِ عرب سے اور ان لوگوں سے جو عربی زبان کے ماہر اور انشاپردازی میں صاحبِ کمال ہیں۔ اور بلحاظ اپنی معنویت یعنی بے مثل ہادی ہونے کے دُنیا کے تمام اہلِ قلم سے جو قیامت تک ہونے والے ہیں ان میں سے کوئی ایسی کتاب پیش نہ کر سکے گا جس میں حسبِ ذیل معنوی خصوصیات ہوں؛

۱ - اوّل سے آخر تک اس میں بیانات مختلف نہ ہوں۔
۲ - جس میں شروع سے آخر تک کوئی جھوٹ بات نہ لکھی گئی ہو۔
۳ - جس میں لغو و ہزل کا کہیں نام نہ ہو۔
۴ - جس کے ہر جزو میں ہدایت اسی طرح سمائی ہوئی ہو جیسے بدن میں رُوح۔
۵ - جس میں کوئی کمزور استدلال نہ ہو۔
۶ - جس کی مختصر عبارت میں کوئی طولانی مضمون ادا کیا گیا ہو۔
۷ - جس میں تمام علُوم کا ذکر ہو مگر وہ کسی علم کی کتاب نہ ہو۔
۸ - جو ایک منظّم نظامِ حیات بن کر انسان کے سامنے آئی ہو۔
۹ - جس کا دعوٰی ہو کہ اس کے اندر ہر شے کا بیان ہو۔
۱۰ - جس میں رُوحانی ارتقاء کے تمام سامان فراہم کیے گئے ہوں۔
۱۱ - جس نے دین و دُنیا دونوں کی فلاح و بہبُود کے طریقے بیان کیے ہوں۔
۱۲ - جس نے ہدایت کا کوئی طریقہ نظر انداز نہ کیا ہو۔

۵ - قرآن اور فصاحت و بلاغت

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسانی تخیلات اور ذہنی صلاحیتوں میں جزر و مد ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر و تقریر میں ہمواری نہیں پائی جاتی۔ تاثرات کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات بدلتے ہیں اور خیالات کے ساتھ اس کے قلم کی رفتار بدل جاتی ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں جس جوش کے ساتھ رستم کے عزائم کو لکھتا ہے اور کسی نبرد آزما کے حالات میں اس کے قلم کی وہ رفتار نہیں رہتی۔ سعدیؒ نے گلستان میں بابِ اوّل جس گہری فکر اور جذبۂ نصیحت آموزی سے لکھا ہے اور ابواب میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ غالب نے جہاں وارداتِ قلبی کی نقشہ کشی کی ہے اس کی بات کچھ اور ہے۔ جہاں شاعرانہ دلدل میں پھنس گیا ہے وہاں اثرات کی سحر انگیزی رُخصت ہو گئی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے اور دریائی تموّج باقی رہ جاتا ہے۔

اب رہا قرآن تو اس میں اوّل سے آخر تک ایک ہی رنگ ہے کہیں ناہمواری پیدا نہیں ہوئی۔ پند و نصیحت امرِ خیر کی طرف ہدایت جو اس مقدس صحیفہ کی تنزیل کا مقصد ہے وہ کہیں غائب نہیں ہوتا۔ آیات کے الفاظ میں جو حُسنِ بندش اور طُرفہ طرزِ نگارش ہے وہ آخر تک ایک ہی انداز سے چلا گیا ہے۔ مصنفِ کتاب (خُدا) نے کہیں اپنی غرضِ تصنیف پر آنچ نہیں آنے دی۔ کہیں اپنے قلم کی رفتار میں سُستی اور ڈھیلا پن نہیں دکھایا۔ اس اندازِ تحریر نے فصحائے عرب کو حیرت و استعجاب کے بے پایاں سمندر میں غوطے کھلائے تھے۔ باوجود انتہائی غور و فکر کے ان کی سمجھ میں یہی نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہے کیونکہ اس قسم کا کلام اس سے پہلے نہ ان کی زبان سے نکلا تھا نہ ان کے کانوں نے سُنا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے کہ اس کو کہیں تو کیا کہیں اس دیوانگی میں کبھی اس کو شاعری کہتے تھے اور کبھی جادُوگری، کبھی یہ کہہ کر سر جھکا لیتے تھے کہ یہ کلام بشر نہیں ہے۔ اس کے مقابل چونکہ ان کی فصاحت و بلاغت کی تلواروں کی باڑھ ماری گئی تھی اور شہرت و ناموری اور دعوٰئ بے ہمتائی کے تمام جھنڈے سرنگوں ہو گئے تھے لہٰذا اس کو اپنے کلام سے مافوق الفطرت تسلیم کرنے میں ان کے دل لرزتے تھے۔

ھَنادید اُدبائے عرب کا کیا ذکر جب افصح الفصحا اور ابلغ البلغا امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام کا کلامِ معجز نظام اس کلامِ ملکِ العلّام کے مقابل رکھا جاتا ہے تو وہی فرق نظر آتا ہے جو خالق و مخلوق میں ہے یہی عالم احادیثِ رسولؐ اور دیگر ائمۂ کرام کے کلام کا ہے۔ جہاں ان حضرات کے کلام کے درمیان کوئی آیت آجاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کُندن کے زیور میں ہیرا جڑا ہُوا ہے۔ ہم اس مقام پر چند آیتیں اور ان کے محاسن بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو اس کلامِ ربّ الانام کی خصوصیات کا کچھ تو پتہ چل جائے۔

۱۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (نوحؑ نے) اپنے ربّ سے دُعا کی، میں مغلوب ہوں میری مدد کر۔) گِن کر دیکھو اس میں زیادہ نہیں صرف پانچ لفظ ہیں۔ اب اس کا نظامِ بلاغت دیکھو۔ لیکن پہلے یہ سُن لو کہ جب کسی سے دُعا کی جائے تو اس کے لیے کن کن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے:

(۱) جس سے مدد مانگی جائے اُس کو پکارنا۔ (یہاں دَعَا کا لفظ موجود ہے۔)
(۲) پھر مدد دینے والے کی رحمت و عظمت کا اقرار۔ (اِس کے لیے رَبّ کا لفظ ہے۔)
(۳) معطی کی مدح و ثنا (لفظ ربّ سے کی گئی، یعنی اے میرے پالنے والے۔)
(۴) اظہارِ انکسار و عجز۔ (دُعا مانگنا اس کی دلیل ہے۔)
(۵) بیانِ مصیبت۔ (مَغْلُوْبٌ سے اس کا اظہار ہے یعنی میں بے کس و مجبُور لوگوں کا ستایا ہُوا تیری بارگاہ میں آیا ہوں۔)
(۶) عرضِ حاجت۔ (میری مدد کر۔ اس کے لیے فَانْتَصِرْ کا لفظ ہے۔)
(۷) اختصارِ کلام۔ کیونکہ بارگاہِ عظیم میں طُولانی کلام گستاخی سمجھا جاتا ہے لہٰذا تین لفظوں میں عرضِ حال کیا گیا۔

——— بتائیے یہ جواہرات جو چند لفظوں میں چھُپے ہُوئے ہیں بغیر رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کے بتائے کون سمجھتا۔

کشکول بہائی علیہ الرحمہ میں اصمعی سے روایت ہے، میں نے ایک روز یہ آیت پڑھی :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ -

(چور مرد و عورت کی سزا یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ یہ ان کی بدکرداری کی سزا ہے جو اللہ کی طرف سے عذاب ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔)

ایک عرب میرے پاس بیٹھا تھا۔ اُس نے پُوچھا یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے کہا کلامِ خُدا ہے۔ اُس نے کہا یہ کلامِ خدا نہیں ہو سکتا۔ تب میں چونکا کہ میں نے غلطی سے عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ کی جگہ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پڑھ دیا تھا۔ اُس نے کہا ہاں اب ٹھیک ہے۔ میں نے کہا تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ کلامِ خدا نہیں ہے؟ اُس نے کہا چوری کی سزا دینے کے بعد غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ سے کیا تعلق — بلاغت اس کو کہتے ہیں کہ ہر کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو اور فصاحت یہ ہے کہ صاف و سلیس ہو۔

فصاحت و بلاغت کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جو کلام کا زیور کہلاتی ہے یعنی لفظی و معنوی صنائع و بدائع کا استعمال اس کا تعلق علمِ بدیع سے ہے۔

(۱) صنعتِ جمع۔ یعنی ایک کلام میں چند چیزوں کا جمع کر دینا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۳۳ (خدا ان پر عذاب نہ کرے گا جب تک اے رسول تم ان میں ہو۔) اس میں چند نکات ایک جگہ جمع ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ مستحقِ عذاب ہیں تاکہ حرکاتِ ناشائستہ سے باز رہیں۔ دُوسرے عذاب دینے پر اپنی قدرت۔ تیسرے پیغمبرؐ کی فضیلت کہ ان کا وُجود باعثِ امن ہے۔

۲ - وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ - اوّل اپنے غنا یعنی بے پروائی کا اظہار کیا کہ ارسالِ پیغمبرؐ محض از راہِ رحمت ہے نہ کسی نفع کی وجہ سے۔ دُوسرے اس کا اظہار کہ پیغمبرؐ کو ہم نے بھیجا ہے۔ تیسرے پیغمبرؐ کا وجود اہلِ عالم کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ چوتھے آپؐ کی بعثت لوگوں کے لیے باعثِ رحمت ہے نہ صرف عرب کے لیے پانچویں آپؐ کی پیغمبری باعثِ نزُولِ رحمت ہے۔

اب لفظی اعتبار سے دیکھئے :

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ - (وہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب بیمار ہوتا ہوں تو شفا دیتا ہے۔)

يَسْقِيْنِ اور يَشْفِيْنِ میں تجنیس خطی ہے۔ صرف نقطوں کا فرق ہے۔ پھر صحت و مرض کا مقابلہ ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ -

یہاں ابرار کے مقابل فجار اور نعیم کے مقابل جحیم ہے۔

—— ہم نے بطورِ نمُونہ چند باتیں ذکر کر دی ہیں ورنہ ایسی بے شمار صنعتیں ہیں۔

۶ - قرآن اور اخبار بالغیبؒ

قرآنِ کریم نے ان تمام اعتراضات کو دفع فرمایا ہے جو عموماً کفار و مشرکین کی طرف سے کیے جاتے تھے۔ عرب والے عموماً کاہنوں اور نجومیوں کی پیش گوئیوں پر بڑا یقین رکھتے تھے۔ وہ بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ جب اس کلام میں کوئی پیش گوئی نہیں تو ہم کیسے سمجھیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ کوئی پیش گوئی ہوتی تو ہم اس کی صداقت کو جانچتے۔ چنانچہ اسی بنا پر قرآن میں چند پیش گوئیاں کی گئی ہیں جو سب سچ ثابت ہوئیں۔ مگر جو ضدی اور ہٹی تھے وہ اس پر بھی ایمان نہ لائے۔

۱ - الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ (الرّوم ۳۰، آیت ۲،۳)

(قریب کے مُلک میں رُومی شکست کھائیں گے لیکن اس کے بعد غالب آئیں گے۔)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شکست کے بعد رُومیوں نے پارسیوں پر فتح حاصل کی۔

۲ - اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ (ہم نے تم کو بہت بڑی فتح دی)۔ چنانچہ فتحِ مکّہ کے بعد یہ پیش گوئی پُوری ہُوئی۔

۳ - اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ - (ہم نے تم کو کثیر اولاد دی)۔ (الکوثر ۱۰۸، آیت ۱)

یہ پیش گوئی یوں پوری ہوئی کہ علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد اس کثرت سے پھیلی کہ باوجود بنی اُمیّہ و بنی عبّاس کے قتلِ عام کے اب بھی دُنیا میں لاکھوں سیّد موجُود ہیں۔

۴ - یہُودیوں کے متعلق یہ پیش گوئی کی گئی :

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ (بقرۂ، آیت ۶۱) "جہاں کہیں ہیں گے ذلت ان پر چھائی رہے گی"

چنانچہ آنحضرتؐ کے عہد میں قومِ یہُود حد درجہ ذلّت و خواری میں زندگی بسر کرتی رہی اور آپؐ کے بعد بھی۔

۵ - یہُود و نصاریٰ کے درمیان عداوت کی پیش گوئی۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ -

(ہم نے ان کے درمیان عداوت و بُغض کو قیامت تک پیدا کر دیا۔)

چنانچہ یہ دونوں قومیں ایک دُوسرے کی دشمنی پر ہمیشہ کمربستہ رہیں اور قیامت تک رہیں گی۔ اگرچہ سیاسی میدان میں مسلمانوں کی مخالفت کی وجہ سے عیسائی بظاہر یہُودیوں کے مددگار بنے ہُوئے ہیں۔ مگر عداوت کی آگ دلوں میں تو بھڑک ہی رہی ہے۔ دونوں کے مذہبی پیشوا ایک دُوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

۶ - وَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۲۸ (ہم نے ایک علیم لڑکے کی ابراہیمؑ کو بشارت دی۔)

چنانچہ جناب اسحاق پیدا ہوئے۔

۷ - جنابِ موسیٰؑ کی ماں کو وحی کی گئی کہ تم اسے دریا میں ڈال دو۔ ہم پھر تمہارے پاس لوٹا دیں گے۔

چنانچہ لوٹا دیا۔

۷ - قرآن اور تفاؤل

قرآنِ کریم کی جہاں اور بہت سی اعجازی شانیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن سے جو تفاؤل کیا جاتا ہے وہ غلط ثابت نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ صدقِ نیت کے ساتھ سیاق و سباق کو سمجھ کر نتیجہ نکالا جائے۔ اکثر اوقات ایسی آیات نکلتی ہیں جو سائل کے سوال سے بے ربط نظر آتی ہیں۔ ان سے نتیجہ نکالنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ہم چند قسم کے تفاؤل کا ذکر کر کے قرآن کی اعجازی شان دکھلاتے ہیں۔

۱ - ولید بن عبدالملک اُموی بادشاہ نے ایک روز قرآن سے تفاؤل کیا۔ یہ آیت نکلی، وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہر ظالم سرکش نااُمید ہُوا)۔ ولید یہ پڑھ کر غضب ناک ہو گیا اور یہ دو شعر اُسی وقت کہہ ڈالے اور قرآن کو پارہ پارہ کر دیا۔

أَتُوعِدُ كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ فَهَا أَنَا ذَاكَ جَبَّارٌ عَنِيدُ

إِذَا مَا جِئْتَ رَبَّكَ يَوْمَ حَشْرٍ فَقُلْ يَا رَبِّ مَزَّقَنِي الْوَلِيدُ

کیا تُو ہر سرکش ظالم کو ڈراتا ہے تو سُن لے میں ہوں سرکش ظالم۔ جب تُو روزِ قیامت خدا کے سامنے جانا تو اُس سے کہنا اے میرے ربّ، مجھے ولید نے پھاڑ ڈالا۔

چند ہی روز بعد لوگوں نے اُسے قتل کر کے سُولی پر چڑھا دیا۔

۲ - کتاب نصرُ المومنین میں مفتی سیّد محمّد عبّاس صاحب اعلی اللہ مقامہٗ نے یہ واقعہ تحریر فرمایا ہے سلطان سلیمان زیارت امیرالمومنین علیہ السّلام کے لیے عراق گیا۔ جب روضۂ اقدس کا قبہ نظر آیا تو اُس نے ازراہ ہیبت و اجلال پاپیادہ چلنا چاہا۔ وزیر نے کہا، حضوُر ایسا کیوں کرتے ہیں آپ بادشاہ ہیں اور علیؑ بھی بادشاہ تھے۔ کچھ دیر دونوں میں گفتگو رہی آخر طے ہُوا کہ قرآن مجید سے تفاؤل کیا جائے۔ جب تفاؤل کیا تو یہ آیت نکلی،

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۲۰/۱۲ (اے موسٰی جوتے اُتار ڈالو کیونکہ تم وادیٔ مقدس میں ہو۔) یہ آیت نکلتے ہی بادشاہ گھوڑے سے اُتر پڑا اور پاپیادہ چل کر شرفِ زیارت بجالایا۔ اور وزیر کے قتل کا حکم دیا۔ اور یہ دو شعر پڑھے۔

تَزَاحَمُ تِيجَانُ الْمُلُوكِ بِبَابِهِ وَيَكْثُرُ عِنْدَ الْاِسْتِلَامِ اِزْدِحَامُهَا

اِذَا رَاٰتُهُ مِنْ بَعِيْدٍ تَرَجَّلَتْ وَاِنْ هِيَ لَمْ تَفْعَلْ تَرَجَّلَ هَامُهَا

یعنی یہ وہ درگاہ ہے کہ بادشاہوں کے تاج سر سے اُتر پڑتے ہیں۔ اس آستان کو بوسہ دینے کے لیے ہجومِ خلائق ہے اور جب روضۂ اقدس کو دُور سے دیکھتے ہیں تو پاپیادہ چلتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ان کے سر گردن سے اُتر کر زمین پہ آجاتے ہیں۔

بغرضِ اختصار اسی پہ اکتفا کی جاتی ہے ورنہ ایسے بہت سے واقعات کتابوں میں ملتے ہیں۔ خود اس ناچیز راقم الحروف نے بارہا اپنے اور دُوسروں کے لیے تفاؤل کر کے راہِ عمل معیّن کی ہے۔ اور کبھی فال کو غلط نہیں پایا۔

۸ - قرآن اور تاریخ

اپنی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہونے والی قوموں کی زندگی کے حالات ایک ایسا شخص اپنی قوم سے بیان کر رہا تھا جس نے کسی قوم کی تاریخ کا ایک حرف نہ کسی سے پڑھا تھا نہ سُنا تھا۔ نہ توریت و انجیل کا اس نے مطالعہ کیا تھا نہ صحایفِ انبیاء اُس کی نظر کے سامنے تھے۔ جو کتاب اُس پہ نازل ہوئی تھی تمام واقعات اس کے تعلیم کردہ تھے جن میں نہ غلط بیانی تھی نہ مبالغہ آرائی۔ بلکہ توریت و انجیل میں جو غلط بیانیاں رہبان و احبار نے تحریف کر کے کر دی تھیں، اُن کی تصحیح کر دی گئی۔

یہ غیب کی خبریں ہیں جو خدا نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہیں۔

۱ - سورۂ آلِ عمران میں حضرت مریمؑ کے قصہ کے متعلق ہے:

اے رسول یہ خبر غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تمہارے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجتے ہیں۔ اے رسول تم اس وقت (بیتُ المقدّس کے ان رہبانوں کے پاس) موجود نہ تھے جو مریمؑ کے بارہ میں اپنے اپنے قلم (بطور قُرعہ کے) ڈال رہے تھے کہ دیکھیں کون مریمؑ کا کفیل بنتا ہے۔ یہ واقعہ سینکڑوں برس پہلے کا ہے جو بیان کیا جا رہا ہے۔

۲ - حضرت یوسفؑ کا پُورا واقعہ سورۂ یوسف میں ہے۔ یہ حضرت کے پیدا ہونے سے کئی ہزار برس پہلے کا ہے۔

قرآن میں سب سے زیادہ حصہ اقوامِ عالم کی تاریخ کا ہے کہیں مختصر کہیں طُولانی۔ کہیں ایک جگہ کہیں کئی جگہ۔ یہ واقعات فنِ تاریخ نویسی سے پہلے کے ہیں۔ یہ قصّے دل بہلانے کے لیے نہیں بیان کیے گئے بلکہ امم سابقہ کے حالات سے سبق لینے کے لیے ہیں۔ اربابِ عقل و فہم کو ان واقعات کی طرف خصوصیت سے توجّہ دلائی گئی ہے۔ قومِ نوحؑ۔ قومِ عاد۔ قومِ ثمُود۔ قومِ شعیبؑ۔ قومِ لُوط۔ اصحابِ رَس۔ اصحابِ اُخدُود۔ اصحابِ موسیٰؑ وغیرہ کے حالات قرآن میں پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان کی لکھی ہوئی تاریخوں سے قرآن کا بیان کس قدر مختلف ہے۔ قرآن کا اسلُوبِ بیان اور طرزِ نگارش سب سے نرالا ہے۔ واقعات کے درمیان جہاں جہاں خلا چھوڑا گیا ہے آیت کا سباق و سباق خود اس خلا کو پُر کر دیتا ہے۔ ہر قوم کے مؤرخین نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان میں زیادہ تر سلاطین کے حالات ان کے محاربات، طرزِ جہاں بانی، رعایا کی بغاوتیں، بادشاہوں کی ظلم پسندی کے متعلق بیان کر کے اوراق کو سیاہ کر دیا ہے۔ تزکیۂ نفس۔ تصفیۂ باطن۔ رُوحانی اور اخلاقی ترقی۔ حقوق شناسی اور نیکوکاری کے متعلق کوئی سبق ان سے نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نظامِ حیاتِ انسانی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے قرآن میں چھوٹے سے چھوٹا قصّہ سورۂ کوثر اور بڑے سے بڑا قصّہ یُوسف اپنی ہرتہ میں کوئی اخلاقی یا رُوحانی سبق دبائے ہوئے ہے سمجھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ان قصّوں میں دینی اور دُنیوی مفاد کے لیے جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب موجود ہیں۔

جن بداعمالوں پہ خدا کا عذاب نازل ہُوا اور جن نیکوکاروں کو اَجر ملا ان کے وجُوہ واقعات کی تہ میں لپیٹ دئیے گئے ہیں اور جا بجا یہ بتا دیا گیا ہے کہ اپنے خالق کی نافرمانی سے اقوامِ عالم کو کیسے کیسے سخت مصائب کا سامنا ہُوا ہے ــــ

واقعہ نگاری کا صحیح مقصد بھی یہی ہے۔ ورنہ وہ نازنینیں نہیں بلکہ طلسم ہوشربا اور الف لیلہ کی داستانیں ہیں۔ صحت مند معاشرہ اور پُرامن تمدن دُنیا میں جبھی پایا جاسکتا ہے کہ ہر فرد اپنے فرض کو محسوس کرے اور پہلے لوگوں کے حالات سے سبق لے۔ قِصَصُ الْاَوَّلِیْنَ عِبْرَۃٌ لِّلْاٰخِرِیْنَ۔ اور یہ نہ سمجھے کہ جو مصیبتیں ان پہ گزر چکی ہیں وہ ہم تک تو نہ آئیں گی۔ چکی کا پاٹ تو سب ہی طرف گھومے گا۔ اعمال کے نتائج کبھی نہیں بدلتے۔ انسان کی بنائی ہوئی تاریخوں کے دامنوں میں گاجریاں اور گٹھلیاں، موتی اور سنگریزے سب ہی کچھ ہوتے ہیں لیکن قرآن میں ایسا نہیں۔ وہاں واقعات کے نتائج انسانی زندگی کے ہر موڑ پر ایسے چوٹ کھانے سے بچا لیتے ہیں۔ اگر غور سے پڑھا جائے تو اسلام کی صحیح تاریخ ان ہی قصص و حکایت کے اندر چھپی ہوئی ہے۔

ع سودا ہے جو اھمر کا نظر چاہیئے اس کو

اقوامِ عالم کے ذکر کے ساتھ انبیاء علیہم السّلام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے ان برگزیدہ بندوں کو تبلیغ دین میں کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے ہر منزل پر ثباتِ قدمی اور ارادہ کی پختگی کے ساتھ اپنی اپنی اُمت کو راہِ راست دکھانے کی کوشش کی۔ صرف نوعِ انسان کی ہمدردی میں کون سی تکلیف تھی جو نہ اُٹھائی۔ یہ تاریخِ اسلام کا سب سے زیادہ ہوشربا اور رُوح فرسا ورق ہے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو انسانی تاریخ پہ اندھیرا چھایا ہوا ہوتا۔ جن لوگوں نے انبیاءؑ کی پیروی کی ان کی تاریخ کا ہر باب نافرمان بندوں کی تاریخ سے جُدا رہا۔

قرآنی تاریخ سمجھانے میں سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا نبیِّ آخرالزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہٖ کو ہوا۔ اس لیے کہ آپؐ کے دُشمن بکثرت تھے۔ ایک طرف یہودی قرآن کے واقعات کو جھٹلانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اور اپنی محرّف توریت کے واقعات کی صداقت تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ دُوسرے نصاریٰ کا گروہ منکرِ قرآن تھا۔ وہ محرّف انجیلوں کو ہاتھوں میں لیے ہوئے قرآنی واقعات کی تردید پہ کمر بستہ تھا۔ تیسرا گروہ مشرکین کا تھا جو قرآن کو پُرانے لوگوں کے قصّے بتا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب ہم لوگوں کو ڈرانے کے لیے من گھڑت باتیں ہیں جن کا ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن آخر ان سب کی کوششیں ناکام ہو کر رہ گئیں اور قرآن کی صداقت کا پرچم ہر خطۂ زمیں پہ لہرا گیا۔

۹- قرآنِ کریم مکمّل نظامِ حیات ہے

ہم انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ جسمانی و رُوحانی یا دینی و دُنیوی۔ اب ہم ان دونوں کا تجزیہ کر کے یہ دیکھتے ہیں کہ ان منزلوں میں قرآنِ کریم کہاں تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

۱- جسمانی یا مادّی زندگی انسان کی بقائے حیات کے لیے جس قدر سامان کی ضرورت تھی وُہ قدرت نے خود ہی زمین سے لے کر آسمان تک اسکے گرد پھیلا دیا ہے اور جا بجا قرآن میں اس کا ذکر کر کے انسان کو اس کی طرف توجّہ دلائی ہے۔

کائنات کا ایک ایک ذرّہ ہر وقت اس کی خدمت کے لیے کمربستہ ہے۔ زمین کو گرمانے والا سُورج چمکتے دمکتے چاند تارے۔ گھنگھور گھٹائیں۔ بجلی کی کڑک چمک موسلا دھار مینہ برسانے والے بادل ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سربفلک پہاڑ۔ بہتے دریا ہرے بھرے درخت۔ رسیلے میوے۔ زمین پہ دوڑنے والے جانور۔ فضا میں اُڑنے والے پرندے جن کا ذکر جا بجا قرآن میں ہے سب کے سب نظامِ حیاتِ انسانی کی بقاء کا سامان ہیں۔ ان سے فائدہ یا نقصان اُٹھانا خود انسان کا ذاتی فعل ہے۔ عقل مختلف تدابیر سے کام لے کر اپنے مفاد کے حق میں ان کو کارآمد بنا لیتی ہے۔ خداوندِ عالم نے اس کی عقل پہ بھروسہ نہ کر کے اس کی رہنمائی کے دُوسرے سامان بھی کیے ہیں۔

ھ۔ عملی اقدام کے لیے ہر انسان کے سامنے تین منزلیں ہیں جن سے اس کا نظامِ حیات وابستہ ہے۔

۱- گھریلو زندگی۔ ۲- معاشرتی زندگی۔ ۳- تمدّنی زندگی

ان تینوں مرحلوں میں صحت مند نظام اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا، انفرادی ہو یا اجتماعی، جب تک ماحول میں امن و سکون کی قابلِ اطمینان حالت نہ ہو۔ دماغی صلاحیتیں اس وقت بروئے کار آ سکتی ہیں جبکہ فتنہ و فساد کے گرد و غبار سے فضا محفوظ ہو۔ اس لیے قرآن نے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ۔ رُوئے زمین پر فتنہ و فساد جھگڑا اور ٹنٹا برپا نہ کرو۔ جیئو اور جینے دو کے اُصول کی خلاف ورزی نہ کرو۔

(۱) اہلی یا گھریلو زندگی : یہ ایک چھوٹی سی سلطنت ہوتی ہے جس کے ارکان میاں۔ بی بی۔ اولاد اور نوکر چاکر ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس زندگی کے جو قانون بتائے ہیں ان پر عمل کرنے سے گھر جنّت نشان بن جاتا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ مردوں کو عورتوں پر قابو حاصل ہے۔ عورت کو چاہیئے کہ مرد کی اطاعت کرے۔ اس کے بعد زن و شوہر دونوں کے حقوق معیّن کیے نکاح و طلاق کی صورتیں بیان کیں۔ چند بی بیوں کی صورت میں سب کے ساتھ مرد کو یکساں سلوک کرنا چاہیئے۔ مرد کو گھر والوں کے نان نفقہ کا ذمّہ دار بنایا۔ عورت کے سپرد گرہستی کے معاملات کیے۔ اخراجات میں فضول خرچی سے روکا۔ نافرمان عورتوں کی سزائیں مقرر کیں۔ نااتفاقی کی صُورت میں مصالحت کا طریقہ بتایا۔ طلاق کی صورت میں عورت کے کچھ حقوق بیان کیے۔ مرد کے اختیار میں طلاق رکھی تو عورت کے اختیار میں خلع۔ کوئی مر جائے تو ترکہ کا قانون بنایا۔ عِدّہ کی عورت کو مدّت بتائی۔ اولاد کی تربیت کے قاعدے بتائے۔ اولاد کے حقوق ماں باپ پر رکھے۔ ماں باپ کے حقوق اولاد پر معیّن کیے۔ غلام و کنیز کے حقوق معیّن کیے۔ ان کی آزادی کے طریقے بتائے۔ غرض کسی پہلو کو ناقص نہیں چھوڑا گیا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی سمجھا دی تاکہ کوئی نزاعی صُورت آپس میں پیدا ہو کر خانہ داری کا لُطف خاک میں نہ مل جائے۔ سورۂ نساء میں یہ تمام قوانین درج ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل پارہ پندرہ میں اولاد کو بتایا گیا ہے کہ وہ ماں باپ کے ساتھ کیا طریقۂ اطاعت اختیار کریں۔

(۲) معاشرتی زندگی : انسان اینٹ پتھر سے تو پیدا نہیں ہوتا، اس کے ضرور کچھ رشتہ دار ہوتے ہیں۔ جہاں رہتا ہے وہاں اس کے ہمسائے بھی ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات میں مدد لینے کے لیے کچھ دوست احباب بھی بنائے جاتے ہیں۔ اگر ان کے درمیان اتحاد و اتفاق نہ ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش نہ آئیں تو جان اجیرن ہو جائے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر قدرت نے حکم دیا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

(تم سب مل جل کر رہو اور ٹکڑیاں نہ بناؤ) - معاشرہ کی اصلاح کے قواعد بیان فرما دیئے مثلاً :

سورۂ بقرہ آیت ۱۷۷ میں ارشاد ہوتا ہے - اپنا مال خدا کی محبت میں اپنے رشتہ داروں کو دو - یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرو -

سورۂ نساء آیت ۳۶ میں ہے - احسان کرو اپنے والدین کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور اجنبی پردیسیوں اور اپنے پاس بیٹھنے والوں، لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ -

کوئی ایسا نہیں چھوڑا جس کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہو - مقصد یہ ہے کہ سب مل جل کر پیار و محبت سے زندگی بسر کریں - اگر کوئی نزاعی صورت پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح کا طریقہ بتایا گیا ہے - ناجائز مال کھانے سے روکا گیا ہے - بدی کا بدلہ نیکی سے دینے کی تاکید کی گئی ہے - سخت کلامی کا جواب نرمی سے دو - وقتِ ضرورت ایک دُوسرے کی مدد کرو - یتیموں کا مال چٹ نہ کر جاؤ - چوری - ڈکیتی - زنا، شراب خواری - سُود خواری - غیبت - حسد - جھوٹ - ظلم - دست درازی وغیرہ اعمالِ بد سے بچو کہ اس سے معاشرہ میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگ سکون و اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر سکتے -

درحقیقت یہی وہ بازار ہے جہاں سے انسان اپنے لیے زادِ آخرت خرید کرتا ہے - یہی وہ کھیتی ہے کہ جیسا بیج بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے - اہلی اور معاشرتی زندگی ہی انسان کو مستحقِ جنّت یا مستحقِ دوزخ بناتی ہے - خدا کی طرف سے جو ہادی بھیجے جاتے تھے اور کتابیں نازل ہوتی تھیں، ان سے انہی معاملات کی اصلاح مقصود ہوتی تھی - ان تمام باتوں پر اگر بحکمِ خدا عمل کیا جائے تو یہی عبادت بن جاتی ہیں -

(۳) تمدّنی زندگی : کوئی تمدّن ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا جب تک مُلکی قانون میں عامۃ النّاس کے حقوق کی پُوری پُوری نگہداشت نہ ہو اور حکمران پارٹی اس قانون کے نفاذ میں عدل و انصاف سے کام نہ لے - اس کے متعلق جو کچھ قرآن کہتا ہے اس کو سُنیئے :

۱- (قضایا کے فیصلوں میں) عدل سے کام لو کہ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب کرنے والا ہے -

۲- النّساء رکوع ۸ میں ہے کہ جب لوگوں کے درمیان حکم کرو تو انصاف سے حکم کرو -

۳- النّساء رکوع ۱۶ میں ہے - خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنو -

۴- اسی سورہ میں ہے کہ خدا کی خوشنودی کے لیے انصاف سے گواہی دو -

عدل و انصاف کے علاوہ جرائم پیشہ لوگوں کو قرار واقعی سزا دو - بغیر اس کے بھلائی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی - اور ظالم لوگ دست درازی سے نہیں رک سکتے - قرآن نے جرائم کی سزائیں بتا دی ہیں - صرف قید اور جرمانوں سے مظالم کا پُورا پُورا استیصال نہیں ہو سکتا -

رعایا کا فرض ہے کہ حدودِ مملکتِ اسلامی کی حفاظت میں اپنی جان و مال سے دریغ نہ کرے - اگر دشمن حملہ آور ہو تو ان سے دفاعی جنگ کرے - عادل بادشاہ کی مطیع و فرمانبردار رہے - ملک کے اندر بغاوت کی خاک نہ اُڑا اٹھے -

اِن اصلاحاتِ سہ گانہ کے علاوہ قرآنِ کریم نے اخلاقی تعلیم کا پُورا بندوبست کیا ہے اور نکوکاروں کے لیے

بڑے بڑے اجر رکھے ہیں - یہ بھی بتا دیا کہ جو ان پر عمل نہ کرے گا وہ چوپاؤں میں شامل سمجھا جائے گا بلکہ ان سے بھی بدتر -

۲- رُوحانی زندگی

نظامِ حیاتِ رُوحانی کی اصلاح کے لیے بے شمار آیات قرآن میں موجود ہیں - حیات بعد الموت میں جو کچھ انسان کے سامنے آتا ہے اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے - جنّت اور دوزخ کا پُورا نقشہ انسان کی نظر کے سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے - یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ دُنیا کی زندگی چند رُوزہ ہے - دوامی زندگی تو آخرت والی ہے اس کے لیے اسی دُنیا میں انسان کو تیار رہنا چاہیئے - مرنے کے بعد کوئی پُرسانِ حال نہ ہو گا - قیامت جب آجائے گی تو پھر کوئی کسی کا ساتھ نہ دے گا - ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو گی -

رُوحانی زندگی مادی زندگی سے علیحدہ ایک چیز ہے - آدمی جب مادی غذا کھاتا ہے تو چار چیزیں بنتی ہیں، خُون سودا - صفرا اور بلغم - لیکن جب انسان اپنے نفس کو تقویٰ کی غذا دیتا ہے تو چار چیزیں بنتی ہیں، حکمت - عفّت - عدالت اور شجاعت - اور جب معرفت کی غذا دیتا ہے تو چار چیزیں بنتی ہیں، یقین - وجدان - جذب اور فنا -

انسان جب تک اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کرے گا وہ رُوحانیت کی منزل میں قدم نہیں رکھ سکتا - اور جب تک رُوحانیت کی منزلیں طے نہ ہوں گی وہ مقربِ بارگاہِ ایزدی نہیں بن سکتا - حکمت و عفّت و عدالت و شجاعت کو فضائلِ چہارگانہ کہا جاتا ہے - ان چاروں سے جو نومیں نکلتی ہیں وہ اڑتالیس ہیں - جیسے صبر و شکر و قناعت و توکّل، زُہد و وَرع وغیرہ وغیرہ - جب ان منزلوں کو طے کر لیا جاتا ہے تو انسان روشن ضمیر بن جاتا ہے اور اس کے نفس میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ اگر درخت سے کہے کہ اکھڑ آ تو وہ اُکھڑ آئے گا - قرآن میں ان سب منزلوں کا ذکر ہے اور ان کے اچھے نتیجوں کا بھی -

یہی زندگی انسان کی اصلی زندگی ہے جسمانی زندگی تو ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ یہ مدارج حاصل کیے جاتے ہیں - جب تک یہ مراحل طے نہ کیے جائیں نفسِ مطمئنّہ انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا - انبیاء و آئمہ اسی زندگی کے مالک تھے -

۱۰- قرآن اور تحریف

خدا کی کتابوں میں تحریف سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر کرنے والے یہ بھی کر جاتے ہیں - قرآن بتاتا ہے کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی ہے اور بہت بدنما طریقہ سے ہوئی ہے - جس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ کتابیں ذمّہ دار ہستیوں کے ہاتھوں سے نکل کر علمائے یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں - چونکہ وہ خدا و رسول کی طرف سے ذمّہ دار نہیں بنائے گئے تھے لہٰذا انہوں نے نہایت بے باکی سے من مانے تصرّفات شروع کر دیے - قرآن کہتا ہے :

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (وہ کلماتِ خدا کو ان کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جاتے ہیں -)

پھر سورۂ بقرہ ع ۵ میں ہے - میری آیات کو تھوڑی قیمت (دنیوی فائدہ کے لیے) پر فروخت نہ کرو - پھر سورہ بقرہ ع ۶ میں ہے جو بات ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا - سورۂ بقرہ ع ۹ میں ہے - جو بات ان سے

کبھی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا۔ سورۂ بقرہ ع ۹ میں ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالیں۔

بحمد للہ قرآن میں ایسے تصرفات نہیں ہوئے تاہم تحریف سے محفوظ نہیں رہا۔ حضرت علی علیہ السلام نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قرآن کو موافق تنزیل جمع کیا۔ لیکن حکومت نے کسی مصلحت سے اس کا رائج کرنا منظور نہ کیا۔ ان کی جمع کا کام مختلف اوقات میں ہوتا رہا۔ موجودہ قرآن حضرت عثمانؓ کا جمع کیا ہوا ہے جس کو انھوں نے چند حافظینِ قرآن صحابہؓ کے ذریعہ سے سرانجام دیا تھا۔ اس کے سُوروں اور آیتوں کی ترتیب موافق تنزیل نہیں۔ بلکہ مکی و مدنی سورے گھڑی ہو رہے ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورے ہوتے پھر مدنی مگر ایسا ہے نہیں۔ پہلا سورہ بقر مدنی ہے دوسرا آلِ عمران بھی مدنی ہے۔ آگے سورۂ مائدہ بھی مدنی ہے۔ اس کے بعد سورہ الانعام مکی ہے۔ آگے بھی یہی صورت ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ کون بتائے۔ اسی طرح آیات میں بھی بے ترتیبی ہے۔ مثلاً

(۱) بیوہ کا عدہ پ۲ سورہ بقرہ ع ۳۰ میں چار مہینے دس دن بتایا گیا ہے۔
پ۲ البقر ع ۳۱ میں ایک سال ہے۔ پہلی آیت دوسری کی ناسخ ہے لیکن ہے یوں کہ منسوخ بعد میں ہے اور ناسخ پہلے۔ یعنی اُلٹی بات۔

(۲) پ۱۱ یونس آیت ۳ میں، اگر تم سچے ہو تو ایک ہی سورہ ایسا بنا لاؤ۔
پھر سورہ ہود آیت ۱۳ پارہ ۱۲ میں ہے، دس سورے ایسے بنا لاؤ۔ قاعدہ سے پہلے تحدی کی جاتی دس سوروں کی پھر ہوتی ایک سورہ سے۔

(۳) تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سورہ اقراء سب سے پہلے نازل ہوئی لیکن وہ آخری پارہ میں ہے۔

(۴) آیہ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ جو حضورؐ کی آخر زندگی میں نازل ہوئی تھی وہ سورۂ مائدہ میں ہے۔ اسی طرح آیہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ آیہ بلّغ کے بعد نازل ہوئی۔ وہ بھی سورۂ مائدہ میں ہے۔

(۵) آیہ تطہیر کے اوّل و آخر ازواجِ رسولؐ کا ذکر ہے اس کے بیچ میں آیت تطہیر رکھ دی گئی ہے۔ جس کا ازواجؓ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس میں سب ضمیریں جمع مذکر حاضر کی ہیں اور اوّل و آخر جو ازواج سے متعلق آیات ہیں، ان سب میں جمع مؤنث حاضر کی ہیں۔

بہرحال یہ مسلم ہے کہ موجودہ قرآن حرف بحرف خدا کا کلام ہے اور اس پورے قرآن پر ہمارا ایمان ہے۔ اگر خدانخواستہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوتی تو حضرت علی علیہ السلام کبھی قبول نہ کرتے چاہے ان کو کیسی ہی بڑی سے بڑی قربانی دینا پڑتی۔ شیعوں پر یہ اعتراض بے بنیاد ہے کہ وہ اس قرآن کو نہیں مانتے۔ کوئی ایک شیعہ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو موجودہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ بلکہ تمام حرکات و سکنات پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو جو قرآن شیعہ پڑھتے ہیں سمجھتے ہیں ان میں کچھ تو اختلاف ہوتا مگر ایسا نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر اس اعتراض کے کیا معنی ہیں کہ قرآن پر شیعوں کا ایمان نہیں۔

۱۱- جمعِ قرآن

آنحضرتؐ کے زمانہ میں قرآن کی آیات جب نازل ہوتی تھیں تو ان کی حفاظت دو طریق سے کی جاتی تھی کچھ لوگ حفظ کر لیتے تھے اور کچھ لوگ جو کاتبانِ وحی کہلاتے تھے بحکم حضورؐ اونٹ کی ہڈیوں۔ لکڑی کی تختیوں۔ کھجور کے پتّوں یا کھال پر لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی زندگی تک قرآنی آیات میں کوئی ترتیبی صُورت پیدا نہ ہوئی۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے قسم کھائی کہ جب تک قرآن کو موافق تنزیل جمع نہ کر لوں گا سوائے نماز کسی وقت اپنے شانوں پر رِدا نہ ڈالوں گا۔ چنانچہ دو سال تک آپؑ نے گوشہ نشین ہو کر یہ خدمت نہایت جانفشانی سے انجام دی۔ درحقیقت یہ کام تھا بھی حضرت علیؑ ہی کے کرنے کا۔ اوّل تو آپؑ ایک ایک آیت سے باخبر تھے۔ کیونکہ آغازِ نزول سے آخر تک آپؑ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ کے ساتھ رہے تھے۔ خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ یہ سعادت کسی اور صحابیؓ کو نصیب نہیں ہوئی۔ دُوسرے خود حضورؐ نے ایک ایک آیت کی تفسیر و تاویل حضرت علیؑ کو بتائی تھی اور جس کی شان میں جو آیت نازل ہوئی تھی اس کا نام اور وجہِ نزُول بھی بتا دی تھی۔ اسی لیے حضرت علیؑ کو جمع و ترتیب کے وقت کسی سے پُوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس وقت قرآنِ مجید بخطِ کوفی لکھا جاتا تھا۔ جس میں اعراب اور نقطے نہیں ہوتے تھے۔ الغرض موافق تنزیل جب پُورا قرآن جمع ہو گیا تو آپؑ اس کو لے کر خلیفۂ وقت حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے تاکہ اسلامی حکومت میں رائج ہو۔ اس وقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ دونوں نے کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کو جاری کرنا منظور نہ کیا۔ حضرت علیؑ کو سخت ملال ہوا۔ اور یہ کہہ کر واپس تشریف لے آئے کہ اب اس قرآن کو کبھی نہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے بعد پردۂ غیب میں رکھا گیا جو ایک منصوص من اللہ امام سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ اب وہ ولیٔ عصر حضرت امام مہدی آخر الزمان کے پاس ہے اور قُربِ قیامت میں جب حضرتؑ کا ظہور ہوگا اس وقت ظاہر فرما دیں گے۔

اس کے بعد قرآن کا بیان حافظوں کی زبان پر رہا۔ جب جنگِ یمامہ میں چار سو حافظینِ قرآن شہید کیے گئے، تو حضرت عمرؓ کو اس کے کتابی صورت میں لانے کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے ارادہ کو پُورا نہ کر پائے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ کام حضرت عثمانؓ نے اپنے ہاتھ میں لیا مگر وہ چونکہ خود اس کی تکمیل سے قاصر تھے لہٰذا ایک نوجوان زیدؓ بن ثابت کو اس کا منصرم و مہتمم بنایا۔ یہ کام زید کے کرنے کا نہ تھا کیونکہ وہ عہدِ رسالتؐ میں ایک کمسن لڑکا تھا۔ صحبتِ رسولؐ کا اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔ تاہم حافظوں اور قاریوں کی مدد سے اور ان اجزا سے جو حضرت حفصہؓ یا ابنِ مسعودؓ وغیرہ کے پاس تھے، یہ قرآن مرتب کیا گیا۔

قرآن کا جمع کرنا بے شک بڑی نیکی اور باعثِ اجرِ عظیم ہے کیونکہ وہ اساسِ شریعت ہے۔ لیکن جمع کرنے والے کو علمِ قرآن سے پُوری طرح واقف ہونا چاہیئے تھا ورنہ ترتیبِ آیات و سُور موافق تنزیل نہیں ہو سکتی۔ جب آیات کے باہمی تعلق و سیاق و سباق پر جامع مطلع نہ ہو تو یہ کام صحیح نہ ہوگا۔

رسولؐ نے علی علیہ السلام کے سوا قرآن کو اور کسی کے ساتھ نہیں کیا۔ آپؐ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے، عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ۔ (علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے۔) حضرت علیؑ کے جمع کردہ قرآن میں

ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں تفسیری توضیحات حواشی پر تھیں مثلاً کون آیت کہاں نازل ہوئی، کب نازل ہوئی، کس کی شان میں نازل ہوئی اور کس امر کے متعلق نازل ہوئی۔ ابنِ عباسؓ کہا کرتے تھے اگر علی علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن ہمارے پاس ہوتا تو ہمیں بڑے فوائد حاصل ہوتے۔ منافقین کی مذمت میں جو آیات تھیں ان کے نام بھی لکھ دیئے گئے تھے۔ ایسی صورت میں لوگ کیونکہ علیؑ کے جمع کردہ قرآن کو تسلیم کر سکتے تھے اور اگر تسلیم کر لیتے تو پھر دنیا کو کیا منہ دکھاتے اور پسِ پردہ اسلام میں جو نسکار کھیلے گئے وہ کیسے کھیلے جاتے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حکومت کے مسترد کرنے کے بعد جب حضرت علیؑ قرآن واپس لے گئے تو زیدؓ بن ثابت نے حضرت عمرؓ سے کہا اس قرآن کو حضرت علیؑ سے لے لیجئے اور اس کے حواشی مٹا دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے جب مانگا تو حضرت علیؑ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا حجت تمام ہو چکی۔ اب تم اسے کبھی نہ دیکھو گے۔ اس کو میرا فرزند قائم آلِ محمدؐ اپنے ظہور کے وقت اپنے ساتھ لے کر نکلے گا۔

جمعِ قرآن کے متعلق علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں زید بن ثابت سے روایت کی ہے کہ قرآن عہدِ رسالتؐ میں جمع ہوا تھا۔ علامہ بیہقی نے اس کی توضیح یوں کی ہے کہ جمع قرآن سے مراد جمع آیاتِ قرآنیہ ہے کہ حضرت رسولؐ نے سورتوں کی حدود مقرر فرمائی تھیں۔ اس کے بعد جو آیت نازل ہوتی تھی آپؐ فرما دیتے تھے کہ فلاں سورہ میں اسے درج کرو۔ اسی طرح حضرتؐ نے تمام آیات کو خود ہی سورتوں میں علیحدہ علیحدہ جمع فرما دیا تھا۔ لیکن سورتیں یکجا نہ تھیں۔ بعض پتھروں پر بعض درختوں کے پتوں پر اور بعض چمڑے پر تحریر تھیں جن کو بعد میں جمع کیا گیا۔ موطاء میں عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو کاغذ پر جمع کیا تھا۔ چنانچہ اس کام میں بحکم عمر زید بن ثابتؓ سے کام لیا گیا۔

سیوطی نے بروایت ابنِ داؤد حضرت علیؑ کو پہلا جامع قرآن ہونا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ قرآن کے جامع حضرت عثمانؓ ہیں لیکن یہ غلط ہے۔ انہوں نے لوگوں کو ایک قرأت پر متفق ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ جناب حفصہؓ سے واپسی کے وعدہ پر قرآن منگا کر یہ کام انجام دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ کو لکھنے کا حکم دیا تھا اور ہر اسلامی شہر میں ایک ایک نقل بھیج دی تھی۔ نتیجہ اس بیان سے یہ نکلا کہ حضرت عثمانؓ صرف حکم دینے والے تھے اور جامع قرآن یہ پانچ شخص تھے۔ تاریخ الخلفاء میں ہے کہ حضرت علیؑ نے عہدِ رسالتؐ میں قرآن جمع کر کے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ پس اگر علیؑ کا جمع کردہ قرآن مصدقہ رسولؐ تھا تو پھر اس کو رَد کیوں کیا گیا۔

ایک بڑی ضروری بحث اس سلسلہ میں یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عہدِ سلطنت میں اپنے جمع کردہ قرآن کو رائج کیوں نہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے۔

۱۔ حضرت عثمانؓ کا جمع کردہ قرآن جب تمام اسلامی ممالک میں رواج پا چکا تھا۔ گھر گھر میں پڑھا جا رہا تھا۔ تو حضرت علیؑ ان تمام قرآنوں کو کیسے واپس لے سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ ملک شام پر معاویہ کی حکومت تھی اور انہیں حضرت علیؑ سے سخت عداوت تھی۔

۲۔ اگر بالفرض حضرت علیؑ اپنے جمع کردہ قرآن کو اپنے مقبوضہ علاقہ میں جمع کر دیتے تو دو قرآن ہو جاتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دونوں ساقط الاعتبار ہو جاتے۔ وقتِ مباحثہ و مناظرہ غیر مسلم قومیں کہہ سکتی تھیں پہلے یہ ثابت کرو کہ ان دونوں قرآنوں میں صحیح کون سا ہے۔ جیسے ان اختلافات نے انجیل کو ساقط الاعتبار بنا دیا۔ قرآن بھی ایک مسلمہ حقیقت نہ رہتا۔ اور یہ اسلام کے لیے ایک ایسا عظیم الشان نقصان ہوتا جس کی تلافی ناممکن ہوتی۔ علی علیہ السلام اسے کیسے گوارا کر سکتے تھے۔

۳۔ صرف ترتیبِ قرآن کے بدل جانے سے اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا اس کے ساقط الاعتبار ہو جانے سے نقصان ہوتا۔ لہٰذا حضرت علیؑ نے موجودہ قرآن ہی کو باقی رکھنا مناسب سمجھا اور اس کے ایک زیر زبر کو بھی بدلنا گوارا نہ کیا۔

لوگ کہتے ہیں شیعوں کا ایمان اس قرآن پر نہیں۔ ایسے لوگ تعصب کی آگ سے سوختہ ذہن ہیں۔ اگر ہمارا ایمان اس قرآن پر نہ ہوتا تو کوئی دوسرا قرآن ہمارے پاس ہوتا۔ حالانکہ کسی زمانہ میں بھی ایسا نہیں ہوا۔ جو قرآن شیعہ پریسوں میں شیعوں کی نگرانی میں چھپے ہیں ان کو پڑھ کر بتاؤ کہاں فرق ہے۔ جب ایسا نہیں تو یہ الزام احمقانہ اور متعصبانہ ہے۔

۱۲۔ اقسامِ آیات

قرآن مجید میں مختلف قسم کی آیات ہیں:

۱۔ حلال: ہر پاک چیز اور درست قول۔
۲۔ حرام: ناپسندیدہ عمل جیسے خون۔ سُؤر کا گوشت۔ مُردہ حرام ہے۔
۳۔ فرائض: واجبات جیسے نماز، روزہ۔
۴۔ فضائل: جیسے نوافل و صدقات۔
۵۔ ناسخ: جو کسی حکم کا منسوخ کرنے والا ہو۔
۶۔ منسوخ: جو کسی آیت سے ناقابلِ عمل قرار دیا گیا ہو۔
۷۔ رخصت: جس کی اجازت بہ مجبوری دی گئی ہو۔
۸۔ خاص: جیسے اگر کوئی عورت رسول کو اپنا نفس ہبہ کرے یہ حکم خاص رسول کے لیے ہے۔
۹۔ عام: جو حکم سب کے لیے ہو جیسے نماز، روزہ۔
۱۰۔ عِبَر: جن سے دوسروں کو عبرت ہو۔
۱۱۔ اَمثال: مثالیں بغرض اصلاحِ نفس
۱۲۔ مرسَل: غیر مقید حکم جیسے گائے ذبح کرو۔
۱۳۔ محکم: جن کا مفہوم صاف ہو۔
۱۴۔ متشابہ: جو محتاجِ تاویل ہوں۔

۱۵- محدود : احکام کے ساتھ مقید جیسے بنی اسرائیل کے لیے گائے کو صفات کے ساتھ محدود کر دیا تھا۔

۱۶- مجمل : جن کی تفصیل ظاہر نہ ہو جیسے نماز کا حکم ہے مگر وقت، رکعات وغیرہ نہیں بتائی گئیں۔

۱۷- مُبَیَّن : وہ احکام جن کی تفصیل بتا دی گئی ہو۔

~ ~ ~

سب سے زیادہ اہم چیز آیات متشابہات کی تاویلیں ہیں۔ اسلام میں تہتّر فرقے انہی کی غلط تاویلات سے بنے ہیں۔ یہ تاویلیں جو حضرت رسولِ خدا اور حضرات ائمہ کی بتائی ہوئی ہیں وہی صحیح ہیں باقی سب غلط ہیں۔

ایک مولوی کسی مجمع میں وعظ کر رہا تھا۔ کہنے لگا ہم قیامت میں اپنے پروردگار کو ایک تخت پر بیٹھا دیکھیں گے اس کا منوّر چہرہ ہمارے سامنے ہوگا۔ ایک عالم اِدھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے کہا لے شخص! اس کا کیا ثبوت ہے کہ تو خدا کا چہرہ دیکھے گا۔ اُس نے کہا، قرآن کی کیا یہ آیت تو نے نہیں پڑھی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (کچھ چہرے اس روز شگفتہ ہوں گے اور اپنے ربّ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔) اس عالم نے کہا، لے شخص جب تو ان آنکھوں سے اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھ سکتا تو خدا کا چہرہ کیا دیکھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں خدا کے احکام کی طرف نظر کر رہے ہوں گے کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے۔

رسولؐ نے قرآن کے ساتھ اپنے اہلبیتؑ کو اس لیے کیا ہے کہ لوگوں کو تفسیر بالرائے سے بچائیں اور آیاتِ متشابہات کی صحیح تاویلیں بتائیں۔ لوگوں نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ میں ایک دین کے تہتّر فرقے ہو گئے۔ ان سب کے پاس قرآن ہے مگر ان کو ہدایت حاصل نہیں ہوتی۔

۱۳- قرآن اور اس پر اعراب

جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں قرآن پہلے خطِ کوفی میں سالہا سال لکھا جاتا رہا۔ اس طرزِ تحریر میں الفاظ پر نہ تو نقطے ہوتے تھے نہ اعراب۔ سیاق و سباق سے آیات کو پڑھا جاتا تھا۔ اس صورت میں غلط اعراب پڑھنے سے الفاظ کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے۔ مشہور روایت یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان اُموی بادشاہ کے زمانہ سے قرآن خطِ کوفی سے خطِ نسخ میں تبدیل ہوا اور اس پر اعراب لگائے گئے۔ یہ کام اُس نے حجاج بن یوسف ثقفی گورنرِ کوفہ کے سپرد کیا۔ یہ وہی اظلم روزگار انسان ہے جس نے شیعیانِ علیؑ کو چن چن کر قتل کیا تھا اور جس کے متعلق عمر بن عبدالعزیزؒ اُموی بادشاہ نے یہ کہا تھا اگر روزِ حشر لوگوں کے گناہ تولے جائیں گے تو جس پلہ میں تمام دُنیا کے گناہ ہوں گے ہم اس کے مقابل پلہ میں صرف حجاج کے گناہ رکھ دیں گے تو یہ پلہ پھر بھی بھاری رہے گا۔ بہرحال علماء و قاریوں نے قرآن کو جمع کر کے اعراب لگائے۔ لیکن اعراب لگانے والوں نے اپنے مذہبی عقیدہ کو ترک نہیں کیا۔ مثلاً آیۂ وضو میں اَرْجُلِكُمْ کے لام پر بجائے زیر کے زبر لگا دیا۔ آیت یہ ہے:

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ۔ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (المائدہ ۵: آیت ۶)

اَرْجُلَكُمْ کا تعلق بجائے وَامْسَحُوْا کے جو قریبی فعل ہے فَاغْسِلُوْا سے پیدا کیا گیا جو دُور ہے اور ایک فصلِ اجنبی اَمْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ کا بیچ میں حائل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے پیر کا مسح کرنے کے اس کا دھونا لازم قرار دیا گیا۔

ایسے ہی وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ الخ (آل عمران ۳ آیت ۷) میں اِلَّا اللّٰہ کے بعد مطلق کی میم لگا دی جس سے معنی یہ ہوئے کہ متشابہات کی تاویل بس اللہ ہی جانتا ہے۔ رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کا اس سے تعلق نہ رہا بلکہ اگلے حصّہ سے ہو گیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب تاویل جاننے کا تعلق صرف اللہ ہی سے ہے تو اللہ سے معلوم کون کرے۔

۱۴- قرآن کی ہمہ گیر اثر انگیزی و معجز نمائی

سولہ سنگھار سے آراستہ ایک دوشیزہ حسن کا پیکر ایک شباب سے بھرپور جوان کی طرف سے گزرتی ہے تو یکایک اس کے دل سے سمندر کا سا طوفان پھوٹ نکلتا ہے۔ یہ حسینہ کے جمالِ جاں فروز کا اثر ہے۔ ایک عالم متبحر بحرالعلوم ایک محفل میں آتا ہے۔ سب لوگ اس کی تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اُس کے فضل و کمال کی عظمت کا اثر ہے۔ ایک شیر کو دیکھتے ہی لوگوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل کانپنے لگتے ہیں۔ یہ اُس کی قوت و ہیبت کا اثر ہے یہ فطری عوامل ہیں جو بغیر اپنا اثر دکھائے نہیں رہتے۔ اب ذرا قرآنِ کریم کی اثر انگیزی پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ وہ فطرتِ انسانی کو اپنے اثرات کے پنجہ میں کس طرح دبوچتا ہے۔

۱- ایک فلسفی قرآن پڑھ رہا ہے مگر وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے میں گم ہو جاتا ہے۔ شاید بحرِ ناپیدا کنار کے اندر اُسے کچھ ایسے موتی نظر آتے ہیں جو اس سے پہلے اُس نے نہیں دیکھے تھے۔ وہ دریائے حیرت میں ڈوبا ہوا اپنے اندازِ فکر کو کھو بیٹھا ہے۔ یہ قرآن کی حقائق بیانی کا اثر ہے۔ اگرچہ قرآن فلسفہ کی کتاب نہیں۔

۲- ایک منطقی قرآنی دعووں پر روشن دلیلوں کو اشکالِ اربعہ کے معیار پر کس کس کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے تصورات تصدیقات کی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ کُلی مشکک اس کے دماغ میں مر کر رہ گئی ہے۔ وہ حیران ہے کہ میں کہاں ہوں اور کیا دیکھ رہا ہوں۔ ایسے پختہ دلائل میں نے کسی منطقی کتاب میں نہیں دیکھے۔ یہ خاصہ اسی کتاب کا ہے کہ اس نے مجھے جادو کی نہیں بلکہ معجزہ کی شان دکھائی ہے۔ یہ اثر ہے ان دلائل و براہین کا جو قرآن اپنے ہر دعویٰ پر بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ منطق کی کتاب نہیں۔

۳- ایک باکمال سائنس دان قرآن کی تلاوت کر رہا ہے۔ نظامِ شمسی کا ایک ایک زاویہ مسلسل فلم کی طرح اس کی نظر کے سامنے آ رہا ہے۔ سورج۔ چاند۔ کواکب۔ بروج۔ برق۔ بادل۔ ہوا۔ دریا۔ پہاڑ۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوانات کا بیان ایک نئے انداز سے پا رہا ہے، وجد میں ہے کہ چودہ سو برس پہلے قرآن کائنات کے ان عقدوں کو حل کرتا ہوا آیا ہے۔ جن کی جستجو میں ہم سرگرداں ہیں۔ یہ اثر ہے ان سربستہ رازوں کے انکشاف کا جو قرآن نے کیے ہیں،

حالانکہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں -

۴ - ایک طبیب کے ہاتھ میں قرآن ہے وہ حفظانِ صحت کے اُصول اس میں پڑھ کر اپنی تمام معلومات کو اس کے مقابل ہیچ سمجھ رہا ہے - یہ اثر ہے قرآن کے اس بیان کا جو نظامِ حیاتِ انسانی کے قائم و برقرار رکھنے سے متعلق ہے حالانکہ وہ طبّی کتاب نہیں -

۵ - علمُ الاَخلاق کا ایک ماہر جب تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے قاعدے قرآن میں پاتا ہے تو اس کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی - یہ اثر ہے قرآن کے نفس اور رُوح کو مدارجِ ترقّی پر پہنچانے کے بیان کا - حالانکہ وہ علم الاخلاق کی کتاب نہیں -

اسی طرح تمام علوم و فنون کے ماہر اس سے درس لے رہے ہیں اور کہیں شک و شبہ کی ان کو گنجائش نظر نہیں آتی - وہ قرآن کے اس دعوے کو بالکل سچا پاتے ہیں کہ اس میں ہر شے کا بیان ہے - چھوٹی بڑی کوئی شے چھوڑی نہیں گئی - ہاں تلاش کرنے کے لیے نظر درکار ہے اس کے اثرات انسان کے جسم و نفس و روح - بچّے اور بوڑھے - زن و مرد - عالم و جاہل غریب و امیر سب پر چھائے ہُوئے ہیں - یہ اسی کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ دائرۂ اسلام میں جوق درجوق لوگ داخل ہوتے چلے جارہے ہیں اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے -

ان اثرات کے عالم گیر ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ اس مقدس کتاب کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کی ہدایت میں شک و شبہ کی گنجائش ہو یا کوئی منکرِ قرآن اس کی کسی ہدایت کو غلط ثابت کر سکے -

ھ - اب اس کی معجز نمائی پر ذرا سا غور کر لیجئے :

دُنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں پائی جاتی جس کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی انسان کی دلچسپی بدستور باقی رہے - وہ چاہے کیسی ہی دلچسپ کتاب ہو دو چار بار پڑھنے کے بعد طبیعت اس سے سیر ہو جاتی ہے - لیکن قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ عمر بھر لوگ اُسے صبح و شام پڑھتے رہتے ہیں مگر دلچسپی کم نہیں ہوتی -

جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے ان کو طبعًا کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیئے - کیونکہ جو بات انسان کی سمجھ میں نہیں آتی اُسے نہ شوق سے پڑھتا ہے نہ سنتا ہے لیکن قرآن کی یہ اعجازی شان دیدنی ہے کہ بے شمار افراد جو عربی نہیں جانتے بڑے احترام اور شوق سے اُسے پڑھتے ہیں اور ہر روز پڑھتے ہیں اور اُسی ذوق و شوق سے جیسے ایک عربی دان پڑھتا ہے -

دُنیا میں کسی کتاب کے قلمی نسخے قرآن سے زیادہ نہیں پائے گئے - ہزارہا آدمیوں نے بڑے شوق و ذوق سے قرآن کو لکھا ہے اور اس کو اپنی سعادت سمجھ کر لکھا ہے - فنِ خطاطی کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کی مثل نہیں لکھی گئی - اور کسی کتاب کے اوراق پر مُوقلم سے ایسی خوشنما خط کشی نہیں ہوئی اور نہ ایسے نظر افروز بیل بُوٹے بنائے گئے ہیں عقل حیران ہوتی ہے کہ لکھنے والوں نے کتنے سالوں میں اسے لکھا ہوگا اور یہ رنگ برنگ کی سیاہیاں کیسے بنائی گئی ہیں - ہم نے ایسے قرآن اپنی آنکھوں سے لکھے ہوئے دیکھے ہیں :

۱ - جن پر مختلف وزن کا سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے - ایک قرآن کے اوراق پر ۳۵ تولے سونا چڑھا ہُوا دیکھا -

۲ - ایک قرآن ایسا دیکھا جس کے حروف کے دائرے اس شان سے لکھے گئے ہیں کہ اگر اُوپر کے صفحہ کے کسی دائرہ میں سُوئی گڑودی جائے تو آخر تک کسی نہ کسی دائرہ کے اندر ہی جائے گی -

۳ - ایسا قرآن بھی دیکھا جس کے ہر صفحہ پر چار خانے بنائے گئے ہیں - ہر خانہ کا پہلا خط شاملِ الفاظ ہے مثلاً :

لحمدُ لله ربّ	لعالمين الرّحمن	لرّحيم مالك يوم	لدّين اياك نعبدُ
يّاك نستعين	هدنا الصّراط	لمستقيم صراط الّذين	نعمت عليهم غير

۴ - آیاتِ قرآنی کو ناخن سے نہایت خوش خط لکھا گیا ہے -

۵ - آیات کے قابلِ دید طغرے بنائے گئے ہیں -

یہ بھی قرآن کی اعجازی شان ہے کہ اس کے حافظ لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ہر زمانہ میں پائے جاتے رہے ہیں - ورنہ اتنی ضخیم کتاب مع صحیح اعراب کے حفظ کرنا سوائے اعجازی شان کے اور کیا کہا جاسکتا ہے - کسی زمانہ میں کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں ہُوا -

یہ احترام بھی قرآن ہی سے مخصوص ہے کہ بے وُضو اس کی عبارت کو چھُونا جائز نہیں -

یہ خصوصیّت بھی قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کے کسی حکم کی تبدیلی کا قیامت تک کسی کو اختیار حاصل نہیں - خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو یا کتنا ہی بڑا بادشاہ -

یہ خصوصیّت بھی قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کی سُورتوں اور آیتوں سے امراض کا علاج کیا جاتا ہے سحر و آسیب کے اثرات کو دُور کیا جاتا ہے -

یہ خصوصیّت بھی قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کی سینکڑوں تفسیریں ہر زبان میں لکھی جاچکی ہیں ، جن میں سے بعض سَو جلد پر مشتمل ہیں -

یہ بھی خصوصیّت قرآن ہی کو حاصل ہے کہ باوجود تحدّی کے چودہ سو برس سے کوئی ایک سورہ کا بھی جواب نہیں لاسکا -

یہ خصوصیّت بھی قرآن کو حاصل ہے کہ اس کی تلاوت سے پہاڑ چل نکلتے ہیں ، زمین سمٹ آتی ہے اور مُردے بول اُٹھتے ہیں - (پ۱۳ الرّعد آیت ۳۱)

یہ خصوصیّت بھی قرآن ہی کو حاصل ہے کہ آج تک وہ عربی زبان میں بدستور باقی ہے - توریت و انجیل اصلی زبان میں ڈھونڈے نہیں ملتیں -

یہ بھی قرآن ہی کی خصوصیّت ہے کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ کو بصورت معجزہ دیا گیا تھا - سب انبیاء کے معجزات ختم ہو گئے مگر قرآن اُسی اعجازی شان سے آج تک باقی ہے -

۱۵- قرآن معجزہ ہے

خدا جب کسی نبی کو ہدایتِ خلق کے لیے بھیجتا ہے تو اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے کوئی معجزہ بھی دیتا ہے ورنہ لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ خدا کا رسول ہے۔ خدا خود تو ان سے یہ کہنے نہیں آتا کہ یہ میرا رسول ہے تم اس کی ہدایت پر عمل کرو اور جب تک اس سے کوئی خارق عادت امر ظاہر نہ ہو لوگ اس کو رسول تسلیم نہیں کرتے۔ ایک جھوٹا نبی بھی یہ دعا کر سکتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ اس کے دعوے کا ابطال کیونکر کیا جائے۔ لہٰذا جھوٹے نبی کی تکذیب اور سچے نبی کی تصدیق کے لیے معجزہ دینا ضروری ہے۔

معجزہ کے معنی عاجز کر دینے والا ہے یعنی نبی جو خارق عادت عمل دکھاتا ہے کسی کی طاقت نہیں کہ اس کے مقابل ویسا ہی عمل پیش کر سکے یا معجزہ پر غالب آئے۔ معجزہ دیکھنے کے بعد اگر کوئی نہ مانے تو وہ کافر کہلاتا ہے اور مستحقِ عذاب ہو جاتا ہے۔ معجزہ کے ساتھ ضروری ہے کہ دعوئ نبوت بھی ہو۔

دُنیا میں بہت سے باکمال ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ہیں جو خارق عادت بہت سی چیزیں لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ جیسے جادُوگر۔ شعبدہ باز۔ مسمریزم والے۔ صنّاع۔ موجدین اور اُدبا وغیرہ۔ لیکن چونکہ وہ دعوئ نبوت نہیں کرتے لہٰذا وہ معجزہ نہیں کہلاتا بلکہ ذاتی کمال کہلاتا ہے جس کا اظہار دنیا میں اکثر افراد سے ہوتا رہتا ہے لہٰذا اس کے باطل کرنے کی خدا کو ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ خدا کی عطا کردہ دماغی صلاحیت کی پیداوار ہوتی ہے اور ان اسباب سے کام لینے کا نتیجہ ہوتا ہے جو خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ خدا کو کیا پڑی ہے کہ کسی صاحبِ کمال بندہ کے کمال کو ملیامیٹ کر دے ہاں اگر دعوئ نبوت کے ساتھ کوئی کمال دکھلائے اور اس کو معجزہ کہے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے تب البتہ خدا اس کے اس دعویٰ کو باطل کر دے گا جیسا مسیلمہ کذاب کا مشہور واقعہ ہے کہ لوگوں نے اس سے کہا اگر تم نبی ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ اُس نے کہا بتاؤ کیا کروں۔ انہوں نے کہا اس کنویں کا پانی کھاری ہے تم اسے میٹھا کر دو۔ اس نے اپنا لعابِ دہن اس میں ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ کنواں ہی خشک ہو گیا۔ یا سجاعہ نے جو مدعئ نبوت تھی ایک کالی عورت کو گوری بنانے کے لیے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا وہ نہایت بدشکل بوڑھی عورت بن گئی۔

مُعجزہ اور جادُو میں فرق معجزہ پر کسی جادُوگر کا عمل غالب نہیں آسکتا۔ معجزہ اس پر غالب آسکتا ہے۔ ایک جادوگر کے جادو کا اثر دوسرا جادوگر باطل کر سکتا ہے معجزہ کے لیے ایسا نہیں۔ جادوگر کو کچھ سفلی عمل کرنے کے بعد جادُو میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ معجزنما کے لیے کسی ریاضت کی ضرورت نہیں جیسے حضرت موسیٰؑ کا عصا ہاتھ سے گرتے ہی سانپ بن جاتا تھا۔ جادو شیطانی عمل ہے اور معجزہ خدا کا عطا کردہ ہوتا ہے۔

مُعجزہ اور کرامت میں فرق ریاضتِ نفس کے بعد اکثر اولیائے خدا سے کرامتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ جو

خارقِ عادات ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو معجزہ نہیں کہا جاتا کیونکہ معجزہ کے لیے دعوئ نبوت کی شرط ہے۔ کرامت، ریاضتِ نفس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ معجزہ نبوت کا ثبوت ہوتا ہے۔ صاحبِ کرامت مدعی نبوت نہیں ہوتا ورنہ اس کی کرامت غائب ہو جائے۔

اکثر لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ معجزہ کا لفظ تو قرآن میں آیا ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اگر یہ لفظ نہیں آیا تو اس سے معجزہ کے وجود پر کیا اثر۔ قرآن کوئی لُغت کی کتاب نہیں کہ اس میں معجزہ کا لفظ ہونا ضروری ہو۔ اگر قرآن میں کہیں دماغ کا لفظ نہیں آیا تو کیا دماغ کا وجود ہی تسلیم نہ کیا جائے گا۔ قرآن میں معجزہ کے لیے بیّنہ یا آیات کا لفظ آیا ہے۔ جیسے ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ یہاں آیات سے مُراد معجزات ہیں ایسے ہی وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (پ۱، بقرہ، آیت ۹۹) میں آیات سے مُراد معجزات ہیں۔

مُعجزہ اور حدیثِ قدسی قرآن اور حدیثِ قدسی دونوں کے الفاظ و معانی خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ قرآن سے تحدّی اور معارضہ کیا گیا ہے۔ حدیثِ قدسی سے نہیں۔ اس کے الفاظ معجزہ نہیں ہوتے۔ بعض کے نزدیک معانی و مفاہیم خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور الفاظ فرشتے کے ہوتے ہیں۔

حدیثِ قُدسی اور غیر قُدسی حدیثِ غیر قُدسی کے معانی تو خدا کی طرف سے ہوتے ہیں مگر الفاظ خود رسول کے ہوتے ہیں۔

۱۶- وراثتِ قرآن

قرآن خُدا کی آخری کتاب ہے جو قیامت تک چلنے والی ہے۔ پس سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد اس کا وارث کون ہے۔ یہ مادی وراثت نہیں جو ایک مجنون اور طفلِ غیر ممیز کو بھی مل جاتی ہے۔ یہ ایک قانونِ الٰہی ہے جو قیامت تک چلنے والا ہے۔ اس کا وارث ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کے سینہ میں اس کا پُورا پُورا علم ہو۔ ایک ایک دفعہ اس کی نظر کے سامنے ہو۔ تمام تاویلات و تفسیرات پر حاوی ہو۔ معصوم ہو تاکہ کوئی غلط بیانی نہ کرے۔ رسُول کا تعلیم کردہ ہو تاکہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اس معاملہ میں کتابِ خدا سے پُوچھیں۔ اس کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں کہ اس کا وارث کون ہے۔ پارہ ۲۲ سورہ فاطر رکوع ۴ کی یہ آیت پڑھیئے،

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (فاطر آیت ۳۲)۔ (پھر ہم نے کتاب کا وارث اُن لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا ہے اور وہ تین قسم کے ہیں کچھ تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں۔ کچھ میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں اور کچھ نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں)۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان تین صفتوں میں خدائی انتخاب میں کَنے اور وارثِ کتاب بننے کی اہلیت کس میں ہے؟

۱- ظالم لنفسہٖ: مشرک کے سوا ظالم لنفسہٖ انتخاب میں آسکتا ہے جیسے آدمؑ و یونسؑ انتخاب میں آگئے۔ لیکن مشرک نہ انتخاب میں آسکتا ہے نہ وارثِ کتاب بن سکتا ہے چاہے اُس نے شرک باللہ ایک ہی دن کیوں نہ کیا ہو۔

۲- میانہ رَو بھی وارثِ کتاب نہیں بن سکتا کیونکہ وہ نیکیوں میں کم ہے اور اس سے اُوپر درجہ والے یعنی سابق بالخیرات موجود ہیں۔

۳- جب یہ دو قسمیں خارج ہوگئیں تو لامحالہ سابق بالخیرات ہی وارثِ کتاب قرار پاتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے بہتر کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ نیکیوں میں سب سے بڑھ کر حصّہ لینے والے یہی ہیں۔ سب سے پہلے دعوتِ اسلام قبول کرنے والے یہی ہیں۔ سب سے زیادہ مشرکوں کو قتل کرنے والے یہی ہیں۔ غریب مسلمانوں کی سب سے زیادہ ہمدردی کرنے والے بھی یہی ہیں۔ رسولؐ کی جان بچانے میں ہر موقع پر سب سے آگے یہی ہیں۔ سب سے زیادہ عبادت کرنے والے یہی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ من عندہٗ علم الکتاب کے مصداق ہیں۔ رسولؐ نے علیؑ کے متعلق فرمایا ہے، علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔

کتابُ اللہ کا وارث

- وہی ہوسکتا ہے جو کسی مسئلہ کے جواب میں یہ نہ کہے کہ میں نہیں جانتا۔
- وہی ہوسکتا ہے جس نے قرآن کے سمجھنے میں کسی سے مدد نہ لی ہو۔
- وہی ہوسکتا ہے جو آیات کی تفسیر و تاویل صحیح صحیح جانتا ہو۔
- وہی ہوسکتا ہے جس نے حسبِ فرمودۂ رسولؐ تاویلِ کتاب پر اسی طرح جہاد کیا ہو جس طرح رسولؐ نے تنزیلِ کتاب پر کیا تھا۔
- وہی ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ کے ظاہر و باطن دونوں کو جانتا ہو۔
- وہی ہوسکتا ہے جس نے دعویٰ کیا ہو سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ۔
- وہی ہوسکتا ہے جس نے سورۂ فاتحہ کے متعلق کہا ہو کہ اگر میں چاہوں تو اس سورہ کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد دوں۔
- وہی ہوسکتا ہے جس نے قرآن کو موافق تنزیل جمع کیا ہو۔
- وہی ہوسکتا ہے جس کو رسولؐ نے حدیثِ ثقلین میں قرآن کے ساتھ کیا ہو۔
- وہی ہوسکتا ہے جو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ 16/89 کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتا ہو کہ جو کچھ قرآن میں ہے مجھے ان سب کا علم ہے۔

۱۷- قرآن و کتابُ

دُنیا کا ہر قانون جسے قانون ساز جماعت بناتی ہے بطور اورجنل original یعنی اصلی کاپی کے سرکاری المادی میں محفوظ رہتا ہے۔ اس کی نقلیں پبلک میں تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ کسی غلطی کی صورت میں اس کو اصلی کاپی سے ملا کر دیکھا جاتا ہے۔ قانونی بحثیں جو عدالتوں میں وکلاء صاحبان کے درمیان ہوتی ہیں اور کسی قانونی دفعہ کے مختلف مطالب بیان کیے جاتے ہیں اس وقت ناطق فیصلہ اُس جج کا مانا جاتا ہے جو حکومت کی طرف سے اس فیصلہ کا ذمّہ دار ہوتا ہے اگر ججوں کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوتا تو پھر مقدمہ پریوی کونسل میں جاتا ہے جو مجلسِ قانون ساز ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا ہے پھر اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان سے بہتر قانونی دفعات کا سمجھنے والا دوسرا نہیں ہوتا۔

قرآنِ مجید خدا کا بنایا ہوا ایک دوامی قانون ہے جس کے سب سے بہتر سمجھنے والے رسولؐ ہیں۔ یا وہ لوگ جن کو خود رسولؐ نے سمجھایا ہو۔ دوسروں کے فیصلے ان کے مقابل ناطق نہیں ہوسکتے۔ اس قانون کے دو نام ہیں، کتاب اللہ اور قرآن۔

کتاب اللہ کے معنی ہیں المکتوب بیداللہ (اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی)۔ یہ کتاب بقلمِ قدرت قلبِ رسولؐ پر لکھی گئی اور سینہ بسینہ حضرت علیؑ سے لے کر قائم آلِ محمدؐ تک چلتی رہی۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ عنکبوت ۲۹، آیت ۴۹ (بلکہ وہ روشن آیات ان سینوں میں ہیں جن کو خدا کی طرف سے علم دیا گیا ہے۔) یہی قرآن کی اصلی یا اورجنل کاپی ہے جس کو معصوم ہستیوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اگر کوئی اختلافی صورت ہو تو ان سے معلوم کیا جائے۔ اس کتاب اللہ کی حفاظت کا خدا نے وعدہ کیا اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

رہا قرآن تو یہ اس کتابُ اللہ کی مَقروء یعنی پڑھی ہوئی صورت ہے۔ پس جو قلبِ رسولؐ پر لکھا گیا وہ کتاب اللہ ہے اور جو حضورؐ نے پڑھ کر سنایا وہ قرآن کہلایا۔ کتاب سینہ بسینہ چلی اور قرآن زبان سے زبان پر چلا۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ (الواقعہ ۵۶ آیت ۷۷، ۷۸، ۷۹)

"بے شک قرآنِ کریم ایک چھپی ہوئی کتاب کے اندر ہے جس سے تعلق نہیں رکھتے مگر وہ لوگ جو (بمصداق آیتِ تطہیر) پاک و پاکیزہ ہیں۔"

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (یونس ۱۰، آیت ۳۷)

"یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے بنا لیا جائے۔ بلکہ وہ تصدیق ہے اس سچی کتاب کی جو اُن کے پاس ہے اور تمام جہان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔"

اس سے فرقِ قرآن و کتاب معلوم ہوگیا۔ مَس کے معنی چھونے کے بھی ہیں اور تعلق رکھنے کے بھی۔ جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص

کو علم سے مَس نہیں۔

اگر کتاب مکنون سے لوحِ محفوظ مُراد لی جائے تو پھر پاک لوگوں کے چھونے کا اس سے تعلق ہی نہیں ہو سکتا اور نہ تعلق رکھنے کا۔ کیونکہ وہاں تک نہ کسی بشر کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے نہ خیال بلکہ فرشتہ تک وہاں نہیں جا سکتا۔

۱۸- قرآن اور اہلبیتؑ

کوئی قانون کیسا ہی مبنی بر عدل و انصاف ہو جب تک اس کے نافذ کرنے والے منصف مزاج نہ ہوں، رعایا مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اور شکوہ و شکایات کا دروازہ کھلا ہی رہتا ہے۔

قرآن خدائی قانون ہے جو قیامت تک چلنے والا ہے۔ رسولؐ کے بعد اس کو سمجھانے والے اور جاری کرنے والے ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو خود غرضی کے اندیشوں سے پاک ہوں۔ خلافِ حکمِ خدا کوئی فیصلہ اپنی طرف سے صادر نہ کریں۔ توریت بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے آئی تھی لیکن اس کے احکام بتانے والے غیر ذمّہ دار نااہلوں نے اس میں وہ تصرفات کیے کہ پایۂ اعتبار سے گر گئی اور بجائے ہدایت کے بنی اسرائیل میں وہ ضلالت پھیلی کہ بار بار ان پر خدا کے عذاب نازل ہوئے۔ کتاب موجود تھی۔ مگر نافذ کرنے والے نااہل تھے۔ اپنی اغراض کے پیشِ نظر آیات کا مطلب توڑ موڑ کر جو چاہتے بیان کر دیتے تھے۔ ان کا رُخ خدا کی طرف نہیں تھا بلکہ بندوں کی طرف تھا وہ بجائے خدا کے بندوں کو خوش کرنا چاہتے تھے۔

حضرت رسولِ خداؐ یہ جانتے تھے کہ ان کے بعد ان کی اُمّت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ہر فرقہ اپنی حقّانیت کا ثبوت قرآن ہی سے پیش کرے گا۔ نیز یہ بھی جانتے تھے کہ آپؐ کے بعد فتنہ و فساد پھوٹ نکلیں گے۔ کنز الاعمال میں ہے کہ حضورؐ کی ۹۵۰ حدیثیں ایسی ہیں جن میں ان فتنوں کی خبر دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ فتنے تم پر اس طرح برسیں گے جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے اور باطل حق کو چھپانے کی کوشش کرے گا اور بدی نیکی پر غالب آئے گی۔

ان خوفناک حالات سے بچانے کے لیے حضورؐ کو کوئی مرکز و مرجع ایسا بتانا چاہیئے تھا جس کی طرف رجوع کر کے لوگ امرِ حق کا پتہ چلا سکیں اور ضلالت سے محفوظ رہیں اس کے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں :

۱- اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ - اَھْلَبَیْتِیْ اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَلَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ -

(لوگو! میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی عترت یعنی اہلبیتؑ جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک حوضِ کوثر پر میرے پاس نہ آ جائیں۔)

اس حدیث کے متعلق چند باتوں پر غور کیجئے :

الف۔ حضورؐ نے قرآن کے ساتھ اپنے اہلبیتؑ کو کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو اپنے اہلبیتؑ پر پورا اعتماد تھا کہ یہ کتابِ خدا کے خلاف ہرگز کوئی عمل نہ کریں گے۔

ب۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ قرآن صامت ہے وہ کسی غلط عمل پر ٹوک نہیں سکتا۔ لہٰذا ایک ناطق معصوم کو ساتھ کیا گیا کہ وہ غلط عمل کرنے والوں اور آیتوں کا غلط مطلب بیان کرنے والوں کو ٹوکتا رہے اور صحیح عمل بتاتا رہے۔

ج۔ یہ بھی بتا دیا کہ جو لوگ اہلبیتؑ سے تمسّک رکھیں گے وہ کبھی گمراہ نہ ہوں گے کیونکہ ان کے عمل میں غلطی نہ ہو گی۔

د۔ یہ بھی بتا دیا کہ دونوں سے تمسّک رکھنے میں نجات ہے۔ ایک کو کافی سمجھنے میں نجات نہیں۔

ھ۔ یہ بھی بتا دیا کہ یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے یعنی قرآن و اہلبیت ساتھ ساتھ چلیں گے۔ کوئی زمانہ ایسا نہ ہو گا کہ قرآن ہو اور میرے اہلبیتؑ نہ ہوں "تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ قرآن کا کوئی صحیح مفہوم بتانے والا موجود نہ تھا اس لیے ہم گمراہ ہوئے۔

۲- دوسری حدیث یہ ہے مَثَلُ اَھْلَبَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ وَھَوٰی۔ (میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے کہ جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جس نے رُوگردانی کی ڈوب گیا اور ہلاک ہو گیا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ اتباعِ اہلبیتؑ ہے۔

۳- عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ (علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ علیؑ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں جو عمل علیؑ کا ہے وہ قرآن کا حکم ہے اور جو قرآن کا حکم ہے وہی علیؑ کا عمل ہے۔

اس سے زیادہ حضورؐ اُمّت کو گمراہی سے بچانے کے لیے اور کیا سامان کر سکتے تھے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے دو بازو ہیں، علم اور عمل۔ اگر علم کو صحیح مرکز سے نہ لیا جائے گا تو وہ وبال بن جائے گا اور اگر عمل کو صحیح مرکز سے نہ لیا جائے گا تو وہ کھلی گمراہی ہو گا۔ قرآن ایسی کتاب نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ لے۔ اُسے ایسے لوگوں سے حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو خدا کے یہاں کے پڑھے ہوئے ہوں۔ اور رسولؐ کے تعلیم کردہ ہوں۔ یہی لوگ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کہلاتے ہیں۔ قرآن کے متعلق جو تفسیر و تاویل وہ بیان کریں وہی قابلِ عمل ہے ورنہ قدم قدم پر گمراہی کا اندیشہ ہے۔ اگر صرف قرآن ہدایت کے لیے کافی ہوتا تو اُمّت تہتّر فرقوں میں تقسیم نہ ہوتی اور تفسیر بالرائے کا سلسلہ نہ چلتا، جس نے کوئی آیت ایسی نہ چھوڑی جس میں علماء کا اختلاف نہ ہو۔ تفسیر کبیر وغیرہ میں اس اختلاف کی صورتیں ملاحظہ فرمالیجئے۔ متکلّم کے کلام کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے نہ کہ دس بیس۔

اگر صرف کتابِ خدا ہدایت کے لیے کافی ہوتی تو خدا یہ نہ فرماتا، قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتَابٌ مُّبِیْنٌ ۙ (تمہاری ہدایت کے لیے اللہ نے ایک کتاب بھیجی ہے اور روشن نُور یعنی رسولؐ)۔ کتاب کے ساتھ ساتھ نُور کو رکھنا اس کی دلیل ہے کہ ایک ہادی کافی نہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ہر زمانہ میں کتاب کے ساتھ ایک ناطق ہادی اور ہونا چاہیئے جو

نُورِ رسولؐ کا جُزو ہو۔ چنانچہ ایک ہادیٔ معصوم ہر زمانہ میں ساتھ رہا اور اب بھی ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ لوگ اس کی طرف رجُوع نہ کریں۔ خدا کی حُجت تو تمام ہوگئی۔

۱۹۔ قرآن کے اندر سب کچھ ہے

قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اُس کے اندر سب کچھ ہے جیسا کہ فرماتا ہے :

۱۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۔ (پ، الانعام آیت ۵۹) "ہر خشک و تر کا بیان اس کتاب کے اندر ہے"

۲۔ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۔ (پ۱۴، النحل، آیت ۸۹) "اس کتاب میں ہر شے کا بیان ہے"

۳۔ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ۔ (پ، الانعام آیت ۳۸) "اس کتاب میں ہم نے کوئی شے نہیں چھوڑی"

۴۔ وَتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۔ (الانعام ۶ آیت ۱۵۴) "ہر شے کا مفصّل بیان ہے"

۔ لیکن اس کتاب سے ہر شے کا اخذ کرنا ہر انسان کا کام نہیں۔ اس کے حقائق و دقائق صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو قرآن میں رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کہا گیا ہے۔ ایک دو مثال سے سمجھئے :

ایک روز امیر معاویہ نے امام حسن علیہ السلام سے کہا کیا قرآن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اس کے اندر ہر شے کا بیان ہے۔ فرمایا، بالکل صحیح ہے۔ اُس نے کہا، کیا میری اور آپؑ کی داڑھی کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا، کیوں نہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ معاویہ کی داڑھی چھدری تھی امام حسنؑ کی گھنی۔ امام علیہ السلام نے یہ آیت پڑھی۔ (پ، الاعراف، آیت ۵۸)

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ

(جو پاک زمینیں ہیں ان کا سبزہ خوب گھنا اُگتا ہے اور جو زمین بنجر ہے اس کی پیداوار بھی خراب ہوتی ہے۔ یعنی چھدری گھاس اُگتی ہے)۔

دوسرا واقعہ سنیئے : ایک گھر میں دو عورتیں بچہ جنیں۔ ایک نے لڑکا جنا دُوسری نے لڑکی۔ لڑکے والی جب سو رہی تھی، لڑکی والی نے چپکے سے اپنی لڑکی لڑکے والی کے پہلو میں لٹا دی۔ اور اس کا لڑکا اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ جب لڑکے والی نے اپنے پہلو میں لڑکی دیکھی تو جھگڑا شروع ہوا۔ آخر یہ قصہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ جب فیصلہ ان کی سمجھ میں نہ آیا تو حضرت علیؑ کے پاس دونوں کو لے کر آئے۔ آپؑ نے قنبر سے فرمایا، دو شیشیاں ہم وزن لاؤ اور ان میں دونوں کا دودھ بھر کر تولو۔ جس شیشی کا وزن زیادہ ہو وہ دُودھ لڑکے والی کا ہے۔ لڑکا اسی کا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یہ فیصلہ آپؑ نے کہاں سے کیا۔ فرمایا، قرآن سے۔ انہوں نے کہا، قرآن میں اس کا ذکر کہاں ہے۔ فرمایا، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۔ (مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوتا ہے)۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ اے ابوالحسنؑ، آپ آیت پڑھنے میں جلدی کرتے ہیں۔ ممکن ہے غلطی ہو جائے۔ فرمایا، اے عمر! تمہارے ہاتھ میں کتنی اُنگلیاں ہیں۔ اُنہوں نے ہنس کر کہا، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے پانچ ہیں۔ فرمایا تم نے جواب دینے میں جلدی کی۔ انہوں نے کہا، جب یہ میرے سامنے ہیں تو سوچ بچار کیسا۔ فرمایا، اے عمر! اسی طرح قرآن کے تمام حقائق میری نظر کے سامنے ہیں۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا ہے اِنَّ الْقُرْاٰنَ ظَاهِرُهٗ اَنِیْقٌ وَبَاطِنُهٗ عَمِیْقٌ ۔ (قرآن کا ظاہر بڑا اچھا ہے لیکن اس کا باطن بڑا گہرا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے نَحْنُ كُهُوْفُ كُتُبِهٖ ۔ ہم تمام آسمانی کتابوں کے پہاڑ ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا، اگر میں چاہوں تو صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اُونٹ لاد دوں۔

۲۰۔ قرآن اور اَخلاق

ہمارے رسولؐ کی غرضِ بعثت یہ تھی کہ وہ لوگوں کا تزکیۂ نفس کریں یعنی ان کے اَخلاق کو درست کریں اور جو بدعادتیں ان میں پائی جاتی ہیں ان کو ترک کرائیں۔ جس قوم کی طرف آپؐ مبعوث کیے گئے تھے وہ بداَخلاقیوں کی پوٹ تھی۔ کوئی بُرا کام ایسا نہ تھا جو اُن سے چھوٹا ہو۔ چوری، زناکاری، ڈکیتی، لُوٹ مار، قتل و غارت، بے حیائی، سفّاکی، دغا بازی، فریب، کینہ پروری۔ غرض سب گُن پُورے تھے۔ ایسی ناکارہ اور بدسرشت قوم کی اصلاح کے لیے حضورؐ کو بھیجا گیا۔ حضورؐ نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ ان کی دُشمنی کو دوستی سے بدلا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کو رذائل اخلاق سے نفرت دلائی۔ قرآن میں جن فضائلِ انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور جن بداخلاقیوں سے بچایا گیا ان کا ذکر موقع موقع سے کیا گیا ہے، جیسے :

۱۔ جن چیزوں سے بچایا گیا،

شراب نوشی۔ بُت سازی۔ بدشگونی۔ رشوت۔ جادو۔ ناچ۔ گانا بجانا۔ ناپ تول میں کمی۔ زنا۔ وعدہ خلافی۔ جھوٹی گواہی۔ شوہردار عورت پر تہمت۔ ڈکیتی و رہزنی۔ قتلِ مؤمن۔ قتلِ عمد۔ جہاد سے بھاگنا۔ قطعِ رحم۔ چوری۔ ظلم۔ لُوٹ مار۔ فتنہ و فساد۔ خدا کی نافرمانی۔ رسولؐ کی نافرمانی۔ غیبت۔ سرگوشی۔ بدکاری۔ لغو شعر گوئی۔ بدگمانی۔ بُری صحبت میں بیٹھنا۔ تفرقہ پردازی۔ تکبّر۔ غرور۔ لواطہ۔ گالی دینا وغیرہ۔

۲۔ جن کی طرف ہدایت کی گئی ہے،

امر بالمعروف نہی عن المنکر۔ معاملات میں راست بازی۔ قرض و رہن میں ایمانداری۔ گھوڑ دوڑ۔ تیر اندازی۔ وصیّت۔ نکاح۔ منگنی۔ متعہ۔ حرام عورتوں سے بچنا۔ نیک چلنی کی طرف رغبت۔ مہر۔ حقوقِ زوجیت۔ پردہ کا حکم۔ رضاعت۔ نان نفقہ۔ عہد و پیمان کی پابندی۔ جہاد۔ مظلوم کا بدلہ لینا۔ صلح جوئی۔ مشورہ کا حکم۔ آپس میں نہ لڑو۔ صبر۔ درگذر۔ نرمیٔ قلب۔ بُرائی کا جواب نیکی سے دینا۔ انکساری و فروتنی۔ شکر وغیرہ۔

انبیاءؑ کا اپنی اپنی اُمتوں سے بداخلاقی دُور کر کے ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بنانا اتنا مشکل کام تھا کہ تمام انبیائے سابقین سے مکمل نہ ہو سکا۔ اس کی تکمیل نبیٔ آخر الزماںؐ کے سپرد ہوئی اور کُل ۲۳ سال کا زمانہ اس کی تکمیل کے لیے دیا گیا۔ یہ حضورؐ ہی کا کام تھا کہ آپؐ نے اپنے مرنے سے پہلے اپنا فرض پُورا کر دکھایا اور خدا سے مہرِ تصدیق ثبت کرا لی۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ کی سند لے لی۔

۲۱- قرآن اور مکرّرات

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن میں ایک ایک بات کو کئی کئی بار بیان کیا گیا ہے ۔ کسی نبی کا قصہ ایک جگہ نہیں بلکہ جا بجا بکھرا ہوا ہے جیسے :

قصۂ آدمؑ ۱۰ جگہ ۔ شیطان کا قصہ ۷ جگہ ۔ ادریسؑ ۲ جگہ ۔ نوحؑ ۲۰ جگہ ۔ ہود و عاد ۱۲ جگہ ۔ صالح و ثمود ۷ جگہ ۔ ابراہیمؑ ۳۰ جگہ ۔ اسمٰعیلؑ ۷ جگہ ۔ اسحٰقؑ ۸ جگہ ۔ یعقوبؑ ۷ جگہ ۔ یوسفؑ ۲ جگہ ۔ ایوبؑ ۳ جگہ ۔ شعیبؑ ۵ جگہ ۔ موسٰیؑ ۱۲ جگہ ۔ حزقیل ۳ جگہ ۔ ہارون ۳ جگہ ۔ آسیہ ۲ جگہ ۔ الیسع ۲ جگہ ۔ ذوالکفل ۲ جگہ ۔ طالوت و جالوت ۲ جگہ ۔ عزیر ۲ جگہ ۔ داؤدؑ ۱۰ جگہ ۔ سلیمانؑ ۷ جگہ ۔ بلقیس ۲ جگہ ۔ یونسؑ ۷ جگہ ۔ زکریاؑ ۴ جگہ ۔ یحیٰیؑ ۵ جگہ ۔ مریمؑ ۱۰ جگہ ۔ عیسٰیؑ ۱۹ جگہ ۔ یاجوج و ماجوج ۲ جگہ ۔ اصحابِ رس ۲ جگہ ۔ اس شمار سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کا قصہ بار بار بیان کیا گیا ہے ۔ اسی طرح احکام کا تکرار ہے ۔ آیات کا تکرار ہے ۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟ کوئی چیز مسلسل بیان ہوتی ہے تو اس میں لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے ۔ یہ بکھرے ہوئے قصے ایک جگہ بھی بیان ہو سکتے تھے ۔

جواب یہ ہے کہ قرآن بصورت کتاب ایک ہی بار نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا بلحاظ ضرورت نازل ہوتا رہا ہے ۔ یہود و نصارٰی ۔ انبیاء کے قصوں کے متعلق بار بار سوال کرتے تھے ۔ کبھی کوئی گروہ آتا تھا کبھی کوئی گروہ ۔ لہٰذا جیسا ان کا سوال ہوتا تھا اُسی کے مطابق جواب دیا جاتا تھا ۔ اس لیے انبیاء کے قصے بار بار بیان ہوئے ۔

عہدِ رسالتؐ میں اور اس سے قبل وجودِ باری تعالیٰ کے منکر بہت زیادہ تھے ۔ جو ملحدین و زنادقہ کہلاتے تھے ۔ لہٰذا اس امر کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ خدا موجود ہے بار بار ذکر کرنا پڑا ہے ۔ اسی لیے اس ذکر کے لیے ۹۵ آیاتِ قرآنِ مجید میں مختلف جگہوں پہ پائی جاتی ہیں ۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو وجودِ باری کو تو تسلیم کرتے تھے لیکن اس کی توحید کے قائل نہ تھے بلکہ دوسروں کو اس کا شریک مانتے تھے لہٰذا ضرورت تھی کہ اس کی توحید پہ بار بار زور دیا جائے ۔ چنانچہ قرآن میں یہ مضمون ۴۵ جگہ آیا ہے ۔ سورۂ نمل میں بار بار یہ سوال کیا گیا ہے ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے) ردِّ شرک چونکہ بہت ہی اہم امر تھا لہٰذا ۱۲۱ جگہ اس کا ذکر کیا گیا ۔ جو لوگ خدا کی نعمتوں کو بھول گئے تھے ان کو یاد دہانی ۴۷ جگہ کرائی گئی ۔ سورۂ رحمٰن میں بار بار اس آیت کو دُہرایا گیا ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰن ۔ تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے ۔

جو لوگ قیامت کے منکر تھے اُن کو آگاہ کرنے کے لیے ۱۰۶ جگہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ بار بار ذکر سے ان کے دل میں خوف پیدا ہو اور وہ ایمان لے آئیں ۔ بس اسی طرح اور مضامین کو سمجھیے ۔

دوزخ سے ڈرانے کا ذکر ۶۱ جگہ اور بہشت کی رغبت دلانے کا ذکر ۵۹ جگہ ہوا ۔ اسلام میں چونکہ اہلِ ایمان کا درجہ سب سے بلند ہے لہٰذا ۷۰ جگہ ان کا ذکر کیا گیا اور ان کا اجر بیان کیا گیا ۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے کہ مسلسل بیان ہو ۔ وہاں تو مقصود لوگوں کو

ہدایت کرنا ہے ۔ لہٰذا قولی صورت میں فعلی صورت میں ، مثالی صورت میں قدرت نے جہاں جیسا موقع پایا ہے کسی بات کو ذکر کرنے میں تامّل نہیں کیا ۔ قوموں کے عبرتناک قصے کئی جگہ اس لیے بیان کیے گئے کہ لوگوں کے ذہن نشین یہ بات ہو جائے ، کہ نافرمانوں کو کیسی عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں ۔ پس قرآن میں وہ چیزیں تلاش کیجئے جو دین و دُنیا میں انسان کی بھلائی کا باعث ہوں یہ نہ تلاش کیجئے کہ کون ذکر کتنی بار ہوا ہے ۔

۲۲ - قرآن اور عواملِ کائنات

مشہور تو یہی ہے کہ خدا نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کیے ہیں اور ان کا ہر ہر جزو نظامِ حیاتِ انسانی کے برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ عمل کر رہا ہے ۔ کس کی طاقت ہے کہ ان کے سربستہ رازوں کو معلوم کر سکے ۔ جزوی طور پر جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ ایسا ہے جیسے آٹے میں نمک یا آنکھ میں سُرمہ ۔ بلکہ اتنا بھی نہیں ۔ یہ زمین اور اس کی مخلوقات اور ان سب سے زیادہ جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے ان سب کا مرکزِ توجہ ہے ۔ خداوندِ عالم قرآن میں جا بجا ان کے نام اور کام بتاتا چلا جاتا ہے ۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے بے شمار احسانات پر نظر رکھ کر تم اس کے فرمانبردار بندے بنے رہو ۔ اور اس سے سرکشی نہ کرو ۔ اور اس کا شریک کسی کو نہ بناؤ ۔ اور اپنے دین اور دُنیوی زندگی کو سنوارنے کی کوشش میں لگے رہو اور خدا کے انبیاء و مرسلین نے جو ہدایت کی ہے اُس پر عمل کرو ۔

قرآن کا یہ دعوٰی ہے کہ اس کے اندر سب کچھ ہے ۔ اس کا مجملاً ذکر انسانی آگاہی کے لیے موقع و محل کے لحاظ سے کر دیا گیا ہے تاکہ تم ان چیزوں پر غور کیا کرو ۔

ہم کائنات کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ اوّل مخلوقِ سماوی محسوس و غیر محسوس ۔ دُوسرے مخلوقاتِ ارضی محسوس و غیر محسوس ۔ انہی دونوں میں وہ تمام عوامل موجود ہیں جو انسان کی زندگی اور موت کا سبب بنے ہوئے ہیں ۔

۱- مخلوقاتِ سماوی غیر محسوس

ملائکہ : جن کا ذکر قرآن میں ۷۳ جگہ آیا ہے ۔ یہ خدا کی ایک نُورانی مخلوق ہے ۔ باذنِ الٰہی ان کو نظامِ عالم میں بڑا دخل ہے ۔ یہ مُدبّراتِ امر کہلاتے ہیں یعنی ان کے ذریعہ سے وہ تمام کام انجام پاتے ہیں جو از قسم حوادثِ ارضی و سماوی ہیں ۔ جو رزق رسانیِ انسان کا وسیلہ ہیں ۔ یہ ہماری آنکھوں سے اپنے اصلی وجود میں نظر نہیں آتے ۔ ہاں جب بشکلِ انسانی زمین پر آتے ہیں تو ہماری آنکھیں ان کو دیکھ لیتی ہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ کے پاس بصورتِ مہمان آئے اور جنابِ اسحاقؑ کی پیدائش کی خبر دی یا جناب لوطؑ کے پاس آئے اور ان کی قوم پر عذاب آنے کا حال بیان کیا یا جناب مریمؑ کے پاس حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کی خبر دی یا جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ کے پاس بصورتِ دحیہ کلبی آئے ۔ یہی وہ ہیں جو غیر محسوس صورت میں انسان کے بدن سے جان نکالتے ہیں ۔ یہی وہ ہیں جو ہر انسان کے داہنے بائیں رہ کر اس کا ایک ایک عمل لکھتے رہتے ہیں ۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت میں گزرتا ہے ۔ یہ عبادتِ خدا

سے کبھی تھکتے نہیں۔ ایک ایک رکنِ عبادت ان کو دیا گیا ہے جو قیام میں ہیں وہ قیامت تک قیام ہی میں رہیں گے۔ جو رکوع میں ہیں وہ قیامت تک اسی حالت میں رہیں گے۔ جو سجدہ میں ہیں وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ ان کی تعداد سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ سب باتیں قرآن میں مذکور ہیں۔

۲۔ **حُور:** یہ بھی خدا کی مخلوق ہے یہ بے پناہ حُسن کی مالک ہے۔ خدا کے جو نیک بندے جنت میں جائیں گے یہ ان کی دلبستگی کا سامان ہوں گی۔ ان کے حُسن و جمال کی تعریفیں قرآن میں مذکور ہیں۔ سورۂ رحمٰن پ۲۷ وغیرہ میں ان کی خصوصیات کا ذکر پڑھیئے۔

۳۔ **غلمان:** یہ نہایت خوبصورت لڑکے جنت میں لوگوں کی خدمت کے لیے ہوں گے۔ شرابِ طہورا کے پیالے پلائیں گے اور کوثر و تسنیم کے خالی جام بھر کر جنتیوں کو پیش کریں گے۔ سورۂ واقعہ میں ان کا حال پڑھیئے۔

۴۔ **جنّت:** پ۲۷ سورۂ واقعہ وغیرہ میں اس کا روح پرور حال پڑھیئے۔ ہرے بھرے درخت میووں سے لدے زمین پر سایہ کیے ہوں گے۔ سُہانا وقت ہوگا۔ نہریں بہتی ہوں گی۔ تخت بچھے ہوں گے۔ گاؤ تکیے لگے ہوں گے۔ آمنے سامنے بیٹھے لوگ باتیں کرتے ہوں گے۔ حُوریں اور غلمان خدمت کو حاضر ہوں گے۔

۵۔ **دوزخ:** اس کے عذاب سے خدا پناہ میں رکھے۔ آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ دوزخیوں کی جلدیں گل گل کر گر رہی ہوں گی۔ خار دار تھوہر کے درخت کا زہریلا کھانا ملے گا اور زخموں کی پیپ ملا کھولتا ہوا پانی پیتے ہوں گے۔ موت نہ ہوگی نہ عذاب سے چھٹکارا۔ یہ دائمی عذاب ہوگا۔

۶۔ **اعراف:** سورۂ اعراف ع ۵ میں اس کا حال پڑھیے۔ یہ مقام جنت اور دوزخ کے درمیان ہوگا۔

۷۔ **پُل صراط:** پارہ ۱۴ سورۂ والصّٰفّٰت ع ۲ میں اس کا حال پڑھیے۔

۸۔ **حوضِ کوثر:** پارہ ۳۰ سورۂ کوثر میں اس کا ذکر ہے۔

۹۔ **سلسبیل:** یہ بھی جنت کا ایک چشمہ ہے۔ سورۂ دہر میں اس کا ذکر ہے۔

۱۰۔ **صُور:** سورۂ الحاقہ پ۲۹ میں اس کا حال پڑھیے۔

۱۱۔ **تسنیم:** پ۳۰ سورۂ التطفیف میں اس کا ذکر ہے۔

۱۲۔ **عرش:** سورۂ اعراف پ۸ ع ۷۔

۱۳۔ **کُرسی:** پ۳ البقر ع ۳۴۔

۱۴۔ **سدرۃ المنتہٰی:** النجم پارہ ۲۸۔

۱۵۔ **قابَ قوسین:** النجم پارہ ۲۸۔

۱۶۔ **برزخ:** جہاں مرنے کے بعد قیامت تک رہنا ہوگا۔

۱۷۔ **عرصۂ محشر:** جہاں روزِ قیامت تمام مخلوق جمع ہوگی۔

مذکورہ بالا چیزیں عوالم الملکوت سے تعلق رکھتی ہیں جو ہمارے لیے غیر محسوس ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں غور و فکر و تدبر و تفکر کی دعوت نہیں دی گئی۔ بلکہ جو کچھ رسولؐ نے بتایا ہے اس پر ایمان لانا ہم پر واجب ہے۔ چون و چرا کی گنجائش نہیں

عقلِ انسانی چونکہ ان کے اسرارِ خلقت سمجھنے سے قاصر ہے لہٰذا صرف تسلیم کرنے کی ہدایت ہے۔ مرنے کے بعد یہ چیزیں نظر آئیں گی۔

مخلوقاتِ سماوی محسُوس

مخلوقاتِ سماوی محسُوس میں اجرامِ سماوی خدا کی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ معرفت حاصل کی جائے۔ خدا نے جو اسرار ان میں ودیعت فرمائے ہیں ان کی جستجو میں لگا رہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ نظامِ حیاتِ انسانی میں ان کو کہاں تک دخل ہے۔

۱۔ **آسمان:** سورۂ الغاشیہ پ۳۰ میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ انسان اس پر غور کرے کہ قدرت نے کس طرح بغیر کسی ستون کے اس کو بُلند کیا ہے۔ یہ کوئی ٹھوس چیز نہیں بلکہ جو چیز ہمیں نظر آ رہی ہے وہ ایک رقیق مادہ (ایتھر) ہے جو فضا میں بھرا ہوا ہے۔ انسان یہ غور کرے کیا اس کا بنانا زیادہ مشکل تھا یا آسمانوں کا بنانا۔ (پ۳۰)

۲۔ **آفتاب:** سورۂ والشمس پ۳۰۔ اس کو حیاتِ انسانی کے بنانے بگاڑنے میں بڑا دخل ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو رُوئے زمین کی تمام مخلُوق مر کر رہ جائے۔ دن میں روشنی اس کے وجود سے ہے۔ یہ خدا کی مخلوق ہے خدا نہیں۔ کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو اسے خدا سمجھ کر پُوجتے ہیں۔ سورۂ انعام ع ۸ میں حضرت ابراہیمؑ کا وہ استدلال پڑھیئے، جو ستارہ پرستوں کے ابطال میں ہے۔

۳۔ **چاند:** یہ بھی خدا کی بڑی نشانیوں میں سے ہے۔ رات کو روشن کرنے والا بھی ہے۔ نظامِ حیاتِ انسانی کی فنا و بقا میں اس کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی تمام ادلتی بدلتی حالتیں قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہر روز اس کی کرنیں ایک علیحدہ اثر رکھتی ہیں جن سے مخلوقِ ارضی متاثر ہوتی ہے۔

۴۔ **سیّارے:** ان کی چالیں بُرجوں میں داخلہ کے لحاظ سے مختلف اثرات اپنی کرنوں میں پیدا کرتی ہیں۔ جواہرات میں چمک انہی کی کرنیں پیدا کرتی ہیں۔ انسانی جسم کے خلیے کھولنے اور بند کرنے میں ان کی شعاعوں کو بڑا دخل ہے۔

۵۔ **کواکب:** ان کی تعداد کوئی بتا نہیں سکتا۔ ان میں بعض زمین سے اتنی دُور ہیں کہ تین سو برس بعد اس کی کرن زمین کی سطح کو مَس کرتی ہے۔ یہ سب کُرّے ہیں جن پر خدا کی کسی قسم کی مخلوق آباد ہے۔

۶۔ **بادل:** انسانی زندگی کا بڑا سامان اپنے اندر لیے ہُوئے ہے۔ اس کی بارش سے مُردہ زمین میں جان آجاتی ہے اور نباتات اُگتی ہے۔

۷۔ **رعد یا گرج:** یہ بجلی کو چمکاتی ہے اور بجلی کی چمک بادلوں کی رفتار میں تیزی پیدا کرتی ہے۔

۸۔ **ہَوا:** انسانی زندگی کے لیے کیسی ضروری چیز ہے دَم بھر کو رُک جائے تو آدمی کا دم نکل جائے۔ نباتات میں اسی کے دَم سے تازگی ہے۔ حیوانات اسی سے زندہ ہیں۔

الغرض ان تمام چیزوں کا ذکر قرآن میں کئی جہت سے کیا گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو اپنا معبُود نہ بناؤ۔ یہ خدا کی مخلوق ہیں۔ یہ سب حادث ہیں۔ ان میں کوئی معبُود بننے کا مستحق نہیں۔ آفتاب پرست،

ستارہ پرست، راجہ اندر کے پجاری سب گمراہ تھے۔ دوسرے ان کے ذکر سے غرض ہے کہ ان چیزوں کو اپنی حیات کا ممد سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ تیسرے ان کی تحقیقات کرکے اپنے علم کو بڑھاؤ اور ان کے ذریعہ نئی سے نئی ایجادیں کر کے بازار دُنیا کو سجاؤ۔

۲۔ مخلوقاتِ ارضی

مخلوقاتِ ارضی میں کون سی چیز ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں۔ پہاڑ، دریا، دریا کے ذخیرے، سونا، چاندی، کوئلہ، گیس وغیرہ زمین کے پوشیدہ ذخائر ہیں۔ موتی، مونگے، مشک، نباتات اُن کے اقسام جڑی بوٹیوں سے لے کر بڑے بڑے درختوں تک، حیوانات میں چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور شیر تک۔ ان کے اقسام ان کی خصوصیات انسان اور اس کا نظامِ بدن۔ بچّہ سے بوڑھے تک۔ زن و مرد غرض ان چیزوں کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے۔ ہر اس چیز سے جو انسانی زندگی کے لیے کار آمد ہے قرآن نے رُوشناس کرا دیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ ان چیزوں سے کیسے فائدہ حاصل کرے اور کہاں سے کرے اور کیسے کرے۔ طوالت کے خوف سے صرف چند چیزوں کا اجمالی ذکر کرتے ہیں:

۱۔ زمین : (سورۂ بقرہ، ع ۲۲) زمین کے فرش بچھانے کا ذکر ہے۔ (سورۂ النساء آیت ۱۰۰) میں آسمان و زمین میں جو چیزیں ہیں ان پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دیکھو یہ کیسا عجیب و غریب فرش ہے، نہ زیادہ سرد نہ زیادہ گرم نہ زیادہ سخت نہ زیادہ نرم۔ اس کے قدم قدم پر انسانی ضرورت کا سامان موجود ہے۔ پانی ہے ہوا ہے دھوپ ہے رات ہے دن ہے۔ پھل پھلاری ہے۔ جانوروں کے لیے گھاس ہے۔ سایہ کے لیے درخت ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی پر چشمے ہیں۔ رُوئی کے کپڑے پہنو تو اس کا سامان، اُون کے پہنو تو اس کا سامان۔ طرح طرح کے غلّے لہرا رہے ہیں۔ کھیتوں میں بہار آ رہی ہے مکانات بنانے کا سامان موجود۔ اس کو سجانے کا سامان مہیّا۔ غرض انسان کو قدرت نے ایک بہت بڑے ذخیرے کے اندر بٹھا دیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی ہے کہ مالِ غیر کی طرف ہاتھ نہ بڑھاؤ لقمۂ حرام سے پرہیز کرو۔ اللہ کی زمین پر فتنہ و فساد نہ بپا کرو۔ محنت سے کما کر کھاؤ۔ چوری نہ کرو۔ ڈاکے نہ ڈالو۔ بدکاریوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ ورنہ یہ زمین تمہارے لیے جہنّم بن جائے گی۔ تم اسی سے پیدا ہوئے ہو اسی میں چلے جاؤ گے۔ چند دن کی زندگی گزارنے کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔ تم یہاں ایسے ہو جیسے مسافر سرائے میں، ہمیشہ یہاں رہنے کا بندوبست نہ کرنا۔

۲۔ پہاڑ : (سورۂ ص پ ۲۳ ع ۲) میں۔ ہم نے پہاڑوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ ان کی چوٹیوں پر چڑھو۔ ان کے غاروں میں گھسو، ان کی وادیوں میں ٹہلو۔ وہ تم سے کچھ نہ کہیں گے۔ نیک ہو گے تو ان کے پتھر تمہارے قدم لیں گے۔ تمہارے لیے پانی کے چشمے نکالیں گے۔ تمہارے ہاتھ میں تسبیح پڑھیں گے۔ تمہاری بات کا جواب دیں گے۔ یہ ہے ہمارا احسان تم پر، آتش فشاں پہاڑ تمہارے لیے زمین کے اندر سے ذخیرے نکالتے ہیں۔ ان ہی پہاڑوں سے تمہاری زمین پر دریا بہتے ہیں۔ انہی کے اندر سے جواہرات نکلتے ہیں، دھاتیں نکلتی ہیں۔

۳۔ سمندروں اور دریاؤں کو دیکھو۔ ان کی تموّج خیز موجوں میں تمہاری کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ ان کے بچانے والے ہم ہی ہیں ورنہ تم ڈوب کر رہ جاؤ۔ سمندروں میں غوطے لگا کر تم طرح طرح کی قیمتی چیزیں نکال کر لاتے ہو۔ وہاں کے جانور تمہاری غذا کا سامان بھی ہیں۔

۴۔ آندھی : اس کا ذکر بھی قرآن میں ہے جب آندھیاں چلتی ہیں تو زہریلے مادوں کو بستیوں سے اُڑا کر لے جاتی ہیں۔ خرمنوں سے غلّہ کے دانے اپنے دامنوں میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ تاکہ ریگستانوں اور کھلے میدانوں میں جاکر بکھیر دیں۔ جن سے پرندوں کو غذا ملے اور مختلف قسم کی نباتات اُگے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو دانہ کون پہنچاتا۔ سبزہ کیسے اُگتا۔ وحشی چرند کہاں سے کھاتے۔

۵۔ زلزلہ : (پ ۳۰، الزلزال)۔ یہ بھی آیاتِ الٰہیہ میں سے ہے جب زمین کے اندر گیس زیادہ یورش کرتی ہے تو قدرت زمین کو شق کر کے انہیں نکال دیتی ہے۔ انہی کے رشش کرنے سے زلزلے آتے ہیں۔

۶۔ نباتات : (الانعام پ ۸ ع ۴)۔ خدا نے اپنی قدرت سے کیسی کیسی نباتات اُگائی ہے۔ بعض کے دانے کھائے جاتے ہیں بعض کے پھل پھول بعض کی چھال بعض کے پتے۔ کچھ چیزیں غذا کے لیے ہیں کچھ دوا کے لیے۔ کچھ سایہ کے لیے۔ کچھ لکڑی کے لیے۔ غرض ایک پتہ بیکار نہیں۔ پھل ہیں تو کیسے لذیذ خوش ذائقہ۔ زبان ان کی مٹھاس میں تمیز کرتی ہے مگر الفاظ میں ان کی شیرینی کا فرق ادا نہیں کر سکتی۔ زمین پر پھیل جانے والی گھاس کو دیکھئے پتلے پتلے لمبے بدن اور ان کے پھل سیروں وزنی۔ تربوز۔ خربوزہ۔ سردہ۔ پیٹھا۔ اُونچے اُونچے درختوں کو دیکھو پھل چھوٹے چھوٹے۔ جیسے برگد کا درخت اور اس کا پھل۔ اس نباتات سے ہماری زندگی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم مر جاتے۔

۷۔ حیوانات : (پ ۲۳۔ یٰس ع ۵)۔ چوپاؤں میں دیکھو شیر، ہاتھی۔ گینڈا۔ چھوٹے جانوروں میں دیکھو، چیونٹی۔ جُوں وہ جراثیم جو انسانی خون میں دَوڑتے دَوڑتے پھرتے ہیں۔ اُونٹ کو دیکھو کس صنعت سے بنایا گیا ہے خود فرماتا ہے، اونٹ کو دیکھو اس کی خلقت کیسی عجیب ہے۔ خوبصورت چرندوں کو دیکھو ہرن۔ پاڑہ۔ بارہ سنگھا۔ گائے پرندوں میں بُلبُل۔ طوطا۔ مینا، غرض ہر جانور جو سینکڑوں قسم کا ہوتا ہے انسان کی تسخیر میں دے دیا ہے۔ وہ ان پر سواری کرتا ہے باربرداری کا کام لیتا ہے۔ ان کا دودھ پیتا ہے۔ ان کا گوشت کھاتا ہے۔ سرکسوں میں ان کے تماشے دکھاتا ہے ان کی ایک ایک چیز دُودھ۔ کھال۔ بال۔ ہڈی۔ ناخن۔ خون سب اس کے کام میں آتے ہیں کوئی چیز بیکار نہیں۔ بَرّی جانوروں کے علاوہ بحری جانور بھی اس کے قبضہ میں ہیں۔ مچھلیاں۔ مگرمچھ۔ دریائی گھوڑے۔ سب کی گردنیں اس کے پنجہ میں دبی ہوئی ہیں۔

غرض انسان قدرت کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کرے گا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جمادات ہوں یا نباتات یا حیوان بَرّی ہوں کہ بحری ہوں یا ہوائی سب اس کے بدن کا جزو بن جاتے ہیں کیسی عجیب مخلوق ہے انسان، سب سے الگ بھی ہے اور سب اس میں سموئے ہوئے بھی ہیں۔ غور کیا آپ نے ان سب چیزوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہارا معبود وہ ہے جو ان سب چیزوں کا خالق ہے۔ پس اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو۔ مگر انسان بھی کیسا خر دماغ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر کونسی مخلوق ہے جس کو اس نے اپنا معبود نہیں بنایا۔ پتھر اس کے معبود۔ درخت اس کے معبود۔ حیوان اس کے معبود۔ انسان اس کے معبود۔ آفتاب اور ستارے اس کے معبود۔ انتہا یہ ہے کہ شیطان اس کا معبود۔ قرآن نے بار بار اس طرف توجہ دلائی ہے۔

۲۳- اِنسان اور قرآن

اس میں شک نہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ خدا نے اس کو بڑی عزت بخشی ہے اور اپنی کثیر مخلوق پر اس کو فضیلت دی۔ سب سے زیادہ عقل اسی کو عطا فرمائی ہے۔ ساری کائنات کا خلاصہ ہے۔ چمنستانِ تکوین کا گلِ سرسبد ہے مگر سب سے زیادہ بے عقل و بے ہوش بھی ہے۔ اونچی اُڑان اُڑے تو فرشتوں کی منازلِ قربت سے اوپر نظر آئے۔ نیچے گرے تو چوپاؤں کی ٹھوکروں میں پڑا دکھائی دے بلکہ اس سے بھی ذلیل تر۔ یہ انقلابِ حالت کیوں ہے؟ اپنی حقیقت کو نہ سمجھنے اور اپنی شعوری قوتوں سے کام نہ لینے سے۔ اپنی اشرفیت کا ثبوت دینے کے لیے اس کے اندر ہر قسم کا سامان موجود تھا مگر جو عقل کا چراغ گل کر کے بیٹھ گیا ہو اُسے کیا نظر آتا۔ ابلیس اپنے شکار کی جستجو میں ہر طرف جال بچھاتا رہتا ہے جن کی گردنیں پھنس گئیں وہ انسانی دائرہ سے نکل کر کوسوں دُور جا پڑے۔ ہاں جس نے فریب کار شکاری کو پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا، خدا کی رحمت نے اس کو اشرفیت کی مسند پر لا بٹھایا۔

آغازِ آفرینش سے ان ہی دو گروہوں میں ٹکر رہی ہے۔ خدا والے چاہے کتنے ہی کم ہوتے تھے مگر شیطان والوں کے مقابل بول بولا ان کا ہی رہا۔ غالب وہی رہے۔

جب قومِ عاد پر سرکشی کا بھوت سوار ہوا تو اکیلے ہودؑ خم ٹھونک کر ان کے مقابل آ گئے۔ کہاں ہزاروں کہاں ایک تنِ تنہا۔ خدا کے منکروں نے جی بھر کے ستایا مگر ہودؑ کے پہاڑ سے زیادہ مضبوط ارادہ میں بال برابر جنبش نہ ہوئی بشریت کی یہ بھی ایک اونچی منزل تھی۔ جب حضرت ہودؑ کا سمجھانا کسی طرح کارگر نہ ہوا تو سب کے سب عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں آگئے۔

اسی طرح یہ مقابلے بڑے زور و شور کے ساتھ بار بار ہوتے رہے۔ خدا کی فوج کے علمبردار اور نافرمان قوموں کے سردار بدلتے رہے۔ سرکشوں نے اپنی ستم آرائی کی رگ رگ سے پسینہ بہا کر دیکھ لیا مگر خدا والوں کے ماتھے پر شکن تک نہ پڑی —— معرکہ آرائیاں ہوئیں اور بڑے زور شور سے ہوئیں۔ مگر خدائی طاقتوں کے سامنے ابلیس کا زور کیا چلتا۔ عذاب کے شعلوں کی لپیٹ سے کون کھیلتا۔ بستیاں تلپٹ ہوتی گئیں۔ مرنے والوں کی لاشیں تو کیا ملتیں، ان کی قوم کا نشان تک ڈھونڈا نہ ملا۔ یہ تھیں ایمان و کفر کی عبرتناک ٹکریں جو غرور و نخوت کے مدہوشوں کو ہوش میں لانے کے لیے وجود میں آتی تھیں۔

زمانہ کروٹیں بدلتے بدلتے حضرت موسیٰؑ تک آ گیا۔ یہاں حماقتِ انسانی نے ایک نیا رُوپ دھارا۔ یعنی ایک خدا کا نافرمان بندہ (فرعون) خدا بن بیٹھا۔ یہ عقلِ انسانی کی انتہائی پستی کا دَور تھا۔ اس کی سرکوبی کے لیے خدا نے حضرت موسیٰؑ کو بھیجا دو معجزے اپنے ساتھ لائے۔ کھلے میدان میں جادوگروں سے مقابلہ ہوا۔ فرعون کی دماغی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں کہ سابقہ واقعات سے سبق نہ لیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو انبیاء سے مقابلہ کا ہوا کرتا ہے۔ فرعون مع اپنی خدائی کے غرق ہو کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی خدائی ماننے والے بھی سب ڈوب گئے۔ خس کم جہاں پاک۔

اب ایک نیا دَورِ ہدایت شروع ہوا۔ خدا کے احکام بصورت توریت حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے۔ جہالت میں

جکڑی قوم ہیر پھیر کرنے لگی کہ اتنی موٹی کتاب کے احکام پر کیسے عمل ہوگا۔ بات بننے کی بجائے بگڑنی شروع ہو گئی۔ سرکشوں کی رگیں جو موسیٰؑ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سُوکھنے لگی تھیں بت پرستی کا خون بھر لائیں۔ جن کو خدا کا پرستار بننا چاہیئے تھا وہ بچھڑے کے پجاری بن گئے۔ انسانیت کی یہ پستی بھی دیدنی تھی۔ موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل تھی۔ انتہائی سرکش، نافرمان، ہٹی اور ضدی جہالت سے پیچھے نہیں بلکہ عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتی تھی۔ یہ بھی انسانیت کا ایک شرمناک دَور تھا۔ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی پر دھکے بھی بہت کھائے۔ بند رہنے، وادیٔ تیہ میں چالیس برس مارے مارے پھرے مگر پھر بھی رہے رام داس ہی۔ پھر بھی غنیمت کہ کانوں سے جہاں پتھر نکلے وہاں کچھ جواہرات بھی برآمد ہوئے۔ ایمان و کفر کی جھڑپیں عہدِ موسیٰؑ میں ہوئیں اور بڑے زور سے ہوئیں۔ ایک طرف انسانیت سر پیٹ رہی تھی دوسری طرف جہالت تالیاں بجاتی تھی۔ موسیٰؑ توریت کے احکام سُناتے تو شور مچ جاتا فلاں بات پر عمل کریں گے فلاں پر نہیں۔ وہ جہاد کے لیے ساتھ لے جاتے تو عین ٹکر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے کہ ایسے جبّاروں سے ہم نہیں لڑ سکتے۔ تم اور تمہارا رب جا کر لڑے ہم تو یہیں براجمان ہیں۔

زمانہ کی جھولی عمرو عیار کی زنبیل ہے جس میں رنگ برنگ کے شعبدے بھرے رہتے ہیں۔ موسیٰؑ مر گئے تو قوم نے خوشیاں منائیں جان بچی لاکھوں پائے۔ اب توریت بنی اسرائیل کے ہاتھ لگی۔ روک ٹوک ختم۔ دیکھ بھال رخصت۔ سارے احکام مُٹھی میں تھے۔ اب کیا تھا مزے آ گئے۔ کوڑیوں کے مُول آیتیں بکنی شروع ہو گئیں۔ جو آیت چاہی بدل دی جو لفظ جہاں سے چاہا ہٹا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا وہ توریت، توریت ہی نہ رہی۔

جب زیادہ گڑبڑ مچی تو اصلاح کے لیے عیسیٰؑ بن مریمؑ تشریف لائے۔ انجیل ان کے ساتھ آئی۔ کتاب بدل گئی مگر قوم وہی رہی۔ کثیر جماعت نے ان کو رسول ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ جو کچھ لوگ انجیل کے محافظ بنے ان کے ہاتھوں انجیل پر وہی گزری جو اس سے پہلے توریت پر گزر چکی تھی۔ ایک کی چار انجیلیں بن گئیں۔

جب یہی تماشہ صدیوں ہوتا رہا، انبیاءؑ قتل کیے جاتے رہے خدا کی کتابوں میں تحریف ہوتی رہی اور انسانیت کے بدن میں جونک نہ لگی تو خدا نے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا۔ چنانچہ تقریباً چند سو سال تک کوئی نبی آیا ہی نہیں۔ انہی چند سو سال کے اندر انسانیت کے بدن میں اتنے کیڑے پڑے اور معاشرتی اور تمدنی سرزمینوں پر فتنوں کے اتنے سیلاب آئے، کہ خدا پرستی کی رُوح چیخیں مارنے لگی۔ ظلم و ستم کے شعلے بھڑکے۔ قتل و غارت کے بازار گرم ہوئے۔ شہوت پرستی نے عورتوں کی عصمت لوٹی۔ سنگدلی نے نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ درگور کیا۔ معاشقت کی زہریلی ہواؤں نے تمام فضا کو مسموم بنا دیا۔ امن و امان کی پریاں لاحول پڑھ کر ہر بستی سے اُڑ گئیں۔ بُت پرستی کے بھوت دھم دھم ہر گھر میں آ کُودے۔ جب انسانیت کی ہڈیاں چُور چُور ہونے لگیں تو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھے۔ الٰہی اس مصلح کو قوم میں جلدی بھیج جس کے آنے کی خوشخبری تُو نے توریت و انجیل میں دی ہے۔ ہم اس پر ضرور ایمان لائیں گے۔ ہم ان کی اطاعت کریں گے۔

ملکِ عرب پر رحمتِ ایزدی نے پھر اپنے پَر پھیلائے۔ نبیٔ آخر الزماںؐ کا ظہور ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو سماں ہی کچھ اور تھا۔ کفر و زندقہ اس طرح ہر طرف پھیلا ہوا تھا جیسے درخت پر آکاش بیل یا تالاب کے پانی پر کائی۔ چالیس سال تک انہی گندی ہواؤں میں سانس لیتے رہے۔ بشریت کی یہ مسخ شدہ لاشیں آنکھوں کے سامنے پڑی دیکھتے رہے جب

اعلانِ رسالت کا حکم ہوا تو وہی لوگ جو بلبلا کر نزولِ رحمت کی دعائیں مانگ رہے تھے اب اُسی رسولؐ کو جس کی صفات توریتؔ انجیل میں پڑھ چکے تھے اور جسے اپنے بچوں سے زیادہ پہچانتے تھے جھوٹا رسول کہنے لگے۔ کبھی اسے مجنون کہتے کبھی کاہن کبھی شاعر۔ کبھی فسانہ گو۔ خدا نے اپنے رسولؐ کی تصدیق کے لیے قرآن نازل کیا۔ اس میں اپنی توحید کے ایسے مستحکم دلائل اور اپنی قدرتِ کاملہ کی ایسی روشن علامات بیان کیں جن کی تردید ناممکن تھی۔ پھر اپنے رسولؐ کی صداقت اور قرآن کے پُراز حکمت ہونے کے اتنے ثبوت دیئے کہ منکرین کی لایعنی حجتوں کو سانپ سونگھ گیا۔ رسولؐ کو دَورِ قرآنی کے تحت کئی محاذوں پر جنگ کرنا پڑی اور ہر محاذ پر کامیاب رہے۔

۱۔ ملحدوں سے ۲۔ مشرکوں سے ۳۔ اپنی قوم کے بُت پرستوں سے ۴۔ منافقوں سے، یہودیوں سے نصارٰی سے۔ یہ معمولی مناظرے اور مباحثے نہ تھے۔ بات بات پر مخالفوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھار تھی اور ان سب کو نیچا دکھانے میں قرآن کی آیات سے مدد لی جاتی تھی۔ یہ تھی قرآن کی استدلالی قوت، یہ تھا قرآن کے بیان میں زور۔ یہی قرآن رسولؐ کا وہ سب سے بڑا اعجاز تھا جس کے دلائل و براہین ایک ہی قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہیں گے۔

قرآن نے فطرتِ انسانی کے وہ وہ اسرارِ خفی و جلی بیان کیے ہیں جہاں حکمائے عالم اور فلاسفرانِ کی نگاہِ جستجو پہنچ ہی نہ سکی تھی۔ انسانی کمزوریوں کو ایک ایسے نرالے انداز میں بیان کیا ہے کہ الفاظ کم ہیں مگر ان کے نتائج بڑے دُور رس ہیں۔ مثلاً یہ کہہ کر چھوڑ دیا خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ (انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے) لیکن یہ نہیں بتایا گیا کس اعتبار سے۔ اس کو انسان کی عقل پر چھوڑ دیا کہ وہ سوچے سمجھے اور غور کرے اس میں کہاں کہاں کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور ان کمزوریوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اگر خود بیان کر دیتا تو انسان کو غور کرنے کا موقع نہ ملتا۔ فلسفیوں کی عقل اسی طرزِ نگارش پر چکرائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ تین لفظوں میں فطرتِ انسانی کی خصوصیات کے دریا بہا دیئے ہیں۔ صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ "انسان جلد باز ہے"۔ تفصیلی بات کچھ نہیں۔ نتائج سے بحث نہیں کی گئی۔ یہ سب باتیں انسان کی عقل پر چھوڑ دی گئیں۔ وہ سمجھے کہ جلد بازی نے کہاں کہاں اُسے نقصان پہنچایا تاکہ وہ خود اپنے افعال کو اس کمزوری کا باعث قرار دے۔

اسی طرح جابجا انسان کی بے شمار خلقی و فطری خوبیاں اور کمزوریاں قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہیں اور جہاں جہاں اس کی غفلت اس کے دین اور دُنیوی نقصان کا باعث نظر آئی ہے اس کو آیاتِ قرآنی نے بُری طرح جھنجوڑا ہے اور اسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی ہے اور انعام و اکرام سے نوازا ہے ان لوگوں کو جو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نظر آتے ہیں۔

قرآن کو اوّل سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں کوئی حکم ایسا نظر نہ آئے گا جو انسان کی فطرت پر غیر معمولی بار ہو۔ جہاں فطرت دبتی نظر آئی ہے وہیں حکم کا بار ہلکا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً نماز کھڑے ہو کر پڑھو۔ بیمار ہو تو بیٹھ کر پڑھو۔ بیٹھ نہیں سکتے تو لیٹ کر سہی، اشارہ سے سہی۔ سفر میں ہو تو قصر کرو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم سے پڑھو۔ پیسہ پاس نہیں تو حج کا وجوب ساقط۔ راستہ پُرامن نہیں تو وجوب ساقط۔ بیمار ہو تو وجوب ساقط۔ غرض خالقِ فطرت

نے ہر جگہ فطرتِ انسانی کی قوت کا اندازہ کر کے کوئی حکم دیا ہے۔ غرض عجیب و غریب کتاب ہے جس پہلو سے نظر کرو کوئی کتاب اس کا جواب نہیں ہو سکتی۔ اندازِ نگارش ایسا انوکھا کہ جس نے بڑے بڑے فصحائے عرب اور باکمال انشاء پردازوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ چھوٹی آیات میں اتنا کثیر مطلب سمو دیا ہے کہ ان کا مطلب پھیلاؤ تو دفتر بن جائے جہاں عبارت میں خلا ہے اسے پُر کرو تو لمبی لمبی عبارتیں بن جائیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ پہلی اور پچھلی بات خود ہی اس خلا کو پُر کر دیتی ہے سیاق و سباق عبارت خود پتہ دیتا ہے کہ یہاں جو خلا ہے اُسے یوں پُر کرو۔ ایک دو مثال ملاحظہ کیجئے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں بڑے بڑے مشاق انشاء پرداز چوٹ کھا جاتے ہیں۔ یا بیان ایسا گنجلک ہو جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا گاجروں میں گٹھلیاں اور جواہرات میں سنگریزے مل جاتے ہیں۔

۱۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے چند کھوٹے درموں میں یوسفؑ کو بیچ ڈالا اور وہ تو یوسفؑ سے بیزار ہو ہی رہے تھے۔ آگے بیان ہوتا ہے وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ۔ مصر کے لوگوں میں سے جس نے یوسفؑ کو خریدا تھا اُس نے اپنی بی بی سے کہا اسے عزت و آبرو سے رکھو۔ غور کرو ان دونوں عبارتوں میں کتنا خلا پیدا ہو گیا۔ دوسرا لکھتا تو یوں لکھتا کہ جب یوسفؑ کے بھائی بیچ چکے تو قافلہ والے یوسفؑ کو لے کر مصر میں آئے اور اس بازار میں انہیں جا بٹھایا جہاں غلام بکتے تھے۔ لوگ خریداری کو آنے لگے۔ ان میں عزیزِ مصر بھی تھا جس نے یوسفؑ کو خرید لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ بی بی سے کہا اسے ذرا اچھی طرح رکھنا۔

خط کشیدہ عبارت کا خلا ہے لیکن تمام عبارت قلم انداز کر دی گئی۔ کیونکہ یہ سب باتیں پڑھنے والے کی سمجھ میں فوراً آ جائیں گی۔ ان کا ذکر انشاء پردازی کا سُقم تھا۔

۲۔ اسی سورۂ یوسف میں ہے زلیخا کے گھر میں جو بچہ تھا اس نے اس جھگڑے کا فیصلہ یوں کیا کہ اگر یوسفؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو زلیخا سچی ہے یوسف جھوٹے ہیں۔ اور اگر پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا جھوٹی ہے یوسف سچے ہیں۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ کیوں وہ سچے ہیں کیوں وہ جھوٹی ہے۔ اس کو انسان کی ذہنی صلاحیت پر چھوڑ دیا گیا ہے واقعہ کی نوعیت پر غور کرے اور خود سبب معلوم کرے۔

اس حسنِ نگارش کے نمونے ایک دو نہیں سینکڑوں جگہ پائے جاتے ہیں۔ انسان کی کیا طاقت کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔

---

۲۴ - رُموزِ اوقاف

قرآن مجید میں آیات پر کچھ اشارے بنے ہوتے ہیں - ان پر عمل کرنا چاہیئے - ان علامتوں کو رُموزِ اوقاف کہتے ہیں - ان کی صُورت یہ ہے :

م - وقف لازم ، یہاں ٹھہرنا چاہیئے ورنہ عبارت کا مطلب منشائے الٰہی کے خلاف ہوگا -

ط - وقف مطلق ، یہاں سے گزرنا نہیں چاہیئے بہتر یہی ہے کہ توقف کرنیکے بعد سے ابتدا کی جائے -

ج - وقف جائز ، یہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا دونوں جائز ہیں -

ز - وقف مجوز ، یہاں نہ ٹھہرنا بہتر ہے -

ص - وقف مرخص ، یہاں ملا کر پڑھنا چاہیئے لیکن تھک جانے کی حالت میں ٹھہرنا جائز ہے -

ق - کہا گیا ہے کہ یہاں وقف ہے (قیل علیہ الوقف) ٹھہرنا اور نہ ٹھہرنا دونوں بہتر ہیں -

لا - وقف نہ کرنا چاہیئے - اگر بھولے سے ٹھہر جائے تو اعادہ واجب ہے -

قف - ٹھہرنا چاہیئے -

سکتہ - اس جگہ آواز توڑے سانس نہ توڑے -

وقفہ - لمبے سکتہ کی علامت ہے - اس جگہ ذرا دیر تک آواز توڑے رکھے - سکتہ اصل سے قریب تر ہوتا ہے اور وقفہ وقف سے -

صل - (قَدْ یُوْصَلُ) کبھی ملا کر پڑھا جاتا ہے - یہاں وقف کرنا احسن ہے -

صلے - (وصل اولیٰ) یعنی ملا کر پڑھنا بہتر ہے -

∴ - اگر کوئی عبارت ایسے نقطوں کے درمیان ہو تو پہلے تین نقطوں پر ٹھہرنا اور دُوسرے تین نقطوں پر نہ ٹھہرنا یا اس کے برعکس کرنا اس قسم کی عبارت کو معانقہ کہتے ہیں -

۵ - آیت کا نشان ہے - اس پر ٹھہرنا چاہیے - اگر اس پر کوئی اور علامت ہو تو اس کا اعتبار ہوگا -

۲۵ - قرآن خوانی اور اس کا ثواب

قرآن مجید کو جہاں تک ممکن ہو روزانہ پڑھے - جس گھر میں اس کی تلاوت ہوتی ہے شیاطین اُس سے دُور رہتے ہیں - اور پڑھنے والا بہت سی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے -

- حدیث میں ہے کہ تین چیزیں روزِ قیامت خدا سے شکایت کریں گی :

۱ - وہ مسجد جس میں قرب و جوار کے لوگ نماز نہ پڑھیں اور لوگوں کی بے اتفاقی سے وہ شکستہ و خراب ہو جائے -

۲ - وہ عالم جس کی عزّت لوگ ملحوظ نہ رکھیں اور مسائل اس سے دریافت نہ کریں -

۳ - وہ قرآن جو لوگوں کے گھر میں رکھا ہو اور اس کی تلاوت نہ کی جائے -

- ایک حدیث میں ہے کہ چھ چیزیں ایسی ہیں کہ مرنے کے بعد مومن ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے :

۱ - زن و فرزند جو اس کے لیے استغفار کریں -

۲ - قرآن جو اس کے بعد اس کے گھر میں پڑھا جائے -

۳ - وہ کنواں جو خلق اللہ کے فائدہ کے لیے بنوایا جائے -

۴ - وہ درخت جس کے سایہ میں لوگ بیٹھیں -

۵ - وہ چشمہ جو رفاہِ عام کے لیے جاری کیا گیا ہو -

۶ - وہ نیک رسم جس کو قوم میں رائج کیا ہو -

- مستحب ہے کہ جب قرآن کو کھولا جائے تو اسے بوسہ دیا جائے اور پُورا احترام اس کا مدِ نظر رکھا جائے - بغیر وضو اس کے الفاظ کو مَس نہ کیا جائے - پڑھنے میں جلدی نہ کی جائے - زیادہ پڑھنا قابلِ تعریف نہیں بلکہ ترتیل و خوش الحانی کے ساتھ پڑھا جائے اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھا جائے - اس کی آیات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جائے - جب آیۂ رحمت پڑھے تو خدا سے رحمت طلب کرے - آیۂ عذاب پڑھے تو خدا سے پناہ مانگے - جب پڑھنا شروع کرے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور کہے - جب آیۂ سجدہ پڑھے تو سجدہ میں جائے اور کہے سَجَدْتُ لَکَ یَا رَبِّ تَعَبُّدًا وَّ رِقًّا لَا مُتَکَبِّرًا وَّ لَا مُسْتَنْکِفًا عَنْہُ اَنَا عَبْدٌ ذَلِیْلٌ خَائِفٌ مُّسْتَجِیْرٌ -

جب پڑھنا ختم کرے تو کہے صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ -

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

حمد ہے اس خدا کی جو تمام کائنات کا پلنے والا ہے۔ رحمٰن و رحیم ہے قیامت کے دن کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو اس سیدھے راستہ پر ثابت قائم رکھ جن پر تو نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں، نہ ان لوگوں کا رستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے اور نہ اُن لوگوں کا راستہ جو گمراہ ہو گئے ہیں۔

فضائل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سوائے سورۂ برأت (توبہ) ہر سورہ کا جزو ہے۔ بسم اللہ کے بیشمار فضائل ہیں ہم یہاں صرف ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کی بیان کرتے ہیں جو تمام فضائل پر حاوی ہے۔ حدیث "كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَهُوَ اَقْطَعُ وَاَبْتَرُ" یعنی جس کام کا آغاز بسم اللہ سے نہ کیا جائے گا وہ نہ تو پورا ہوگا اور نہ پریشانی کا دُور کرنے والا۔ بسم اللہ پڑھ کر کام کرنے میں اللہ کی رحمت و برکت شامل رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیہ مبارکہ انہی الفاظ کے ساتھ انبیائے سابقین پر نازل ہو چکی تھی۔ جناب سلیمانؑ نے جو خط بلقیس کو لکھا تھا اس کا سرنامہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں کُل ۱۹ حرف ہیں جن کے اندر پُورا قرآن سمویا ہُوا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے الفاظ میں سُنیئے:

"جو کچھ تمام قرآن میں ہے وہ سورہ فاتحہ میں ہے اور جو سورہ فاتحہ میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ سب 'بائے بسم اللہ' میں ہے اور جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ اس نقطہ میں ہے جو ب کے نیچے ہے اور میں وہی نقطہ ہوں جو اس ب کے نیچے ہے۔"

امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس ارشاد کے متعلق مفسّرین نے جو توضیحات کی ہیں ان میں سب سے زیادہ میں نے اُس وضاحت کو پسند کیا جو مدد الملت مولانا سید امداد حسین صاحب کاظمی نے اپنے ترجمہ قرآن مطبوعہ انصاف پریس لاہور میں کی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

اس نقطہ کی تشریح کے لیے پڑھیے ایڈورڈ کلاڈ Edward Clauad کی کتاب اسٹوری آف دی ایلفے بٹ Story of the Alphabet جس میں اُس نے ایک ایک حرفِ تہجّی کا ماخذ بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے اہلِ فینقیہ اور

اہلِ مصر معاصر تھے اور ان کے درمیان تجارتی معاہدے ہوتے تھے جن کی تفہیم کے لیے کچھ اشارات مقرر کیے تھے جو بعد میں حروفِ تہجی بن گئے۔ مثلاً آنکھ کہنا ہوتا تو آنکھ کی شکل بنا دیتے تھے جو حرف ع سے مشابہ ہے اور عربی میں عین کے معنی آنکھ ہیں، ج سے مراد اُونٹ لیتے یہ حرف اُونٹ ہی کی شکل کا ہے۔ عربی میں جَمَل اور عبرانی میں جیم اُونٹ ہی کو کہتے ہیں یہ بیٹھے ہوئے اُونٹ کی شکل ہے اور نقطہ سے مراد اُونٹ کا مالک ہے جو اس پر سوار ہے۔ اس طرح ش سے مراد شجر (درخت) ہے جس پر دو پرندے بیٹھے ہیں اور ایک اُڑ رہا ہے۔ اسی طرح وہ لکھتا ہے کہ ب سے مراد گھر ہے اور ب کے نیچے جو نقطہ ہے اس سے مراد گھر کا مالک ہے جو دروازہ پر بیٹھا ہے۔

یہ مضمون مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے آبِ حیات میں بھی لکھا ہے۔ پس آپ سمجھئے کہ امیر المومنین علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جو کچھ ہے اس کی ابتدا بائے بسم اللہ سے ہے یعنی ایک گھر ہے جس کا دروازہ میں ہوں۔ بس میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو کُل قرآن کے اندر ہے۔ اسی بنا پر فرماتے تھے سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ (جو چاہو مجھ سے پُوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ۔) تمام علومِ قرآنی کا دروازہ میں ہوں۔ رسول اللہؐ نے اس کو یوں واضح فرمایا ہے اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ (میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔) اور یہ بھی فرمایا ہے اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ (میں علم کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں) مطلب صاف اور واضح ہے کہ جملہ علومِ قرآنی کا میں شہر ہوں اور علیؑ دروازہ ہیں۔ لہٰذا علومِ قرآنی حاصل کرنے والے کو چاہیے کہ وہ دروازہ سے آئے۔ اسی طرح حکمت کے گھر میں داخل ہونے والے پر لازم ہے کہ دروازہ سے آئے، پشت کی طرف سے نہ آئے کیونکہ پشت سے آنے والا چور ہوتا ہے۔ قرآن بھی یہی فرما رہا ہے وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا (گھروں میں دروازوں سے آؤ۔) علوم القرآن کے اسرار و غوامض کی نقاب کشائی جس طرح امیر المومنینؑ نے فرمائی ہے کسی دوسرے سے ممکن نہیں ہوئی۔ علی علیہ السلام ہی مصداق مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ ہیں۔ (پ ۱۳، آیت ۴۳)

تفسیر سورۂ فاتحہ

اس سورہ کے تین نام ہیں، سورہ فاتحہ۔ سورہ الحمد اور سبع مثانی۔ یہ سورہ دو بار نازل ہوا۔ مکہ اور مدینہ میں، اسی لیے سبع مثانی کہلاتا ہے یعنی وہ سات آیتیں جو دو بار نازل ہوئیں۔ اس سورہ کی عظمت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ وہ ہر نماز میں پڑھنی واجب ہے اگر اس کو نہ پڑھا جائے تو نماز باطل۔

اس کی جامعیت اور معنویت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا ہے لَوْ شِئْتُ لَاَوْقَرْتُ سَبْعِیْنَ بَعِیْرًا مِنْ تَفْسِیْرِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ (میں اگر چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اتنی کتابیں لکھ دوں جو ستّر اُونٹوں پر بار ہو سکیں) اور یہ بھی فرمایا جو تمام قرآن میں ہے وہ سورہ فاتحہ میں ہے۔ کس کی طاقت ہے کہ اس کی پُوری تفسیر بیان کر سکے یہ تو ان ہی کا حق ہے جو من عندہ علم الکتاب (پ ۱۳، ع ۱۶) کے مصداق تھے اور آیات بیّنات جن کے سینہ میں محفوظ تھیں۔

بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستّر اُونٹ کیسے بار کیے جا سکتے ہیں جبکہ پورے قرآن کی تفسیر میں بھی اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ سُنا ہے لندن کے کتب خانہ میں سب سے بڑی تفسیر وہ ہے جو ستّو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایسے خیالات انہی لوگوں کے دل میں پیدا ہوتے ہیں جن کو قرآن کریم کی معرفتِ تامّہ حاصل نہیں۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔

اسلام جو اللہ کے دین کا نام ہے صرف پانچ حرفوں کا ایک لفظ ہے لیکن اس کی پہنائی اور گیرائی کہاں تک ہے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ ایک ایسا باغ ہے جس میں ہزارہا پھول کِھلے ہوئے ہیں اور ہر پھول کا رنگ۔ خوشبو اور قد و قامت جداگانہ

کتنے علوم اس کے زیرِ سایہ پرورش پا رہے ہیں۔ کس کی طاقت ہے کہ ان کا شمار کر سکے۔ مثلاً

۱۔ اسلامی علم تفسیر، کتنی ہزار کتابیں اس علم میں لکھی گئی ہیں۔
۲۔ اسلامی احادیث کے متعلق کتنے کتب خانے چھلک رہے ہیں، کون شمار کر سکتا ہے۔ یہ علم تفسیر سے ایک جُداگانہ چیز ہے۔
۳۔ علمِ کلام میں کتنے دقیق مسائل کو حل کیا گیا ہے۔ کتنے مباحث اس کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ کتنی کتابیں اس علم میں لکھی جا چکی ہیں، ہے کوئی جو بتلا سکے! پھر تفسیر ہے جو حدیث سے جداگانہ ایک چیز ہے مگر ہے اسلام ہی کے باغ کا پھول۔
۴۔ علمِ فقہ۔ لاکھوں کتابیں اس علم کے تحت لکھی جا چکی ہیں۔ فقہ کے تمام مسائل ان میں حل کیے گئے ہیں۔ یہ بھی اسلام ہی کا خزانہ ہے۔
۵۔ اسی طرح علم اصولِ فقہ۔ تاریخ۔ قصص و حکایات۔ معاملات۔ اخلاق۔ تجارت۔ مطالب۔ میراث۔ وکالت۔ رہن۔ نکاح۔ طلاق وغیرہ پر لکھنے والوں نے کیا کچھ نہیں لکھا۔

غرض ایک لفظ اسلام کے اندر جب یہ تمام ذخائر موجود ہیں جن سے کتنے اُونٹ بار کیے جا سکتے ہیں تو سورہ فاتحہ تو سورہ فاتحہ ہی ہے۔ اس کی جامعیت کا کیا ٹھکانہ۔ اس کی تفسیر میں امیر المومنینؑ جیسا لکھنے والا اگر ستّر اونٹ بار کر دے تو کیا تعجب کی بات ہے۔

اس کے معجزات بھی ذرا ملاحظہ ہوں:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اگر سورہ فاتحہ ستّر مرتبہ کسی مُردہ پر پڑھ دی جائے تو بعید نہیں کہ وہ زندہ ہو جائے اور اگر مریض کا بازو پکڑ کر دَم کی جائے تو اس کو شفا حاصل ہو گی اور اگر اس سے شفا نہ ہو تو پھر کسی دوا سے آرام نہ ہو گا۔ بشرطیکہ دم کرنے والا صاحبِ زہد و تقویٰ ہو۔ عبادت گزار ہو اور مریض بھی بندہ مومن ہو اور قرآن کی اس اعجازی صوّت پر پورا پورا یقین رکھتا ہو۔

راقم الحروف کئی بار اس کا تجربہ کر چکا ہے۔ میں نے اکثر مریضوں کو یہ عمل بتایا ہے کہ ایک شخص باوضو ہو کر مریض کا داہنا بازو پکڑے اور بائیں ہاتھ میں پانی کا گلاس لے اور اس پر ستّر مرتبہ سورہ الحمد دم کرے اور یہ پانی نصف گلاس صبح کو اور نصف گلاس رات کو سوتے وقت مریض کو پلائے۔ یہ عمل سات روز متواتر کیا جائے۔ چنانچہ بہت سے مریضوں کو اس عمل مبارک سے شفا حاصل ہوئی ہے۔

اگر کوئی شخص سات مرتبہ سورہ الحمد سینہ پر دم کر کے سوئے گا تو اس کو بدخوابی نہ ہو گی۔

اگر گھر کا دروازہ بند کرتے وقت سات بار سورہ الحمد قفل پہ دم کر دے تو سرقہ سے محفوظ رہے گا۔

حقایق و معارف

۱۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ بکثرت ہیں لیکن اس سورہ میں سب سے پہلے جس صفت کا ذکر کیا ہے وہ اس کی صفتِ ربوبیت ہے۔ یہ نہیں فرمایا حمد ہے اُس خدا کی جو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ہے حالانکہ خلق کا مرتبہ ربوبیت سے پہلے ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ کوئی مخلوق اپنی خلقت کے اسرار کو نہیں سمجھ سکتی کیونکہ خلقت کے وقت قدرتی صنّاعیوں کو کوئی مخلوق بچشم خود نہیں دیکھتی، لیکن خلقت کے بعد جب اس کی پرورش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ وہ ربّ العٰلمین کس کس شان سے اس کی پرورش کرتا ہے، اس کی پرورش کے لیے کیا کیا سامان مہیا کرتا ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہی اپنی پرورش کا سامان اپنی

ماں کی چھاتی میں مہیا پاتا ہے۔ اس کے بعد کیا کیا نعمتیں اس کے سامنے آتی ہیں اور کس طرح اس کی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ شانِ ربوبیت خدا کے سوا کوئی نہیں دکھا سکتا۔ انسان ہی پر کیا موقوف ہے سطحِ ارض پر جتنے ذی حیات موجود ہیں ان سب کی وہی روزی فراہم کرتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اُونچے اُونچے پہاڑوں پر ہوں یا ناپیدا کنار سمندروں میں ہوں یا درختوں پر بسنے والے پرندے ہوں یا سطحِ ارض پر دَوڑ دھوپ کرنے والے چرندے۔ درندے اور رینگنے والے حشرات الارض، سب اس کے خوانِ یغما پر صبح و شام کھا رہے ہیں۔ اُس نے وعدہ کیا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہر زمین پر چلنے پھرنے والے کا رزق اللہ پر ہے) اس ربوبیت کا شکر بجالانا انسان کا فرضِ اوّلین ہے۔ قرآن میں دیکھئے ہر نبی جب کوئی دُعا کرتا ہے تو رَبّ کا لفظ پہلے استعمال کرتا ہے۔ پس معلوم ہُوا خدا کو اپنی صفتِ ربوبیت سب سے زیادہ پسند ہے۔

۲۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ ربوبیت کے بعد اس نے اپنی صفت رحمٰن و رحیم ذکر فرمائی ہے۔ یعنی دُنیا و آخرت دونوں جگہ رحم کرنے والا وہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک گنہ گار انسان اپنے گناہوں کا تصور کر کے اور نجاتِ آخرت سے مایوس ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور انتہائی بے کیف زندگی بسر کرتا۔ اگر اللہ صفت رحمٰن و رحیم سے اس کی ڈھارس نہ بندھاتا۔ وہ رحمٰن تمام مخلوق کے لیے ہے اور رحیم مومنین کے لیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو ذات رحمٰن و رحیم ہے وہ عادل نہیں ہو سکتی۔ رحم چاہتا ہے کہ گناہ معاف کیا جائے۔ عدل چاہتا ہے کہ انصاف کیا جائے۔ جواب یہ ہے کہ وہ رحم کرے گا اُن گناہوں کے متعلق جن کا تعلق اس کی ذات سے ہو گا۔ مثلاً ایک شخص نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا تو وہ رحم فرما کر اس کا گناہ معاف کر دے گا لیکن جو گناہ بندوں کا بندوں نے کیا ہے تو ان کے درمیان وُہ ضرور عدل سے کام لے گا۔

۳۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اپنے قدرت و اختیار کا تین لفظوں میں ایسا ہیبت ناک مرقع قدرت نے پیش کیا ہے کہ عاقبت سے بے خبر انسان ایک مرتبہ ہی چونک پڑتا ہے۔ ایک دن اُسے میدانِ قیامت میں اس طرح کھڑا ہونا پڑے گا کہ اس کا کوئی معاون و مددگار نہ ہو گا۔ دنیا کی ساری سلطنتیں اس روز ختم ہو جائیں گی اور پھر یہ آواز عرصۂ محشر میں گُونجے گی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (بتاؤ آج کس کی حکومت ہے) کون جواب دے گا۔ آخر خود ہی لبِ حقیقت سے فرمائے گا — لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (آج خدائے واحد و قہار کی حکومت ہے)۔ جو لوگ روزِ قیامت پر اور خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتے وہ سوچیں کہ اگر خدا اور قیامت پر ایمان لانے والوں کا عقیدہ صحیح ہُوا تو ان کا کیا حشر ہو گا۔ اور اگر ایسا نہیں ہو گا تو ایمان لانے والوں کا کیا بگڑے گا۔

۴۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اس آیت سے پہلے جو تین آیتیں ہیں وہ ذاتِ باریؐ کو غائب سمجھ کر کہنے والا کہہ رہا ہے لیکن مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر پہنچ کر جب معرفت اپنے انتہائی عروج پر آجاتی ہے تو عبد و معبود کے درمیان جو حجاب حائل ہوتے ہیں وہ اُٹھ جاتے ہیں۔ اب کہنے والا جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہے۔ اب وُہ یوں نہیں کہتا کہ ہم خاص اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہتا ہے، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ یہاں عبدیت اپنے اصلی رُوپ میں نمایاں ہو جاتی ہے اور بندہ اپنے خالق کی توحید و یکتائی کا دل سے اقرار کرتے ہُوئے اپنی عبادت کو اُسی سے مخصوص کرتا ہے اور یہ یقین کرتے ہُوئے کہ خدا کے سوا کوئی سچا مددگار نہیں وُہ خدا سے اعانت طلب کرتا ہے۔ اب آگے جو کچھ اس کی بارگاہ میں عرض کرنا چاہتا ہے وہ براہِ راست اُسے مخاطب کر کے کہتا ہے کسی کو واسطہ قرار نہیں دیتا۔ اب جو کچھ وہ کہتا جاتا ہے اس کا معبودؐ اس کا ربّ

سب سنتا جاتا ہے۔ دو لفظوں میں توحیدِ الٰہی کا کتنا زبردست درس موجود ہے۔ ان اسرار و رموز کو عام لوگ کیا سمجھیں، اس کا مزہ تو کوئی سالکانِ راہِ طریقت اور رہ نوردانِ وادیٔ معرفت سے پُوچھے۔

۵۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ یہ ترجمہ غلط ہے کہ ہم کو سیدھے راستہ کی ہدایت کر۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُعا کرنے والا ابھی صحیح راستہ پر اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ اور اگر ایسا ہے تو اس کا طریقہ عمل غلط ہے۔ ہمارے علمائے نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ہم کو سیدھے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔ صراطِ مستقیم صرف ایک ہی سیدھے خط کو کہتے ہیں۔ اس کے اوپر نیچے جتنے خطوط نکلیں گے وہ سب کج ہوں گے لہٰذا نجات پانے والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر خطِ مستقیم پر چل رہے ہوں۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ اسلام میں جو تہتر فرقے ہیں ان میں سے صرف ایک ناجی ہو گا سب نہیں ہو سکتے۔ اس کا پتہ رسولؐ نے دے دیا ہے۔ یعنی قرآن کے ساتھ اپنے اہلبیت کو کر دیا ہے تاکہ ہر زمانہ میں وہ لوگوں کو صراطِ مستقم کی نشان دہی کرتے رہیں۔ اہلبیت کے سوا اسلام میں کوئی گروہ ہمیں ایسا نظر نہیں آتا جس کو رسولؐ نے قرآن کے ساتھ کیا ہو۔

۶۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یہ صراطِ مستقیم صرف انہی لوگوں کا راستہ ہو سکتا ہے جن پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔ قرآن میں ان لوگوں کی نشان دہی یوں کرائی گئی ہے:

أُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ ۝

یعنی (خدا کے نیک بندے) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں اور وہ چار گروہ ہیں۔ انبیاء۔ صدیقین۔ شہداء و صالحین۔ یہاں نعمتوں سے مراد دنیوی نعمتیں نہیں ہیں بلکہ سعاداتِ آخروی اور مراتب و مدارج رُوحانی ہیں۔ دنیا میں کسی نبی یا ولی کا گھر آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس میں انعام پانے والوں کی یہ چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔ سوائے بیت مکرم و مقدس سرکارِ دوعالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جہاں ان میں اِن اصناف کے بہترین افراد بیک وقت موجود تھے۔ نبی تھے تو سید الانبیاءؐ۔ صدیق تھے تو افضل الصدیقین۔ شہید تھے تو سید الشہداؑ اور صالح تھے تو صالح المومنین۔ پس ان کے ساتھ ہونے والا اور ان سے محبت کرنے والا یقیناً صراطِ مستقیم پر قائم رہے گا۔

قرآن نے بتایا کہ رسولؐ صراطِ مستقیم پر ہیں۔ يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (اے سید و سردار قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم مرسلین میں سے ہو اور سیدھے راستہ پر ہو) اور رسولؐ نے فرمایا۔ يَا عَلِيُّ اَنْتَ مِيْزَانُ الْاَعْمَالِ وَصِرَاطُ الْمُسْتَقِيْمِ۔ (اے علیؑ، تم میزانِ اعمال ہو اور صراطِ مستقیم ہو۔)

۷۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اچھے لوگوں کی نشان دہی کے بعد اب یہ دُعا کی جاتی ہے کہ مغضوب علیہم ولا الضالین کے راستہ سے ہمیں بچائے رکھنا۔ پہلا گروہ یہودیوں کا ہے جن پر ایک بار نہیں نہ معلوم کتنی بار غضبِ الٰہی نازل ہُوا۔ دوسرا گروہ نصاریٰ کا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہہ کر گمراہ ہو گئے۔

نکتۂ بلیغہ : سورہ فاتحہ درحقیقت دُعا ہے۔ بندہ اپنے خالق سے کچھ مانگنا چاہتا ہے۔ ہر مانگنے والے کے لیے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلے اپنے محسن کی تعریف کرے چنانچہ الحمد للہ سے مالکِ یوم الدّین تک تعریف ہے۔ پھر اپنی احتیاج کو اس سے مخصوص کرے۔ چنانچہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے ظاہر ہے۔ پھر اپنی حاجت بیان کرے جیسا کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ سے ظاہر ہے۔ پھر آخر میں کچھ ایسے لوگوں سے اپنا تعلق دکھائے جو محسن کے محبوب بندے ہوں۔ چنانچہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ سے واضح ہے۔ پھر اس کے دشمنوں سے اظہارِ نفرت کرے جیسا کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ سے ثابت ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

معترض کہتا ہے جب اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے ثابت ہے کہ مدد صرف خدا ہی سے چاہی جائے بندوں سے نہیں تو شیعوں کا یا علیؑ مدد کہہ کر علیؑ سے مدد مانگنا کفر ہے (نعوذ باللہ)۔ جواب یہ ہے، کہ استعانت کا نقطۂ آخر بے شک خدا ہے۔ دینے والا وہی ہے مگر براہِ راست کسی کو نہیں دیتا بلکہ بیچ میں کسی کو واسطہ ڈالتا ہے۔ لہٰذا اگر اس واسطہ کے ذریعہ سے مدد مانگی جائے تو کیا خرابی لازم آتی ہے۔ قرآن سے ثابت ہے کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے۔ سورۂ آل عمران میں پڑھیے کہ حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں سے کہا مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ۔ یعنی اللہ کے معاملہ میں میرا مددگار کون ہے۔ حواری کہنے لگے نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ۔ ہم ہیں اللہ کے ناصر۔ اگر غیرِ خدا سے نصرت طلب کرنا کفر ہوتا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بندوں سے نصرت کے خواہاں نہ ہوتے۔ نوعِ انسانی تو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ معاشرت اور تمدن کی فلاح و بہبود کے تمام دروازے بند ہو جائیں اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کرے۔ کوئی شیعہ حضرت علی علیہ السلام کو معاذ اللہ خدا مان کر حاجت طلب نہیں کرتا بلکہ ان سے سفارش چاہتا ہے۔ یعنی اے علیؑ ہماری مدد کیجیے ہمیں بارگاہِ الٰہی سے مدعا حاصل کرنے میں

○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾

یہ وہ کتاب ہے جس کے کتاب خدا ہونے میں ذرا بھی شک نہیں یہ اُن پرہیزگاروں کو پوری پوری ہدایت کرتی ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق اُن کو دیا ہے اُسے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اے رسولؐ جو تم پر اور تم سے پہلے انبیاءؑ پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں

اس سورہ کا نام سورۂ بقرا اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں گائے کا ایک حیرت انگیز قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ سورہ ۲½ پاروں پر منقسم ہے۔ اس کا آغاز الٓمّٓ سے ہوا ہے۔ یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں کیونکہ ان کو الگ الگ پڑھا جاتا ہے۔ الف۔ لام۔ میم، قرآن مجید میں کئی سوروں کی ابتدا اِن حروفِ مقطعات سے کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حروف اسرارِ الٰہیہ میں سے ہیں۔ ہمیں ان کی حقیقت معلوم کرنے کی تکلیف نہیں دی گئی۔ ان کا علم نبیؐ اور امامؑ کے سوا کسی اور کو نہیں دیا گیا۔

ان تمام حروف کی تعداد ۸۴ ہے جن میں بہت سے حروف مکرر ہیں۔ اگر ان کی تلخیص کی جائے یعنی مکررات کو حذف کر دیا جائے تو چودہ حروف باقی رہتے ہیں: ص ر ا ط ع ل ی ح ق ن م س ک ہ ۔

ان چودہ حروف سے عبارتیں تو بیشمار بنتی ہیں مگر یہ ایک اعجازی شان ہے کہ سوائے اس عبارت کے

صِرَاطُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمۡسِکُہٗ

باقی تمام عبارتیں مہمل بنتی ہیں۔ کئی صدیوں تک علمائے اسلام اس کوشش میں لگے رہے کہ شیعوں کے اس دعوٰی کو غلط ثابت کر دیں لیکن اس اعجازی شان کو کون مٹا سکتا تھا۔ (علیؑ کا راستہ حق ہے ہم اسی پر قائم ہیں۔)

اس کے بعد فرمایا گیا ہے ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ۔ ذٰلک سے بعید چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ھٰذا سے قریب شے کی طرف۔ آیہ مَا کَانَ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنُ اَنۡ یُّفۡتَرٰی مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۔ (یُونس، ۱۰/۳۷) میں قرآن کی طرف ھٰذا سے اشارہ کیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ذٰلک الکتاب سے مراد یا تو لوحِ محفوظ ہے یا پھر وہ کتاب ہے جو قلمِ قدرت سے قلبِ رسولؐ پر لکھی گئی۔ جو رسولؐ نے پڑھ کر سُنایا وُہ قرآن کہلایا اور جو اللہ نے لکھا وہ کتاب اللہ کہلائی۔

اس کتاب میں بہت سے دلائل ایسے موجود ہیں کہ ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اللہ کی کتاب ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ اس کا دعوٰی ہے کہ ایک سورہ ہی ایسا بنا لاؤ۔ اُس وقت سے آج تک کوئی اِس کی

تردید نہ کرسکا۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ یُوں تو قرآن کریم ہر اس شخص کے لیے باعثِ ہدایت ہے جو ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن پُوری پوری ہدایت تو صرف وہی متقی اور پرہیزگار لوگ حاصل کرسکتے ہیں جن کی چند صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لانے والے ہوں۔ بے شک ایمان کی صحیح قوت کا اندازہ ایمان بالغیب سے ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے متقیوں کی تمام صفات سے پہلے اس کو بیان کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو چیز آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اس کا یقین بہت آسانی سے ہوجاتا ہے، برعکس غائب چیز کے کہ اس میں سوچ بچار کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ بے شمار شکوک و اوہام کے دروازے دل پر کھل جاتے ہیں۔ مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ ہماری نظروں سے غائب ہے تو کتنے لوگ ہیں کہ اس کے وجود سے انکار کررہے ہیں۔ اسی طرح فرشتے۔ جنّت۔ دوزخ۔ قیامت وغیرہ ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ زبان سے چاہے اقرار کرلیتے ہوں لیکن ان کا دل نہیں مانتا۔ صرف اس بنا پر کہ یہ چیزیں ان کو نظر نہیں آتیں۔

اس لفظ غیب کے تحت میں امام غائب ولیٔ عصر مہدیٔ آخر الزماں پر ایمان لانا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ ورنہ انکار کرنے والا متقیوں کی صفت سے خارج ہوجائے گا۔

۲۔ متقی کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ پابندی سے نماز پڑھنے والا ہو۔ تارک الصلوٰۃ خدا سے ڈرتا نہیں اور نہایت غیر محتاط انسان ہے۔ یعنی وہ اپنی عبدیت کا ثبوت دینا نہیں چاہتا اور اپنے معبود کے سامنے پابندی سے سر جھکانا انسانی فریضہ نہیں سمجھتا۔

۳۔ متقی کی تیسری صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جو رزق اس کو دیا ہے وہ اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ یہ ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ وہ اس سے ڈرتا ہے کہ کل کو وہ بھی دوسروں کی طرح محتاج نہ بن جائے خدا نے جو اس پر نوازش فرمائی ہے اس کا شکر یہی ہے کہ وہ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دے۔

۴۔ تقویٰ کی چوتھی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام اپنے نبیؐ پر اور ان سے پہلے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں صدق دل سے اُن کی تصدیق کرے۔

۵۔ پانچویں علامت تقویٰ کی یہ ہے کہ روزِ قیامت پر صدق دل سے ایمان لائے اور صدق دل سے ایمان لانے کی صورت یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال بجالائے جو روزِ قیامت اس کے لیے نجات کا باعث ہوں۔ ورنہ بداعمالی کی صورت میں اقرارِ قیامت زبانی جمع خرچ ہوگا۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿١٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

(جن متقی لوگوں کی صفتیں پہلے بیان کی جاچکی ہیں) یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ اپنی دلی مراد پائیں گے۔ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے برابر ہے کہ (اے رسولؐ) چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وُہ ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر (نظر کرکے) خدا نے تصدیق کی مہر لگادی ہے (کہ یہ ایمان نہ لائیں گے) اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور انہی کے لیے بہت بڑا عذاب ہے، اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لے آئے حالانکہ وُہ دل سے ایمان نہیں لائے یہ لوگ خدا کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وُہ اپنے ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور کچھ شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں تو مرض تھا ہی اللہ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا اور ان کے لیے ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے بہت دردناک عذاب ہے جب ان سے کہا گیا کہ ملک میں فساد نہ کرتے پھرو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرتے ہیں خبردار ہوجاؤ یہ سچّے فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

متقیوں اور اہلِ ایمان کی صفات بیان کرنے کے بعد اب کافروں کا حال بیان کیا جاتا ہے یعنی کفر نے اس حد تک اُن کے اُوپر اثر کرلیا ہے کہ اب

رسولؐ کا ہدایت کرنا یا نہ کرنا ان کے لیے برابر ہوگیا ہے چکنے گھڑے بن گئے ہیں کہ جیسے اس پر پانی نہیں ٹھہرتا ایسے ہی ان کے پتھر جیسے دلوں پر ہدایت اثر نہیں کرتی۔ اِس کان سنتے ہیں اُس کان اُڑا دیتے ہیں۔ ان کی یہ حالت علمِ الٰہی میں آچکی ہے لہٰذا اس نے اپنے رسولؐ کو بتا دیا کہ یہ ایمان والے نہیں۔ جب ان کی یہ حالت دیکھی گئی اللہ نے بھی اپنی نیک توفیق ان سے سلب کر لی تفسیر مجمع البیان میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ نے ان کے قلوب کی حالت دیکھ کر تصدیق کر دی کہ یہ ایمان لانے والے نہیں اور یہ بھی معنی ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر ایسے نشان بنا دیئے کہ ملائکہ فوراً پہچان لیں کہ یہ کٹّے کافر ہیں وقتِ مرگ ان پر سختی کی جائے۔

یہ لوگ چونکہ درپئے تخریب اسلام تھے لہٰذا بات بات پر فساد اٹھا کھڑا کرتے تھے تاکہ مسلمان پریشان ہو کر اپنے سابق دین کی طرف پلٹ آئیں اور جب ان مفسدوں کو ٹوکا جاتا تو کہتے کیا خوب ہم تو آپ لوگوں کے درمیان اصلاح کے خواستگار ہیں اور آپ ہمیں مفسد بتاتے ہیں۔ خدا فرماتا ہے، اے مسلمانو! ذرا ان سے خبردار رہنا یہ کھلے مفسد ہیں لیکن اپنی فساد انگیزی کو سمجھتے نہیں۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی حالت بیان کی پھر کافروں کی اور مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ سے منافقوں کا تذکرہ شروع کر دیا۔ اللہ کو دھوکا دینا یہ ہے کہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں لیکن بباطن کافروں سے ملے ہوئے ہیں۔

فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ سے مراد مرضِ نفاق ہے۔ اور اللہ کے مرض کو زیادہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے اپنی توفیقات ان سے سلب کر لیں اور ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا۔ پس خباثتِ باطنی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے ان کا نفاق روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اگر خدا منافقوں کے مرضِ نفاق کو بڑھاتا ہے تو پھر منافق کیوں نجات سے محروم رہیں گے۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے انبیاء و مرسلین کو بھیجا۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کے سب بندے صاحبِ ایمان بن کر دنیا میں رہیں۔ لیکن اس نے کسی بندہ کو مجبور پیدا نہیں کیا بلکہ وہ صاحبِ اختیار ہے چاہے نیکیوں کا راستہ اختیار کرے چاہے بدیوں کا۔ اس کے اس معاملہ میں خدا دخل نہیں دیتا۔ ہاں اگر کسی کو امرِ نیک کی طرف جھکتا دیکھتا ہے تو اس کے ارادہ میں قوت پیدا کر دیتا ہے اس کو توفیق کہتے ہیں اور اگر کوئی امورِ خیر کی طرف راغب نہیں ہوتا تو اپنی مدد سے دست کش ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روز بروز اس کا نفاق بڑھتا ہی جاتا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ ﴿١٦﴾ مَثَلُھُمْ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَہٗ ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ وَتَرَکَھُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ ۙ اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْہِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَھُمْ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰہُ مُحِیْطٌۢ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴿١٩﴾ یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ؕ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِیْہِ ۙۗ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْھِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿٢٠﴾ ع

ع ١٣ ٢

جب ان سے کہا گیا کہ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تم بھی ایمان لے آؤ تو کہنے لگے (کیا خوب) کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے کچھ بے وقوف لا چکے ہیں۔ (خدا فرماتا ہے) آگاہ ہو یہ لوگ خود بے وقوف ہیں لیکن یہ جانتے نہیں (ان منافقوں کی حالت یہ ہے) جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے جب اپنے شیطانی (سرکش) بھائیوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں اجی ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں ہم تو مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ کیا مذاق اُڑائیں گے، اللہ ان کے مذاق کی خاصی سزا دے دیتا ہے اور ان کو

(نزولِ عذاب میں) اس لیے ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں غلطاں و پیچاں رہیں (اور ان کی گردنوں پر گناہوں کا بوجھ لدتا چلا جائے) یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی (نتیجہ یہ ہوا) کہ نہ تو ان کی اس تجارت ہی نے ان کو نفع دیا اور نہ انہوں نے ہدایت ہی پائی۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے (رات کے وقت مجمع میں) بھڑکتی آگ روشن کی جب اس کے شعلوں نے آس پاس کے مقاموں کو خوب روشن کر دیا تو خدا نے اُن کی روشنی لے لی اور ان کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھوڑ دیا کہ اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہ لوگ بہرے۔ گونگے اور اندھے ہیں یہ اپنی گمراہی سے باز نہیں آسکتے ۔ یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمانی بارش جس میں تاریکیاں اور گرج بھی ہو اور موت کے خوف اور کڑک کے مارے یہ لوگ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں حالانکہ خدا کافروں کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ نکل نہیں سکتے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو چُندھیا دے جب ان کے آگے بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں چل کھڑے ہوئے اور جب ان پر اندھیرا چھا گیا تو ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اگر خدا چاہتا تو ان سے دیکھنے اور سننے کی قوتیں چھین لیتا، بے شک وہ ہر شے پر قادر ہے ۔

مذکورہ بالا آیات میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ عہدِ رسالت میں چار قسم کے مسلمان پائے جاتے تھے اوّل صدق دل سے ایمان لانے والے جو صاحبانِ زہد و تقویٰ تھے ۔

۲۔ دوسرے منافق جو جان کے خوف اور مال کے لالچ میں بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن بباطن وُہ مشرک و کافر ہی تھے ۔

۳۔ ضعیفُ الایمان۔ یہ وہ سیدھے سادے کم عقل لوگ تھے جو اصول و فروعِ اسلام میں غور و فکر کرنے والے نہ تھے بلکہ رسولؐ کو جیسا کرتے دیکھتے تھے ایسا ہی عمل خود کرنے لگتے تھے ۔

۴۔ مؤلفۃ القلوب، یہ وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ یہ پختہ ایمان والے نہ تھے۔ جان جانے کے خوف سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ کوئی فتنہ و فساد برپا نہ کریں آنحضرتؐ مالِ غنیمت میں سے کچھ حصّہ ان کو زیادہ دلوا دیتے تھے تاکہ اس لالچ میں وہ اسلام کے ساتھ کوئی چال نہ چلیں۔

مذکورہ بالا آیات میں تذکرہ ہے ان مشرکوں اور کافروں کا کہ جب مسلمان ان سے کہتے تھے کہ جب برابر لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں تو تم کیوں چپ سادھے بیٹھے ہو، کیوں نہیں مسلمان ہو جاتے۔ وہ گستاخانہ انداز میں جواب دیتے کیا ان لوگوں کی طرح ہم بھی بے وقوف بن جائیں کہ ایسے خدا کو مان لیں جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ خدا فرماتا ہے یہ لوگ خود بے وقوف ہیں جو خالق و مخلوق، قدیم و حادث کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے ۔

آنحضرتؐ سے پہلے بھی جو اُمّتیں گزری ہیں وہ بھی انبیاء پر ایمان لانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو اپنی قوم کے رذیل افراد سمجھتے تھے اور نبی سے کہتے تھے ان کو نکال باہر کرو تو ہم ایمان لے آئیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ یہاں سے منافقوں کی چالاکیوں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ منافقوں کا چونکہ ہر عمل

ریا اور فریب کے پردے میں ہوتا تھا لہذا وہ مسلمانوں میں بیٹھ کر تو اپنے کمالِ ایمان کے متعلق بڑی شیخیاں بگھارتے لیکن اپنے شیطان یعنی سرکش دوستوں اور عزیزوں کے درمیان بیٹھتے تو ہنس ہنس کر کہتے ہیں کہ ہم تو محض مسلمانوں کا ٹھٹھا اڑانے کے لیے مسلمان بنے ہوئے ہیں ورنہ ہم وہی ہیں جو تم ہو۔ اس کے بعد والی آیت میں ہے کہ اللہ اُن کا استہزا کرتا ہے ــــــ کسی کا مذاق اڑانا۔ پھبتیاں کسنا، انسان کی کمینگی۔ اخلاقی پستی اور رذالتِ طبع کی دلیل ہے لہٰذا جس استہزا کا اللہ سے تعلق ہے اس کے وہ معنی نہیں جو بندوں کے استہزا کے ہیں۔ علم بدیع میں ایک صنعت کا نام صنعتِ مشاکلت ہے یعنی ایک شخص جس انداز و الفاظ سے کوئی بات کرے دوسرا اسی انداز و الفاظ میں جواب دے مگر معنی مختلف ہوں مثلاً ایک بھوکا ننگا آدمی آپ کے پاس آئے اور سوال کرے۔ آپ اس سے کہیں جو کھانا آپ کو مرغوب ہو وُہ بتا دیجئے کہ ہم پکوا دیں۔ وُہ کہے آپ میرے لیے ایک کُرتا اور پاجامہ پکوا دیجئے۔ ظاہر ہے کہ پکوانا دونوں جگہ ہم معنی نہیں۔ ایک جگہ اصلی معنی میں دوسری جگہ مجازی معنی میں پکوا دینا بمعنی سلوا دینا ہے۔ ایسی ہی یہ آیت ہے ۔ مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ (انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔)

دو مثالیں ۔ اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے منافقوں کی مثال بیان کی ہے:

۱۔ یہ مثال ان منافقوں کی ہے جو کسی غرض سے مسلمان ہو گئے تھے لیکن ان کا دل حقانیتِ اسلام پر ایمان نہیں لایا تھا۔ بیان یہ ہے کہ جب اسلام کی روشنی پھیلی اور ادھر اُدھر کے لوگ مسلمان ہونے لگے تو یہ منافق بھی اسلام لے آئے۔ لیکن اس روشنی سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تو ایسے ہو گئے جیسے روشنی پیدا ہونے کے بعد اندھے ہو جائیں ۔

۲۔ دوسری مثال ان منافقوں کی ہے جو ضعفِ ایمانی میں مبتلا تھے۔ حق کے قائل تھے مگر ایسی حق پرستی نہ تھی کہ خدا کی راہ میں سخت سے سخت مصائب و آلام کو برداشت کر سکتے۔ اندھیاری اور کڑک چمک سے مرادِ مشکلاتِ زندگی اور قسم قسم کے مصائب و آلام ہیں۔ یعنی جب کوئی آسانی کی صورت نظر آتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب کوئی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے یا ایسے احکام ان کے کانوں میں پڑتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف ہوں تو پھر جاہلیت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے اور ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ نہ آثارِ قدرت کو دیکھتے ہیں نہ رسولؐ کی بات پر کان لگاتے ہیں نہ حق بات ان کے منہ سے نکلتی ہے پھر ان کا امرِ حق پر ثابت قدم رہنا کیسے ممکن ہے ۔

ایسے لوگ اگر رسولؐ کی گواہی بھی دیں تو خدا اس کو قبول نہیں کرتا۔ وُہ کہتا ہے رسولؐ تو بے شک خدا کے فرستادہ ہیں لیکن یہ منافق جھوٹے ہیں ۔

خدا نے ہر بندہ کو فاعل مختار بنایا ہے مجبور نہیں بنایا اور اچھے بُرے دونوں راستے بھی دکھا دیے ہیں۔ عقل بھی عطا کر دی ہے۔ تجربوں کے لیے اقوامِ عالم کے حالات بھی سامنے رکھ دیے ہیں۔ اس پر بھی لوگ اگر ایمان والے نہ بنیں اور اعمالِ صالحہ بجا نہ لائیں تو ان کا ٹھکانہ سوائے جہنم کے اور کہاں ہو سکتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں گروہوں میں قرآن کی پوری پوری ہدایت صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہو سکتی ہے جو متقی کہلاتے ہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کا سائبان تیار کیا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے پھل پھلاری پیدا کی جو تمہارا رزق بنے۔ پس تم کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ اور تم یہ سب باتیں جانتے ہو۔

ہم نے اپنے بندہ (محمدؐ) پر جو کچھ نازل کیا ہے (قرآن) اگر تمہیں اس کے بارہ میں شک ہے (کہ یہ خدا کا کلام ہے یا نہیں) تو صرف ایک سورت اس جیسی بنا لاؤ۔ اگر تم سچے ہو اپنے دعویٰ میں تو خدا کو چھوڑ کر اپنے جتنے گواہوں کو چاہو بُلا لو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتّھر ہوں گے اور جو کافروں کے لیے مہیّا کی گئی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو عبادت یعنی ادائے شکر کا حکم دیا ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ عبادت کا مستحق کیوں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ دوسرے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا کہ اس پہ آرام سے اٹھو بیٹھو اور آسمان کو سائبان بنایا۔ تیسرے آسمان سے مینہ برسا کر تمہاری روزی کا سامان کیا یعنی پھل اور غلہ پیدا کیا تو پھر تمہارا فرض ہے اور عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ الخ عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا وہ اپنے سوا دنیا بھر کے اہلِ زبان کو گونگا

جانتے تھے لیکن جب قرآن نازل ہُوا تو اس کی اعجازی فصاحت و بلاغت اور محاسنِ کلام پر نظر کر کے وہ حواس باختہ ہو گئے۔ کلامِ الٰہی کی فوقیت و برتری کا سکّہ تو دل پر بیٹھ چکا تھا مگر عرب کی عصبیت چونکہ ان کی تمام ذہنی صلاحیتوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی لہٰذا یہ کہنے سے کہ یہ کلامِ خدا ہے ان کی زبان میں چھالے پڑتے تھے۔ حقیقت سے دُور ہو کر قیاس آرائیوں پر کمر باندھی۔ کسی نے کہا جادُو ہے۔ کسی نے کہا قصصِ پارینہ کا مجمُوعہ ہے۔ کسی نے کہا ایک مردِ عجمی نے رسولؐ کے پاس آ کر یہ سب باتیں ان کو لکھوا دی ہیں۔ کسی نے کہا یہ سب دل کی گڑھی ہوئی باتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سب جھگڑے چھوڑ کر صرف ایک بات کہی اور مختصر سی کہی۔ اگر تمہارے نزدیک یہ کلام اللہ کا کلام نہیں کسی بشر کا ہے اور رسولؐ اس کے مدّعی ہیں کہ اللہ کا ہے تو ان کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کونسی بڑی بات ہے ایک ایسا ہی سورہ بنا لاؤ۔ تم تو اپنے آپ کو بڑا فصیح و بلیغ سمجھتے ہو۔ تمہارے نزدیک ایسا کرنا اگر سہل ہے تو ایک دو نہیں دس بیس نہیں ہزار دو ہزار نہیں بلکہ جن و انس سب مل کر اس قرآن کا جواب لکھنے بیٹھ جاؤ۔ یہ چیلنج جیسے اس وقت تھا آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ عرب کے ناخدایانِ سخن کی ایک دو بار نہیں کئی بار غیرت جوش میں آئی۔ موسمِ حج میں ہزارہا لوگوں کے مجمع میں یہ اقرار بھی کیا کہ اگلے سال جب آئیں گے تو جوابات کا پلندہ لے کر آئیں گے۔ مگر باوجود پُورا سال گزرنے کے ایک چھوٹا سا سورہ بھی نہ بن سکا۔ اگر بنا لیتے تو رسولؐ کی رسالت خود بخود باطل ہو جاتی مگر بن سکتا ہوتا تو باطل ہوتی۔ کتنی لڑائیاں حضرت رسولِ خداؐ سے کفّار و مشرکین نے لڑیں جس میں ہزارہا مشرک مارے گئے اور بے شمار بضاعت ضائع ہوتی۔ اگر ایک سورہ بنا لاتے تو آگ کے شعلوں یعنی تلوار کی دھاروں سے کھیلنے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔

قرآنِ کریم کی یہ تحدّی اپنے اندر اتنا زور لیے ہوئے تھی کہ صاف صاف لفظوں میں اپنے مخالفوں کو بتا دیا کہ تم ایسا نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس یقین کے ساتھ قرآن کے سوا کسی نے اپنے کسی دعویٰ کو پیش نہیں کیا۔ مشرکین سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تم ہرگز قرآن کے مقابل کوئی کلام نہیں لا سکتے تو جہنم کی اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں سے مراد وہ بُت ہیں جن کی عرب میں پُوجا کی جاتی تھی۔ اگر ان کو جہنم میں نہ جھونکا جاتا تو بت پرستوں کو اس کا یقین کیسے ہوتا کہ عبد و معبود، طالب و مطلوب، بُت اور بُت پرست ایک ہی درجہ میں ہیں۔ ورنہ وہ اس خیال میں رہتے کہ ہمارے معبُود ہمیں اس مصیبت میں پھنسا کر خود مزہ سے جنّت میں جا پہنچے۔ پتھر کے بُتوں کو جہنم کا ایندھن بنانا اس لیے بھی ہے کہ ان کے پجاری سمجھ لیں کہ ان میں کوئی طاقت نہ تھی۔ بعض مفسّروں نے لکھا ہے کہ پتھروں سے مراد گندھک جیسے پتھر ہیں جو آگ بھڑکانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

(اے رسولؐ) ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو خوشخبری دو کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب اُنہیں ان باغات کا کوئی میوہ کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی میوہ ہے جو پہلے بھی ہمیں کھانے کو مل چکا ہے کیونکہ ان کو ملتی جلتی صورت اور رنگ کے میوے ملا کریں گے اور ان کے لیے صاف ستھری بیبیاں ہوں گی اور یہ لوگ اس باغ میں ہمیشہ رہیں گے بے شک خدا مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر حقیر چیز کی مثل بیان کرنے میں حیا نہیں کرتا۔ پس جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وُہ بہ یقین جانتے ہیں کہ ان کے پروردگار کی طرف سے یہ مثل بالکل ٹھیک ہے اور جو کافر ہیں وُہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ مثل بیان کرنے سے خدا کا کیا مقصد ہے؟ ایسی ہی مثالوں سے خدا اکثر کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور ایسی ہی مثل سے بہتوں کو ہدایت کرتا ہے۔ گمراہی میں چھوڑتا ہے تو ایسے بدکار لوگوں کو جو خدا کے عہد و پیمان کو مضبوط ہو جانے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جن تعلقات کو اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قطع کر دیتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے پھرتے ہیں۔ یہ ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔

ان آیات میں چند باتوں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے :

۱۔ جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس کے گھنے درخت زمین پر چھائے ہوئے ہوں۔ اگرچہ جنّت کے باغوں کے پھلوں کے

نام وہی ہیں جو یہاں ہیں جیسے سیب، انار، خرما وغیرہ لیکن بھُول کر بھی یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ ایسے ہی ذائقہ کے ہوں گے جیسے ہم یہاں کھاتے ہیں۔ وہاں کی نعمتوں کی تعریف ایک حدیث میں یوں ہے لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ فِيْ قَلْبِ بَشَرٍ (نہ کسی آنکھ نے ایسے پھل دیکھے ہوں گے نہ کانوں نے ان کی تعریف سنی ہو گی اور نہ کسی کے دل میں ان کے صفات گزرے ہوں گے۔)

۲۔ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۔ اکثر مفسّرین نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ پاکیزہ عورتیں وہاں ملیں گی۔ حالانکہ ازواج جمع زوج کی ہے، جس کا اطلاق شوہر و زوجہ دونوں پر ہوتا ہے پس اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو مرد نیک ہیں اور ان کی بی بیاں بھی نیک ہیں تو وہ بیبیاں وہاں اپنے شوہروں کو مل جائیں گی اور اگر بیبیاں بد ہیں تو ان کے بدلے مردوں کو دوسری نیک بیبیاں ملیں گی۔ اسی طرح اگر شوہر بد تھے تو عورتوں کو پاکیزہ شوہر ملیں گے۔

۳۔ جب مخالفین اسلام نے قرآن میں مچھر، مکھی اور مکڑی کی مثالیں سُنیں تو ان کو مذاق اڑانے کے لیے ایک شگوفہ ہاتھ آیا۔ کہنے لگے یہ عجیب اللہ کی کتاب ہے جس میں مچھر، مکھی اور مکڑی جیسی حقیر و ذلیل مخلوق کا ذکر ہے۔ وہ کیا سمجھتے کہ اللہ نے ان حقیر اور چھوٹے چھوٹے جانوروں میں اپنی کیسی کیسی حیرت انگیز اور محیر العقول صنعتوں کو ودیعت فرمایا ہے۔ مچھر کے متعلق اہلِ سائنس اور ماہرینِ علم الحیوانات نے جو تحقیق کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اعضا ہاتھی جیسے عظیم الجثہ جانور میں ہیں وہی خدا کی مچھر جیسی چھوٹی مخلوق میں ہیں۔ اس کی سونڈ ہاتھی کی سی سونڈ ہے۔ جس کے اندر دو آلے اور ہیں۔ ایک سوئی جسے وہ جسم میں چبھوتا ہے دوسرے نلکی جس سے وہ خون چوستا ہے اور یہ کام اتنی جلدی کر لیتا ہے کہ آدمی کا ہاتھ اس تک پہنچنے سے پہلے وہ خون پی کر اُڑ جاتا ہے۔ یہی وہ سب سے نرالا دشمن ہے کہ جب حملہ کرنے کے لیے آتا ہے تو پہلے آواز دے کر آگاہ کر دیتا ہے۔ انسان کی طاقت نہیں کہ اس کے حملہ کو روک سکے یہ ہمیشہ جسم کے نرم حصّہ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے جثہ میں اس بلا کا زہر ہے کہ اس کے اثر سے بیشمار بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض ایسی مہلک ہوتی ہیں کہ انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ افریقہ کے مچھر جو معمولی مچھروں سے قد میں موٹے ہوتے ہیں، اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کے کاٹتے ہی سارا بدن ورم آلود ہو جاتا ہے اور جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق کی کوئی مثل بیان کرے تو اس کو بیان کر کے کیوں شرمائے اور لوگوں کو اس پر اعتراض کیوں ہو۔

۴۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا کے یہ معنی نہیں کہ اللہ کا کلام انہیں گمراہ کرتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ایسی مثلیں بیان کر کے وہ ایسے لوگوں کو جو عقل و فہم سے دُور ہیں گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور یہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو فاسق و فاجر ہوں۔ لیکن جو خدا کے نیک بندے ہیں وہ ایسی مثلوں سے ہدایت پاتے ہیں۔

یہ فاسق وہی لوگ ہیں جو اللہ سے عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس صلۂ رحم کا اس نے حکم دیا ہے اُسے قطع کر دیتے ہیں اس بدکرداری اور حق ناشناسی سے سراسر اُن ہی کا نقصان ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع

تم ذات باریؑ کا انکار کیسے کرتے ہو درآنحالیکہ تم پیدائش سے پہلے مُردہ تھے یعنی معدُوم شے تھے۔ اللہ نے تم کو زندہ کیا یعنی عدم سے وجود میں لایا۔ نیست سے ہست کیا۔ اس کے بعد پھر تمہیں مار ڈالے گا۔ قیامت میں پھر تمہیں زندہ کرے گا اور تم مر کر اس کی طرف آؤ گے (ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد بھی تم اپنے رب اور خالق کے وجود کا انکار کرتے ہو، ذرا سوچو) اللہ وہی تو ہے جس نے رُوئے زمین کی تمام پیداوار کو تمہارے لیے پیدا کیا (یعنی تمہاری بقا کے لیے جتنی چیزیں ضروری تھیں، وُہ زمین سے اُگائیں اور تمہارے استعمال کے قابل بنائیں۔ اس کے بعد اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک ثبوت اور دیتا ہے وہ یہ کہ) اُس نے سات آسمان بنائے اور ان کو ہموار و مستحکم بنایا اور وُہ ہر شے کا جاننے والا ہے (ایسی حالت میں جبکہ وہ تمہارے ہر قول و فعل کو جانتا ہے، تمہیں اس کی نافرمانی کی جرأت کیسے ہوتی ہے)۔

سماء کے متعلق مختلف زمانوں میں اقوامِ عالم کے مختلف نظریات رہے ہیں۔ صدیوں یونانیوں کا یہ نظریہ داخلِ معتقدات رہا کہ آسمان طبق در طبق ہیں اور کسی سخت مادے کے بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں خرق والتیام کے متعلق سخت بحثیں چھڑیں پھر یہ نظریہ اٹھارھویں صدی میں بدل گیا اور یہ طے کر لیا گیا کہ یہ بلندیاں سیاروں کی گردش کے اعتبار سے ہیں اور جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے وہ ایک لطیف مادّہ ہے جس کو ایتھر کہتے ہیں۔ ہر سیّارہ جس مدار پر گردش کرتا ہے اُسے فلک کہتے ہیں۔ پہلے سات فلک مانے جاتے تھے۔ پھر جب سے یورینس اور نیپچون دو سیارے اور معلوم ہوئے تو ان کی تعداد نو ۹ ہو گئی۔ سات سیاروں کے ساتھ عرش و کرسی کو شامل کر کے مسلمانوں کا علمِ ہیئت بھی جدید تحقیق کے ساتھ ہو گیا۔ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ زمین کے علاوہ مافوق میں جو کچھ بھی ہے وہ سبع سماوات ہی ہے۔ ان کے متعلق نظریات جو کچھ ہوں ہمیں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَي الْمَلٰۗىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِــُٔـوْنِىْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اے رسولؐ! جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا میں رُوئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کیا تو ایسے کو بنائے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے۔ ہم تو تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی کا اقرار کرتے ہیں۔ خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔ خدا نے آدمؑ کو تمام اسماء تعلیم کر دیئے پھر اُن (کے مُسمّیات) کو ملائکہ پر پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان کے نام مجھے بتاؤ۔ انھوں نے کہا تیری ذات پاک اور قابلِ تسبیح ہے ہمارے پاس تو اتنا ہی علم ہے جتنا تُو نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ تُو تو بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ پھر خدا نے آدمؑ سے کہا، تم ان کے نام بتاؤ۔ جب آدمؑ نے ان کے نام بتا دیئے تو فرمایا (اے ملائکہ) کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھُپی ہوئی باتوں کا جاننے والا ہوں اور ان چیزوں کو بھی جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھُپاتے ہو۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو اُنھوں نے سجدہ کر لیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔ انکار کیا اور تکبّر کیا اور وُہ کافروں میں سے ہو گیا۔ (یعنی تکبّر ایک ایسی چیز ہے جو ہر متکبّر کی ناک رگڑوا دیتا ہے اور اس کا کیا کرایا سب خاک میں مِل جاتا ہے۔)

ان آیات میں بہت سی چیزیں قابلِ وضاحت ہیں :

۱- اِنِّیْ جَاعِلٌ الخ یہ جملہ اسمیہ ہے جو دوام و ثبات پر دلالت کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ بنانے کا کام ہمیشہ اللہ سے متعلق رہے گا اور جاعل اسم فاعل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایک زمانہ میں نہیں بلکہ قیامت تک ہر زمانہ میں خلیفہ بنانا خدا ہی کے یدِ قدرت میں رہے گا۔

۲- خلیفہ کے معنی جانشین اور نائب کے ہیں پس جو خدا کا نائب ہو کر زمین پر آئے گا سمجھ لیجئے کہ وہ کن صفات کا مالک ہوگا اور اس کے اندر کتنی قوت ودیعت کی گئی ہوگی اور عام آدمیوں سے وہ کتنا ممتاز ہوگا۔ اس کے اندر وہ ضرور کوئی ایسی قوت رکھے گا جو عام آدمیوں میں نہ پائی جاتی ہو۔ اسی کو رُوحِ نبوتی کہتے ہیں۔

۳- خلیفہ زمین بنانے کا ذکر ملائکہ سے کیوں کیا گیا۔ کیا ملائکہ سے اُسے مشورہ لینا تھا؟ ہرگز نہیں، اس کو نہ کسی مشیر کی ضرورت ہے نہ وزیر کی۔ پھر ایسا کیوں ہوا۔ بات یہ ہے کہ جب سے آدم کا پتلا بنا تھا ملائکہ کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ اسی کو روئے زمین کی سلطنت سونپی جائے گی اور اسی کو خلیفۃ الارض بنایا جائے گا۔ لہٰذا اس آرزو نے ان کے دل میں چٹکی لی کہ جب ہم آدم سے بہتر ہیں تو یہ عہدہ ہم ہی کو کیوں نہ ملے۔ یہ خواہش وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو اس چھپے ہوئے بھید کو ظاہر کرنا اور ان پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ خلافتِ ارضی کے لیے تم اہل نہیں لہٰذا آدم کی خلافت کا مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا۔

۴- ملائکہ چونکہ مزاج شناسِ قدرت تھے لہٰذا اپنی خواہش ظاہر کرنے کے لیے ایک نہایت بلیغ اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ یعنی صاف طور سے یہ نہیں کہا کہ ہمیں خلیفہ بنا دے بلکہ پہلے اپنے حریف کی مذمت کی کہ یہ فسادی اور خون ریزی کرنے والا ہے پھر اس کے ساتھ اپنی تسبیح و تقدیس کرنے کا ذکر چھیڑا تاکہ فوقیت ثابت ہو جائے۔

۵- ملائکہ کو قبل از وقت کیسے پتہ چلا کہ آدمؑ اور ان کی اولاد مفسد و سفاک ہوگی۔ ابھی تک کوئی عملی حیثیت ملائکہ کی نظر کے سامنے نہ تھی۔ ملائکہ نے یہ نتیجہ اس بنا پر نکالا تھا کہ جب آدم کے اندر قوتِ شہوی اور قوتِ غضبی کو داخل ہوتے دیکھا تو سمجھ گئے کہ قوتِ شہوی کا تقاضا چونکہ بعض چیزوں کو اپنی طرف کھینچنا ہوگا لہٰذا ضرور باعثِ فتنہ و فساد بن کر رہے گی اور قوتِ غضبی کا تقاضا ہوگا کہ انسان غصہ میں آپے سے باہر ہو کر خونریزی پر آمادہ ہو۔

۶- خدا نے ان کی اس خواہش کو ایک مختصر سے جواب کے ساتھ رد کر دیا کہ تم وہ باتیں نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ یعنی تم نے آدم کے طبعی اثرات کے ایک پہلو پر جو تخریبی ہے اپنی نظر کو جما دیا ہے اور اس کے دوسرے پہلو پر جو اصلاحی ہے غور ہی نہیں کیا۔ تمہاری نظر صرف آدم کے پیکرِ مادی پر گئی۔ اس رُوحِ نبوتی پر نہ گئی جو تمام خواہشات پر کنٹرول کرنے والی ہوگی۔ دوسرے بنی آدم پر حکومت کرنے کے لیے اسی نوع کی کوئی فرد ہونی چاہیئے۔ تم جنسِ غیر ہو لہٰذا وہ تم سے مانوس نہیں ہو سکتے اور اس صورت میں منشائے ہدایت فوت ہو جائے گا۔ اگر ہم تم میں سے کسی کو خلیفۃ الارض بناتے تو اس کو بھی جامہ بشری ہی میں بھیجتے نہ کہ ہیئتِ ملکی میں۔ تیسرے استحقاقِ خلافت میں جو چیز (تسبیح و تقدیس) تم نے پیش کی ہے وہ کافی نہیں کیونکہ اس کے لیے بڑے علم کی ضرورت ہے اور تمہارا علم محدود ہے۔ جو کام تم میں سے کسی کے متعلق کیا گیا ہے ہم نے صرف اسی کے متعلق اس کو علم دیا ہے اور ہمارا خلیفہ وہ ہوگا جو روئے زمین کی تمام مخلوق کے متعلق علم رکھتا ہو ورنہ وہ خلافت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ جو بادشاہ اپنی رعایا کے حال سے ناواقف ہو وہ ان پر حکومت کیسے کر سکتا ہے۔

چوتھے تمہاری تکلیف اور ہے اور بنی آدم کی اور، تمہاری عبادت ایک مخصوص دائرہ کے اندر ہے اور بنی آدم کے دائرہ عبادت میں بڑی توسیع ہے۔ پانچویں تمہاری معرفت ایک مقام پر ٹھہری ہوئی ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی اور بنی آدم کی معرفت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس بنا پر وہ تم سے افضل ہوں گے۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔

۷- اس خیال سے کہ غالباً میرے مجمل جواب سے تسکین نہ ہو مزید توضیح یوں کی گئی: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ آدم کو تمام نام تعلیم کر دیئے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ اسلام کے تمام مفسرین تو یہ لکھ رہے ہیں کہ روئے زمین پر جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سب کے نام ایک ایک کر کے آدم کو بتا دیئے گئے تاکہ جب زمین پر جائیں تو کسی چیز کا نام معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ لیکن یہ تفسیر ایک عقلمند انسان کیونکر قبول کر سکتا ہے جس کی چند وجوہ ہیں :

(۱) کیا نام بتا دینے سے کسی چیز کی شناخت بھی ہو جاتی ہے اگر میں کسی سے کہوں نئی ایجادات میں ٹیلی ویژن بھی ہے تو کیا یہ نام بتانے سے وہ ٹیلی ویژن کو پہچان لے گا جبکہ اس سے پہلے اس نے کبھی نہ دیکھا ہو۔

(۲) روئے زمین پر تو خدا کی بیشمار مخلوق ہے ہر ایک کی جنس جُدا ہے نوع جُدا ہے۔ نوع کے افراد جُدا ہیں۔ افراد کے رنگ روپ اور خصوصیات جُدا ہیں تو پھر یہ سبق کب تک پڑھایا گیا ہوگا۔ کیا انسانی حافظہ میں اتنی جان ہے کہ وہ ان سب ناموں کو یاد رکھ سکے۔

(۳) اگر ہر چیز کا نام خدا نے بنایا ہے تو لازم آتا ہے کہ وہی نام دنیا میں رائج ہونے چاہیئں حالانکہ وہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ اگر صرف آدمؑ کو تمام اسما تعلیم بھی ہوئے ہیں تو کیا اُن کی اولاد کو بھی وہی نام بتائے گئے پھر کیا وجہ ہے کہ ہر زبان میں اشیا کے نام مختلف ہیں۔

(۴) اس سے فائدہ کیا تھا۔ اگر آدمؑ زمین پر آ کر ان چیزوں کے نام خود ہی وضع کر لیتے تو کیا خرابی پیدا ہوتی اور خدا کے بتائے ہوئے ناموں کی نگہداشت کرنا کن فوائد پر مبنی سمجھا جائے۔

(۵) اس غلط خیال کی تردید ثُمَّ عَرَضَهُمْ کے بیان میں آ رہی ہے جس سے ہمارے دعوٰی کی پُوری پُوری تائید ہو گی۔

رفعِ شبہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدمؑ کو نام بتائے تھے اگر ملائکہ کو بھی بتا دیئے جاتے تو آدمؑ کی طرح وہ بھی بتا دیتے۔ اس کے دو جواب ہیں: اوّل یہ کہ تعلیم کسی کونہ گوشہ میں تو ہوئی نہ تھی۔ کھُلی نُورانی فضا میں لبِ قدرت سے آواز نکلی تھی ملائکہ بھی سُن رہے تھے اور آدمؑ بھی۔ دوسرے ملائکہ یہ نام جن کا ذکر آگے آئے گا پہلے سے سُنے ہُوئے تھے۔ البتہ آدمؑ نئی مخلوق تھے، ان کے کانوں میں یہ نام ابھی تک نہیں پڑے تھے۔

۸- اگر ملائکہ کو پہلے سے یہ نام معلوم نہ ہوتے تو ان سے کیوں کہا جاتا کہ ان کے نام بتاؤ۔ عَرَضَهُمْ میں هُمْ کی ضمیر بتاتی ہے کہ جن مسمیات کے نام پوچھے جا رہے تھے وہ ذوی العقول میں سے تھے۔ غیر ذوی العقول کے لیے عربی میں لفظ ھَا آتا ہے نہ کہ ھُمْ۔ یہیں سے مفسرین کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ آدمؑ کو روئے زمین کی تمام چیزوں کے نام بتائے گئے تھے۔ بلکہ کچھ مخصوص ہستیاں تھیں جن کے نام بتائے گئے۔ اگر تمام روئے زمین کی چیزوں کے نام بتائے گئے ہوتے اور پھر ان تمام کے مسمیات کو حاضر کر کے ان کے نام پُوچھے جاتے تو قیامت کا منظر سامنے آ جاتا۔ ساری مخلوق ہی اپنی اپنی بولیاں بولتی اور فضائے قدس میں دوڑ دھوپ کرتی۔

۹- اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ سے واضح کر دیا گیا کہ ملائکہ کا دعوٰی فضیلت غلط تھا۔ خلیفہ خدا کی فضیلت علم سے ہوتی ہے نہ کہ صرف تسبیح و تقدیس سے۔

۱۰- اسما اور مسمیات کا معاملہ یہاں کیوں چھیڑا گیا۔ ملائکہ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خلیفۃ الارض بننے کی اہلیت ان میں نہیں ہے۔ محمدؐ و آلِ محمدؑ کے انوارِ مقدسہ کو زیرِ عرش ملائکہ برابر دیکھتے چلے آ رہے تھے اگرچہ ان کے نام نہیں جانتے تھے لیکن ان کے نورانی پیکروں کو نظر میں ضرور لیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے اور ان کے نام بتا کر پوچھا بتاؤ ان میں سے محمدؐ کس کا نام ہو سکتا ہے اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کس کا۔ ملائکہ میں چونکہ قوتِ استنباط نہ تھی یعنی مقدمات کو ترتیب دے کر نتیجہ اخذ کرنا نہیں جانتے تھے لہٰذا آثارِ نورانیہ سے یہ پتہ نہ چلا سکے کہ فلاں کا نام محمدؐ ہے فلاں کا علیؑ ہے۔ آدمؑ کے اندر جو روحِ نبوتی تھی اس میں یہ قوت موجود تھی لہٰذا انھوں نے بتا دیا کہ جس کا نام محمدؐ ہے وہ یہ ہیں جن کا نام علیؑ ہے وہ یہ ہیں۔ ملائکہ کو یہ بتا دیا گیا کہ چونکہ تم میں قوتِ استنباط نہیں لہٰذا تم خلیفۃ الارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے جو شخص اس قوت کا مالک ہوگا وہ فساد و خونریزی سے بچا رہے گا۔

۱۱- ملائکہ کو بڑا غرّہ اس بات پر تھا کہ تسبیح و تقدیس کی بنا پر ان کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔ ان کے اس خیال کو یوں برطرف کیا گیا کہ محمدؐ و آلِ محمدؑ کے انوارِ مقدسہ دکھائے گئے اور ان پر یہ ظاہر کیا گیا کہ جس شجرہ طیبہ کی جڑ بوجود مادی آدم ہیں اس کے پھل پھول انوارِ مقدسہ ہیں ان کو پہچانو اور بتاؤ یہ کب سے تسبیح و تقدیس الٰہی کر رہے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے: اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ اٰدَمَ بِتِسْعَةِ الٰافِ عَامٍ (میں اور علیؑ ایک نور سے پیدا کیے گئے ہیں خلقتِ آدم سے نو ہزار برس پہلے)۔ صحابہؓ نے پوچھا حضورؐ، آپ اس زمانہ میں کہاں تھے۔ فرمایا، کُنَّا اَشْبَاحًا مِنْ نُوْرٍ تَحْتَ عَرْشِ اللّٰهِ نُسَبِّحُهٗ وَنُقَدِّسُهٗ سَبَّحْنَا فَسَبَّحَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ بِتَسْبِيْحِنَا لَوْلَا نَحْنُ مَا عُرِفَ اللّٰهُ وَلَوْلَا نَحْنُ مَا عُبِدَ اللّٰهُ (ہم ایک نور کا پرتو تھے، عرشِ الٰہی کے نیچے خدا کی تسبیح و تقدیس کر رہے تھے ہم نے تسبیح کی تو ہماری تسبیح سے ملائکہ نے تسبیح کرنا سیکھی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو لوگوں کو اللہ کی معرفت نہ ہوتی اور اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔

اولادِ آدم میں چونکہ یہ حضرات بھی ہیں لہٰذا ان کو پیش کر کے ملائکہ کو بتایا گیا کہ ان کی تسبیح و تقدیس کے مقابل تمہاری تسبیح و تقدیس ہے کیا تم نے جو کچھ سیکھا انہی سے نہیں سیکھا۔ پس خدا نے یہ بتایا کہ اے میرے ملائکہ، میں ایسوں کو خلیفۃ الارض بنانے والا ہوں تم ان کا کیا مقابلہ کر سکتے ہو۔ وہ تمہارے استاد ہوں گے اور تم ان کے شاگرد ہو گے۔ بنی آدم میں فساد و خونریزی کرنے والوں کی ہدایت کے لیے میں ایسے لوگوں کو بھیجتا رہوں گا۔ پس جو مان جائیں گے ان کے لیے اجرِ بے حساب ہے جو نہ مانیں گے ان کے لیے دردناک عذاب مہیا ہے۔

۱۲- جب یہ قضیہ فیصل ہو گیا اور ملائکہ نے اپنی شکست مان لی تو پھر ان سے کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ ان سب نے سجدہ کر لیا سوائے ابلیس کے وہ اکڑ گیا اور کہا میں سجدہ نہیں کروں گا۔

یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ اگر تعظیمی سجدہ جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی معصوم مخلوق کو سجدہ کرنے کا ہرگز حکم نہ دیتا۔

۱۳- ملائکہ نے بالاجماع استحقاقِ خلافت پیش کیا تھا لیکن ان کا اجماع نص کے مقابل قابلِ قبول نہ ہوا۔ حالانکہ وہ سب معصوم تھے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نص کے مقابل اجماع کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

خلاصہ: اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفہ خدا میں حسبِ ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) اس کو عام آدمیوں سے علیحدہ ایک روح القدس یا روحِ نبوتی دی جاتی ہے جس سے اس کا براہِ راست خدا سے تعلق ہو جاتا ہے وہ اس کے ذریعہ سے خدا سے احکام لیتا ہے اور بندوں تک پہنچاتا ہے یعنی وہ خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ پیغام رسانی بن جاتا ہے۔

(۲) اس کا علم وہبی ہوتا ہے یعنی وہ براست خدا سے حاصل کرتا ہے۔

(۳) تمام ابنائے روزگار پر اس کو فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

(۴) تمام ابنائے روزگار پر اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔

(۵) اس کی قوتِ استنباط کبھی غلط نتیجہ اخذ نہیں کرتی۔

۱۴- كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ - یعنی شیطان خلیفۂ خدا کو سجدہ نہ کرنے کے باعث کافروں میں سے ہو گیا۔ اس سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ خلافتِ الٰہیہ کا انکار کرنے والے کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔ ان میں سب سے پہلا انکار کرنے والا ابلیس ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ شیطان از قسم جن تھا پس جس طرح اس نے انکارِ خلافتِ آدم کیا تھا اور جنات نے بھی کیا تھا۔ لیکن یہ بات کان کو نہیں لگتی۔ خلیفۂ خدا کا انکار کرنے والے صرف جنات ہی نہ تھے بلکہ آدمیوں میں بھی بہت سے تھے۔

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ہم نے کہا اے آدم، تم اور تمہاری بی بی جنت میں رہو اور اس میں بفراغت کھاؤ پیو مگر اس درخت کے پاس بھی نہ جانا ورنہ تم اپنا نقصان کر بیٹھو گے۔ تب شیطان نے آدم و حوّا دونوں کو دھوکا دے کر ڈگمگا دیا اور آخر جس عیش و راحت میں وہ دونوں تھے اس سے نکال باہر کیا۔ ہم نے کہا اے آدم و حوّا، اب تم نیچے جاؤ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوگا اور وہیں تمہارے لیے ایک خاص وقت تک ٹھہراؤ اور ٹھکانہ ہے۔

پھر آدم نے اپنے ربّ سے معافی کے چند الفاظ سیکھے پس خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ بیشک وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور جب ہم نے ان کو اُترنے کا حکم دیا تھا تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو اس کی پیروی کرنا کیونکہ جو لوگ میری ہدایت پر رہیں گے تو روزِ قیامت نہ تو ان کے لیے خوف ہوگا، اور نہ رنج۔ اور یاد رکھو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

آدمؑ اور جنّت کے بارے سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں :

۱۔ وہ کونسی جنت تھی جس میں آدمؑ رہے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ جنّتِ خُلد تو نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں جاکر پھر نکلنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوسرے وہ اعمالِ صالحہ کی جزا میں ملتی ہے، آدمؑ سے ابھی اعمال متعلق ہی نہ ہوئے تھے پھر جزا کیسی۔ تیسرے جس جنّت میں سانپ اور مور جیسے حرام گوشت جانور پائے جائیں وہ جنّت مُخلد نہیں کہی جا سکتی۔ چوتھے جنّتِ خُلد میں کوئی ایسا درخت نہیں ہو سکتا جس کا پھل کھانا اس درجہ مضرت رساں ہو کہ آدم و حوّا کے بدن کا لباس جنت اُتر پڑے۔ جنّتِ خُلد میں تو ایسی چیزوں کا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔

علمائے اسلام کی تحقیق یہی ہے اور عقل بھی یہی بتاتی ہے کہ وہ جنّتِ ارضی تھی اور کسی اُونچے مقام پر تھی۔ آدم کو عارضی طور پر اس میں رکھا گیا تھا۔ اصلی مقام تو ان کا سطحِ زمین ہی تھا۔ اگر پھل کھانے کا واقعہ پیش نہ آتا تو کچھ دنوں وہاں اور رہ سکتے تھے۔

۲۔ ایک درخت اس جنّت میں ایسا بھی تھا جس کے پاس جانے سے منع کیا گیا تھا۔ یہ نہی تحریمی نہ تھی یعنی اس درخت کا پھل کھانا ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس خیال سے روکا گیا تھا کہ اس کے کھانے سے ان کے نفسوں کو نقصان پہنچ جائے گا اور پھر اس جنّت میں رہنے کے قابل نہ رہیں گے۔ اسے یوں سمجھئے جیسے ایک طبیب کسی مریض سے کہے کہ آپ روٹی نہ کھائیے گا ورنہ آپ کو نقصان پہنچے گا۔ روٹی مریض پر حرام نہ تھی مگر موجودہ حالت اس کے کھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ گیہوں کھانا اگر حرام ہوتا تو یقیناً ان کی اولاد پر بھی حرام ہوتا۔ کیونکہ جو چیز نبی پر حرام ہوتی ہے وہ اس کی امت پر بھی حرام ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ جنت کی فضا اس غذا کے لیے سازگار نہ تھی۔ جیسے ہماری زمین کے بعض خطّے ایسے ہیں کہ وہاں بعض غذائیں سازگار نہیں ہوتیں۔ ان کے کھانے سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اجنبی آدمی اگر وہاں چلا جائے تو لوگ اس مضر غذا کے کھانے سے روکتے ہیں۔

۳۔ اس جنت میں جو غذائیں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوّا کے لیے مہیا کی تھیں وہ ایسی ہی تھیں جیسی جنت الخُلد میں جنت والوں کو کھانے کے لیے ملیں گی۔ آدم و حوّا وہی کھاتے تھے اور ویسا ہی لباس پہنتے تھے جو جنت الخُلد والوں کا ہوگا۔ لیکن اس جنت میں ایک درخت ایسا بھی تھا جس کا پھل مادی غذا کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ غالباً یہ آدم کی آگاہی کے لیے ہوگا کہ جب زمین پر اُترو گے تو وہاں ایسی غذا ملے گی۔ یہاں اس کو نہ کھانا یہاں کی فضا اس کے لیے سازگار نہیں۔

۴۔ شیطان ملعون نے ورغلا کر وہ پھل ان کو کھلا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے بخواہش خود اس پھل کو کھانے کی طرف رغبت نہیں کی بلکہ شیطان نے وہ چکنی چپڑی باتیں کیں کہ وہ اس کے بہکانے میں آگئے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی لڑکے سے ماں باپ کہیں کہ دوڑ کر نہ چلو گر پڑو گے مگر ایک دوسرا لڑکا اسے دوڑ کر چلنے کی ترغیب دلائے اور وہ دوڑتے ہوئے گر پڑے تو اگرچہ یہ دوڑنا حرام نہیں تھا مگر جو گر پڑنے کا فطری نتیجہ تھا یعنی گھٹنوں کا ٹوٹنا اس سے بچ نہیں سکتا۔ آدمؑ نے تو خوشی سے نہ کھایا بلکہ بہکانے سے کھایا مگر جو اس کا

فطری نتیجہ تھا وہ تو ظاہر ہو کر رہا۔ جنت سے نکالا جانا کسی فعلِ حرام کے جرم کی سزا نہ تھی بلکہ اس غذا کے کھانے کا نتیجہ تھا۔ لیکن بہرحال اگر گناہ نہ تھا تو ترکِ اولیٰ تو ضرور تھا۔ اگر گناہ ہوتا تو اس کے بعد خلافت کے عہدہ سے ان کو ضرور ہٹا دیا جاتا۔

۵۔ آدم خلیفۃ الارض تو اسی وقت کہلائے جب وہ زمین پر آئے۔ یہاں آنے کے بعد ان پر شیطانی تسلط نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ خلیفۂ خدا معصوم ہوتا ہے۔ رہی اس اوپر والی دنیا کی بات تو وہاں کے معاملات ہی کچھ اور ہیں۔ ہمیں ان کے سمجھنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ ہر جگہ کا قانون جُدا گانہ ہے۔

۶۔ مثل مشہور ہے نیکوں کی نیکیاں خدا کے مقرب بندوں کے گناہ سمجھے جاتے ہیں۔ جتنا کسی وزیر یا امیر کو بادشاہ سے زیادہ تقرب ہوتا ہے اتنا ہی اسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ترکِ اولیٰ خدا کے نزدیک تو ضرور گناہ کہا جا سکتا ہے لیکن ہم لوگوں کی شریعت میں ایسے امور قابلِ سزا نہیں ہوتے۔ انبیاؑ و ائمہ سے صدورِ گناہ ناممکن ہے مگر ترکِ اولیٰ بلحاظ فطرتِ بشری ہو جاتا ہے تو اس کی وہ معافی مانگا کرتے ہیں اور توبہ و استغفار کیا کرتے ہیں۔

۷۔ **قُلْنَا اهْبِطُوْا** (ہم نے ان سے کہا اترو) اس کے یہ معنی لینے غلط ہیں کہ آسمان پر سے انہیں اترنے کا حکم دیا گیا۔ بلکہ کسی بلند مقام سے نیچے اترنے کو بھی **هبط** کہا جاتا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل جب ایک کھانا کھاتے اکتا گئے اور انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا خدا سے دعا کیجئے کہ وہ زمین سے اُگنے والی چیزیں ہمیں دے یعنی ساگ پات۔ ککڑی۔ لہسن۔ مسور اور پیاز وغیرہ تو ان سے کہا گیا **اِهْبِطُوْا مِصْرًا** (تم کسی شہر کی طرف اُتر جاؤ) جس سے معلوم ہوا کہ وہ کسی اُونچے مقام پر تھے جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ لہٰذا حکم ہوا کہ کسی ہموار زمین پر جاکر ان چیزوں کو حاصل کرو۔

۸۔ یہ جنت کہاں تھی؟ اس کو کوئی نہیں بتا سکتا۔ بہت سی چیزیں ہیں جو نظرِ خلائق سے چھپا دی گئی ہیں — جیسے چشمۂ آبِ حیات۔ سکندر ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار۔ یاجوج و ماجوج۔ اصحابِ کہف وغیرہ۔

جب آدمؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو زمین پر آکر بہت روئے۔ خدا کو ان کی حالت پر رحم آگیا اور ان کو چند کلمات کے ذریعے توبہ کرنے کی تعلیم دی۔ چنانچہ جب ان کا واسطہ دے کر حضرت آدمؑ نے دعا کی تو ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ وہ کلمات کیا تھے؟ تمام شیعی تفاسیر میں اور تفسیر دُرِّ منثور کی جلد اوّل میں ہے کہ انھوں نے **محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ** کا واسطہ دے کر دعا کی تھی۔ یہی وہ خدا کے محبوب بندے تھے جن کے نام آدمؑ کو بتائے گئے تھے اور مسمیات کو دکھایا گیا تھا۔

انسان کی اشرفیت کو تمام مخلوق نے تسلیم کرلیا ہے سوائے شیطان کے وہ اس دنیا میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی تدبیر سے اس کو ذلیل کرے اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کو تباہ و برباد کردے۔

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿٤٥﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿٤٦﴾

اے بنی اسرائیل میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں تم پر پہلے کر چکا ہوں، تم میرے عہد و پیمان (ایمان) کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے عہد (ثواب) کو پورا کروں گا۔ اور تم بس مجھ سے ڈرتے رہو اور جو (قرآن) میں نے نازل کیا ہے وہ اس کتاب (توریت) کی بھی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ پس تم سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیوی فائدہ) نہ لو۔ اور مجھی سے ڈرتے رہو اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جو حق بات ہے اُسے نہ چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور جو لوگ عبادت کرنے کے لیے جھکتے ہیں تم بھی اُن کے ساتھ جھکا کرو۔ تم اور لوگوں سے تو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم کتابِ خدا کو برابر رٹا کرتے ہو تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (اور مصیبت کے وقت) صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔ البتہ نماز دوبھر تو ہے مگر ان خاکساروں پر نہیں جو بخوبی جانتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور ضرور اس کی طرف اُن کو لوٹ کر جانا ہوگا۔

بنی اسرائیل کے معنی ہیں اسرائیل کی اولاد۔ اُسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی نام ہے۔ اس کے معنی ہیں بندہ اور ایل کے معنی ہیں اللہ، یعنی اللہ کا بندہ۔ بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد کہلاتی ہے جو تمام عرب میں پھیلی ہوئی تھی انہی کو یہودی کہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب قوم تھی جس میں نیک بندے بھی سب سے زیادہ تھے اور بد بندے بھی سب سے زیادہ۔ انبیاء و

مرسلین کی زیادہ تعداد اسی قوم میں ہوئی اور اسی قوم پر رات دن سخت سے سخت عذاب بھی آتے رہے۔

قرآن میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ ان یہودیوں سے متعلق ہے جو پہلے گزر چکے ہیں۔ چونکہ ان کی اولاد انہی کے راستے پر گامزن ہے اور انہی کے معتقدات پر عمل کر رہی ہے لہذا ان سے خطاب کر کے ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلائے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بیشمار نعمتیں اس قوم کو دیں مثلاً کتاب۔ حکمت۔ ملکِ عظیم۔ عزت۔ دولت وغیرہ اور نیکوکاروں کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ بھی کیا لیکن یہ سب بھول گئے اور خدا کا ڈر ان کے دل سے نکل گیا۔ قرآن مجید کے کتابِ خدا ہونے سے انکار کر دیا حالانکہ توریت کی وہ تصدیق کر رہا ہے۔ سب سے پہلے جنہوں نے حضرت رسولِ خدا کی رسالت اور قرآن سے انکار کیا وہ یہودی ہی تھے جبکہ پہلی کتابوں میں وہ آنحضرتؐ اور قرآن کے متعلق سب کچھ پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے توریت میں تصرف کرنا شروع کیا اور لوگوں سے پیسے لے کر اس کی آیات کو بدلا۔ اور اس تجارت میں خوب خوب کمایا۔ خوفِ خدا ان کے دل سے نکل گیا تھا وہ باطل پرستی کے جنون میں حق بات کو چھپا لیتے تھے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ان کی کارروائی بالکل غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو نصیحت فرما رہا ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو۔ یہودیوں نے اپنی نماز سے رکوع نکال دیا ہے یہ خصوصیت صرف اسلامی نماز کی ہے۔

بنی اسرائیل کی یہ عادت تھی کہ جب دوسروں سے معاملہ کرتے تو اپنے حق میں نیکی چاہتے۔ انصاف کے طالب ہوتے۔ لیکن جب اپنی باری آتی تو عدل و انصاف اور حق پسندی سب بھول جاتے۔ اللہ تعالیٰ اسی کو یاد دلا رہا ہے اور بعض تفسیروں میں یہ بھی ہے کہ مدینہ کے بعض یہودی اور لوگوں سے تو کہا کرتے تھے کہ مسلمان ہو جاؤ لیکن خود نہیں ہوتے تھے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ یعنی یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ صبر کے ساتھ محنت کرو اور حرام کھانا چھوڑ دو اور مسلمانوں کی طرح صحیح طریقہ سے نماز پڑھو۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام سے منقول ہے کہ صبر سے مراد روزہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نماز روزہ سخت ہیں مگر ان لوگوں کے لیے نہیں جو خدا سے عاجزی کرنے والے اور ڈرنے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ سچے دل سے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾

اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے پہلے تم کو دی ہیں اور میں نے تم کو تمام عالموں پر فضیلت دی تھی۔ تم اس دن سے ڈرو جس میں ایک شخص کسی دوسرے کا نہ تو فدیہ ہو سکے گا اور نہ اس کی طرف سے کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ وہ مدد پہنچائے جائیں گے (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تمہیں (تمہارے بزرگوں کو) قومِ فرعون کے پنجہ سے چھڑایا تھا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دے کرستاتے تھے تمہارے لڑکوں پر چھری پھیرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے صبر کی بڑی آزمائش تھی۔ (اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔ پھر ہم نے تم کو تو نجات دی اور فرعون کے آدمیوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل پر جو بیشمار احسانات کیے تھے ان کو یاد دلا کر یہ بتانا چاہتا ہے کہ کیا میرے احسانات کا یہی بدلہ ہے کہ تم میرے دین کا صحیح راستہ چھوڑ کر میرے نافرمان بندے بنے رہو۔ یاد کرو میں نے روحانی اور مادی ہر طرح کی نعمتیں تمہیں دیں افسوس ہے کہ تم ان سب کو بھول گئے۔ میں نے تم کو تمام عالموں پر فضیلت دی۔

اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ۔ میں عالمین سے مراد اس زمانہ کی تمام اقوام ہیں نہ کہ قیامت تک ہونے والی اقوام۔ نہ ان کو مسلمانوں پر فضیلت حاصل تھی نہ ان کے پیغمبروں کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (بقرہ)۔ ہم اللہ کی اولاد ہیں اور اس کے دوست ہیں۔ لہٰذا خدا ہم کو عذابِ جہنم کی سزا نہ دے گا اور اگر دے گا تو چند روز۔ ہمارے انبیاء ہمیں عذابِ آخرت سے بچا لیں گے۔ ان کے اس غلط عقیدہ کی تردید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے جو کچھ سمجھا ہے غلط سمجھا ہے۔ یاد رکھو قیامت کے دن نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی کا فدیہ لیا جائے گا اور نہ گناہ کا بدلہ کسی چیز سے ہو سکے گا اور نہ وہاں ایک دوسرے کی مدد کر سکے گا۔ لہٰذا باپ دادا کی تقلید میں نجات کا راستہ اپنے اوپر بند نہ کرو۔ اور ہمارے رسولؐ پر اور ہماری آخری کتاب (قرآن) پر ایمان لے آؤ۔

جناب موسیٰؑ کے زمانے میں مصر میں دو قومیں آباد تھیں۔ بنی اسرائیل اور قبطی۔ جب حضرت یوسفؑ مصر میں بادشاہ ہوئے تھے تو انھوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو مصر میں لا بسایا تھا۔ اس زمانہ میں قبطی قوم کی حکومت تھی اور فرعون بادشاہ تھا۔ مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ فرعون ایک خر دماغ انسان تھا۔ اپنی وسعتِ سلطنت کو دیکھ کر اپنی خدائی کا مدعی بن بیٹھا۔ کہتا تھا میں تم سب کا ربِ اعلیٰ ہوں۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ تم سب کو روزی دینے والا ہوں اور تمہاری مشکلات کا حل کرنے والا میں ہوں۔ اس کی قوم نے اس کی خدائی کو تسلیم کر لیا تھا۔ بنی اسرائیل بھی حضرت موسیٰؑ کی ولادت سے قبل اس کے جال میں پھنس چکے تھے۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ بیت المقدس سے آگ کا ایک ایسا شعلہ نکلا جس نے مصر کے سارے گھر جلا کر خاک کر دیئے۔ جب نجومیوں سے تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا۔ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیری سلطنت کو تہس نہس کر دے گا اور تیری ہلاکت کا باعث ہو گا۔ اس وقت سے فرعون بنی اسرائیل کا جانی دشمن بن گیا اور اس نے یہ احکام جاری کیے کہ بنی اسرائیل میں جو عورت حاملہ ہو اس پر پہرہ بٹھا دیا جائے۔ اگر لڑکا پیدا ہو تو اس کو فوراً ذبح کر دیا جائے اور اگر لڑکی ہو تو

اس کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ جب فراسیانی ہو تو اس سے لونڈیوں کی طرح خدمت لی جائے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ نہ تابِ نغتی نہ رفتے ماندن۔ نہ مصر چھوڑ کر کہیں جا سکتے تھے اور نہ وہاں امن و سکون سے رہ سکتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے پہلے فرعون دس ہزار بچوں کو قتل کرا چکا تھا۔ مگر جس کو خدا سلامت رکھے اُسے کون مار سکتا ہے موسیٰؑ، فرعون ہی کے گھر پلے بڑھے اور اُسے ذرا پتہ نہ چلا کہ میرا جانی دشمن میرے گھر میں ہے۔ جب نجومیوں نے یہ خبر دی کہ وہ بچہ پیدا ہو چکا تب وہ قتل سے باز آیا۔

الغرض وہ وقت بھی آ گیا کہ موسیٰؑ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے۔ فرعون نے ان کا پیچھا دبایا۔ دریائے نیل کو معجزانہ طور پر بنی اسرائیل تو پار کر گئے۔ لیکن جب فرعون مع اپنی فوج کے داخل ہوا تو ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ چونکہ یہ قصہ آگے بہت تفصیل کے ساتھ آئے گا لہٰذا یہاں صرف اتنے ہی بیان پہ اکتفا کی جاتی ہے۔

اب ان آیات میں چند اسرار و غوامض پر غور کیجئے:

۱۔ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جو مصیبت نازل ہوئی تھی وہ خدا کی طرف سے امتحان تھا۔ خدا تو رحمٰن و رحیم ہے اس نے بنی اسرائیل کا ایسا سخت امتحان کیوں لیا اور بے وجہ ان کو ان مصائب و آلام کے شکنجہ میں کیوں کھینچا ــــ جواب یہ ہے کہ یہ سزا تھی بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کی۔ انھوں نے انبیاء و مرسلین کی ہدایات کو یکسر پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ ان میں خدا پرستی کی جگہ بت پرستی آ گئی تھی۔ وہ فرعون کی خدائی پر ایمان لے آئے تھے۔ لہٰذا فرعون کے ہاتھوں جو مصیبت سالہا سال ان پر آتی رہی یہ سب ان کے کرتوتوں کی سزا تھی۔ ان کی گمراہی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب موسیٰؑ ان کو دریا پار کرا کے دوسرے کنارہ پر پہنچے تو وہاں انھوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ چھوٹے بڑے خوبصورت بتوں کو سامنے رکھے پوجا کر رہے ہیں۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ سے ہٹ ماری کہ ہمیں بھی ایسے بت بنوا دیجئے۔ جس قوم کا موسیٰؑ جیسے ہادی کے ساتھ رہ کر یہ حال ہو، سمجھ لیجیے کہ اس سے پہلے ان کی گمراہی کس حد تک پہنچی ہو گی۔ بنی اسرائیل پہ خدا کا یہ اتنا بڑا احسان تھا کہ انھیں عمر بھر نہ بھولنا چاہیئے تھا مگر چونکہ ان کی طبیعتیں شرک و کفر سے پوری طرح مانوس ہو چکی تھیں لہٰذا وہ خدا کے ہر احسان کو بھلا بیٹھے۔

۲۔ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ فرعون کے اولاد نہ تھی لہٰذا آلِ فرعون سے مراد فرعون کی قوم ہے۔ پس جب یہ معلوم ہوا کہ آل کا لفظ قوم پہ بولا جاتا ہے تو آلِ رسولؐ اور آلِ محمدؐ سے بھی مراد تمام مسلمان ہوئے نہ کہ وہ مخصوص لوگ جن کو شیعہ اہلبیتؑ کہتے ہیں ــــ جواب یہ ہے کہ جو الفاظ مشترک المعنی ہوتے ہیں ان کے معنی کا تعین بلحاظ سیاق و سباق اور شواہد و حالات کیا جاتا ہے اور روایت کے ساتھ درایت کی کسوٹی پر بھی پرکھا جاتا ہے۔ چند مثالوں پر غور کیجئے: تابوت سکینہ جس میں انبیاء کے تبرکات تھے قرآن میں اس کا تذکرہ یوں ہے۔ فِیْهِ بَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ (بقرہ) اس میں بقیہ تھا اُن تبرکات کا جو اولادِ موسیٰؑ و اولادِ ہارونؑ نے چھوڑے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اولاد نہ تھی۔ پس اگر یہاں آلِ موسیٰؑ سے مراد قومِ موسیٰؑ لی جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تمام قومِ موسیٰؑ کے تبرکات اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس صندوق میں صرف موسیٰؑ و ہارونؑ اور اولادِ ہارونؑ کے تبرکات تھے۔ جیسے عمامہ موسیٰؑ و ہارونؑ۔ قمیص موسیٰؑ و ہارونؑ کفشِ موسیٰؑ۔ ردائے موسیٰؑ وغیرہ ــــ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سورۂ آلِ عمران میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ

وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ - (اللہ نے انتخاب کر لیا آدمؑ و نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمرانؑ کو تمام عالموں میں سے) اگر آل کے معنی قوم ہو تو یہ معنی ہوئے کہ تمام اولادِ ابراہیمؑ و اولادِ عمرانؑ کا اصطفا کیا گیا۔ چونکہ عقلاً و نقلاً یہ باطل ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اولادِ ابراہیمؑ اور اولادِ عمرانؑ سے پوری قوم مراد نہیں بلکہ مخصوص افراد مراد ہیں جو اولادِ ابراہیمؑ و عمرانؑ سے تھے۔

۳۔ اگر آلِ رسولؐ سے مراد تمام امتِ رسولؐ ہو تو پھر رسول کی طرح تمام امت پر صدقہ حرام ہونا چاہیئے حالانکہ اسلام کے تہتر فرقوں میں سے کسی ایک فرقہ کا یہ عقیدہ نہیں۔ پھر درود میں بھی ساری امت کو شریک ہونا چاہیئے اور اسی طرح وجوبِ اطاعت میں بھی

۴۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ رسولؐ کے چونکہ اولادِ ذکور میں سے کوئی نہ تھا لہٰذا آلِ رسولؐ امتِ رسولؐ ہی ماننا پڑے گی ——— اہلبیتِ رسولؐ بنصِ قرآنی آلِ رسولؐ ہیں جیسا کہ آیہ مباہلہ سے ظاہر ہے اور حضورؐ نے ایک حدیث بیان فرما کر اس غلط فہمی کو دُور کر دیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ ذُرِّیَّۃَ کُلِّ نَبِیٍّ فِیْ صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ صُلْبِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔ یعنی اللہ نے ہر نبی کی اولاد اس کے صلب میں قرار دی ہے اور میری اولاد صلبِ علیؑ سے ہے۔ اسی بنا پر کفار و مشرکین کا یہ طعنہ غلط تھا کہ معاذ اللہ حضورؐ ابتر ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ آلِ موسیٰؑ سے مراد اولادِ ہارونؑ ہے۔ بس آلِ فرعون سے یا تو اس لیے قوم مراد ہے کہ وہ ساری قوم کو اپنی اولاد سمجھتا تھا۔ یا آلِ فرعون سے مراد اس کے خاندان والے ہیں جو برسرِ اقتدار تھے لہٰذا ان کے ڈوبنے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا۔

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۲﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۳﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۴﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۶﴾

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا تھا اور تم لوگوں نے ان کے جانے کے بعد ایک بچھڑے کو پرستش کے لیے خدا بنا لیا حالانکہ تم اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے پھر بھی ہم نے اس کے بعد تم سے

درگزر کی تاکہ تم شکر کرو (اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ کو کتاب توریت عطا کی اور حق و باطل کا جدا کرنے والا قانون عطا کیا تاکہ تم ہدایت پاؤ (اور وہ وقت بھی یاد کرو تم) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑے کو خدا بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے تو اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تم اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور وہ یہ ہے کہ اپنے کو قتل کر ڈالو۔ تمہارے خدا کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ پھر جب تم نے ایسا کیا تو خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ظاہر بظاہر خدا کو ہمیں نہ دکھا دو۔ اس پر تمہیں بجلی نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے۔ پھر تمہیں مرنے کے بعد ہم نے زندہ کر اٹھایا تاکہ تم شکر کرو۔

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان احسانات کا ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر ہوتے رہے تھے۔

۱۔ جب فرعونی مظالم سے نجات پا کر بنی اسرائیل صحرائے سینا میں جو ایک لق و دق مقام تھا پہنچے تو اب اس کی ضرورت تھی کہ ان کی معاشرتی ترقی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے لیے خدا کی طرف سے کوئی قانون نازل ہوتا کہ وہ آئے دن کے فتنہ و فساد سے محفوظ رہیں خدا نے اس قانون (توریت) کو دینے کے لیے موسیٰؑ کو کوہِ طور پر بلایا اور وعدہ کیا کہ چالیس دن میں یہ کتاب تم کو مل جائیگی مفسرین لکھتے ہیں کہ پہلے تیس۳۰ دن کا وعدہ تھا۔ موسیٰؑ روز خدا سے ہمکلام ہوتے تھے۔ ہر دن روزہ رکھتے تھے ایک دن خیال آیا کہ روزہ دار کے منہ سے بدبو آیا کرتی ہے لہٰذا اس کے دُور کرنے کے لیے ایک درخت کی پتی جو خوشبودار تھی منہ میں رکھ لی۔ خدا کو یہ بُرا معلوم ہوا۔ اس نے کہا اے موسیٰ روزہ دار کے منہ کی بدبو ہمارے لیے ہر خوشبو سے بہتر ہے تم نے یہ کیا کیا۔ لہٰذا اب کفارہ میں دس روز اور توریت ملنے کا انتظار کرو۔ چنانچہ تیس۳۰ دن کے چالیس۴۰ دن ہو گئے۔ یہ ہے ہمارے مفسرین کی روایت پرستی، جو کچھ کسی سے سُنا لکھ مارا۔ بھلا ایک پتی منہ میں رکھ لینے کا اتنا بڑا کفارہ کیوں ہوا۔ بات یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے ایمان کی آزمائش مقصود تھی کہ حکمِ خدا کو کس حد تک مانتے ہیں۔ بے شک موسیٰؑ نے قوم سے تیس دن غائب رہنے کو کہا تھا لیکن جب تیس دن بعد نہ آئے تو ان کو یقین کر لینا چاہیئے تھا کہ قدرت نے دس دن کے لیے روک لیا ہے لیکن وہاں تو یہ غضب آیا کہ بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور سمجھ لیا کہ موسیٰؑ کا خدا طور کی بجائے اس بچھڑے کے اندر بول رہا ہے۔

قدرت نے اس گمراہی کی ایسی سخت سزا دی کہ جو لوگ ایمان پر قائم رہے تھے ان کے ہاتھوں سے رات کے وقت ان مشرکین کو قتل کرایا جو بچھڑے کے پجاری بنے ہوئے تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ فعل اس لیے ہوا تاکہ قتل کرنے والا اپنے کسی عزیز کو پہچانے نہیں۔ قتل ہونے والے گردن جھکائے بیٹھے تھے اور ایمان لانے والوں کی تلواریں اُن کے سرتن سے اڑاتی چلی جا رہی تھیں۔

۲۔ جب طور پر حضرت موسیٰؑ جانے لگے تھے تو قوم نے ہٹ ماری کر خدا سے کہنا اپنے کو کھلم کھلا دکھا دے ورنہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے ہر چند سمجھایا کہ وہ ذات پاک قابلِ رویت نہیں مگر وہ ضدی اور ہٹی کہاں ماننے والے تھے۔ کہنے لگے

اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہم آپ کو مار ڈالیں گے۔ مجبور ہو کر حضرت موسیٰؑ نے درخواست کی۔ جواب ملا، ہرگز تم مجھے نہیں دیکھو گے۔ میں ایک بجلی چمکاتا ہوں اگر تم اس کے دیکھنے کی تاب لا سکے تو مجھے بھی دیکھ لو گے۔ چنانچہ اس کے چمک مارتے ہی موسیٰؑ تو غش کھا گئے۔ طور جل گیا۔ اس قصّہ کو کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ یہاں چونکہ مختصر ہے لہٰذا ہم نے بھی اختصار اختیار کیا ہے۔

ان آیات کے معاملہ میں چند باتوں پر غور کیجئے:

(۱) موسیٰؑ چند روز کے لیے طور پر گئے تھے پھر بھی قوم کی ہدایت کے لیے حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ بنا کر گئے۔ پس کیسے ممکن تھا کہ حضورؐ سرورِ انبیاء بغیر اپنا جانشین بنائے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے۔

(۲) قومِ موسیٰ نے موسیٰؑ کے وصی و جانشین کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور گئو سالہ پرست بن گئے۔ یعنی اپنے قدیمی مذہب کی طرف جو بت پرستی تھا لوٹ گئے۔

(۳) حضرت موسیٰؑ نے قوم کی تشدد پسندی سے مجبور ہو کر رویت باری تعالیٰ کے متعلق وہ سوال کیا جو ان کو نہ کرنا چاہیے تھا۔ اسی کو تقیہ کہتے ہیں۔ ایک نبی کبھی رویت باری تعالیٰ کا قائل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجبوری دوسری چیز ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۵۷﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾ ع

اور ہم نے تم پر اَبر کا سایہ کیا اور تم پر مَن و سلویٰ اتارا اور (یہ بھی کہہ دیا تھا) جو صاف ستھری روزیاں ہم نے تم کو دی ہیں۔ انہیں شوق سے کھاؤ تو ان لوگوں نے نافرمانی کر کے ہمارا تو کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ بلکہ اپنی جانوں پر ستم ڈھایا (اور وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے کہا کہ اس گاؤں (اریحا) میں جاؤ اور اس میں جہاں چاہو رغبت سے کھاؤ پیو اور دروازہ پر سجدہ کرتے ہوئے اور زبان سے حطّۃ (بخشش) کہتے ہوئے آؤ تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور ہم نیکی کرنے والوں کی نیکی بڑھا دیں گے تو جو بات ان سے کہی گئی تھی اُسے شریروں نے بدل کر دوسری بات کہنی شروع کر دی تب ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے شرارت کی تھی ان کی بدکاری کی وجہ سے آسمانی بلا نازل کی۔

ان آیات کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ جب موسیٰؑ مصر سے لے کر اپنی قوم کو نکلے تھے تو لاکھوں آدمی تھے۔ خدا نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم قوم عمالقہ سے لڑو گے تو ہم تم کو سلطنت عطا کریں گے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے ہر چند اُبھارا۔ جوش دلایا مگر ان پر بزدلی ایسی غالب آئی کہ کسی طرح لڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اسی بنا پر صحرائے سینا میں چالیس برس تک بھٹکتے پھرے۔ وہاں تھا کیا لق و دق صحرا، یہ لاکھوں آدمی کہاں سر چھپاتے۔ مکانوں کا کیا ذکر جھونپڑیاں بھی نہ تھیں، درختوں کا سایہ بھی نہ تھا۔ جب کڑی دھوپ پڑتی تو بلبلا جاتے اور موسیٰؑ سے کہتے، خدا سے دُعا کیجئے کہ وہ اس دھوپ سے ہمیں بچائے ورنہ ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب جناب موسیٰؑ نے دعا کی تو آسمان پر بادل چھا گئے اور ان کی جانیں ہلاکت سے بچیں۔ اس کے بعد کھانے کا سوال پیدا ہوا۔ خدا نے ان پر پھر رحم کھایا۔ اور مَن و سلویٰ نازل ہونے لگا۔ جب پھر شرارت پر کمر باندھی تو وہ بھی موقوف ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی اس سرگشتگی کے زمانہ میں وفات پائی۔ ان کے بعد حضرت یوشعؑ پیغمبر ہوئے۔ ان کے سمجھانے بجھانے سے ان لوگوں نے عمالقہ پر حملہ کیا اور کئی شہر بھی فتح کیے۔ ان کو حکم تھا کہ جب پہلا شہر فتح کرو تو حطّۃ (بخشش) کہتے ہوئے شہر میں داخل ہو مگر شرارت تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے حطّۃ کی بجائے حنطہ (گیہوں) کہنا شروع کیا۔ اس شرارت کی سزا میں طاعون پھیلا اور چوبیس پچیس ہزار آدمی مر گئے اور فتح کیا ہوا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔

وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۶۰﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۶۱﴾ ع

جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو۔ پس اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ان میں سے ہر گروہ نے اپنے اپنے گھاٹ کو پہچان لیا (ہم نے ان سے کہا کہ) اللہ کے رزق کو کھاؤ پیو، لیکن رُوئے زمین پر فساد کرتے نہ پھرو۔ (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا اے موسیٰؑ ہم ایک کھانے پر (من وسلویٰ) پر صبر نہیں کر سکتے آپ اپنے رب سے دُعا کیجیے کہ وُہ ہمیں زمین سے اُگی ہوئی چیزیں دے ساگ پات کھیرا، ککڑی لہسن مسُور اور پیاز۔ موسیٰؑ نے کہا (بے وقوفو!) کیا اچھی چیز کو اس سے بدلتے ہو جو ادنیٰ قسم کی ہے (اچھا اگر یہی چاہتے ہو) تو کسی شہر میں اُتر پڑو۔ وہاں جو کچھ تم چاہتے ہو موجود ہو گا۔ آخر ان پر رسوائی اور محتاجی کی مار پڑی اور ان لوگوں نے قہر خدا کی طرف پلٹا کھایا۔ یہ سب اس لیے ہُوا کہ وہ لوگ خدا کی نشانیوں سے انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق شہید کرتے تھے اور اس بنا پر بھی کہ وہ نافرمانی اور سرکشی میں حد سے بڑھ گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل اپنی نافرمانی کی بنا پر وادیٔ تیہ میں جو لق ودق جنگل تھا محصُور ہو گئے تو ان کو کئی پریشانیوں کا سامنا ہُوا۔ پہلے یہ کہ کوئی سایہ کی جگہ نہ تھی۔ کڑی دھوپ میں بلبلائے جاتے تھے۔ خدا نے ان پر رحم کیا اور بادل ان کے سروں پر سایہ فگن ہو گیا دوسری چیز کھانے کی تکلیف، وہ اللہ نے من وسلویٰ نازل کر کے دُور کی۔ اب تیسری تکلیف پانی کی تھی۔ کسی تاریخ یا تفسیر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ موسیٰؑ کے دُعا کرنے سے پہلے تک پانی کا انتظام کیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کنوئیں کھودے گئے ہونگے بہر حال موسیٰؑ کے پتھر پر عصا مارنے سے چشمہ پھوٹ نکلا۔ مگر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے وہ بھلا ایک چشمہ سے کیسے پانی پی سکتے تھے۔ آپس میں جھگڑا شروع ہُوا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ایک چشمہ سے بارہ دھاریں بہا دیں اور ہر ایک گروہ نے ایک ایک دھار پر اپنا قبضہ کر لیا۔ جب یہ معاملہ بھی طے ہو گیا تو اب انھوں نے یہ رٹ لگانی شروع کی کہ ہم ایک ہی کھانا کہاں تک کھائے جائیں۔ یہ بمقتضائے فطرت تو صحیح تھا کیونکہ آدمی کا دل ایک ہی غذا بار بار کھاتے کھاتے اکتا جاتا ہے لیکن اس بات پر غور نہ کیا کہ ہم پر یہ مصیبت آئی کیوں ہے۔ اگر عمالقہ سے جا لڑتے اور سلطنت کے مالک ہو جاتے تو مزے سے زمین کی پیداوار کھاتے پیتے۔ یہ ذلت اور پریشانی ان کی نافرمانی کی سزا تھی۔ ان پر غضب الٰہی نازل ہوتا رہا۔ مگر وہ ایسے چکنے گھڑے تھے کہ ذرا ان پر اثر نہ ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جھٹلاتے ہی رہے اور انبیا کے قتل پر ان کی کمر بندھی ہی رہی۔ ان ظالموں کے ہاتھوں نہ معلوم کتنے انبیاء قتل ہوئے۔ چونکہ انبیاء کی بددعاؤں سے ان پر عذاب آتے تھے لہٰذا وہ بجائے خدا کا فرمانبردار بندہ بننے کے اُلٹا انبیا کو قتل کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ ﴿۶۵﴾ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۶﴾

بے شک مسلمانوں اور یہودیوں اور نصرانیوں اور لامذہبوں میں سے جو کوئی خدا اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتا ہے تو ان کے لیے ان کا اجر وثواب خدا کے پاس ہے اور (روز قیامت) ان کو نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ رنج۔ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تعمیل توریت کا تم سے اقرار لیا اور ہم نے تمہارے سروں پر کوہِ طور کو لا کر لٹکایا اور کہہ دیا کہ توریت جو ہم نے تم کو دی ہے اس کو مضبوط پکڑے رہو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ اس کے بعد پھر تم اپنے عہدو پیمان سے پھر گئے۔ بس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم نے سخت گھاٹا اٹھایا ہوتا اور اپنی قوم کے تم ان لوگوں کی حالت بخوبی جانتے ہو جو شنبہ کے دن اپنی حد سے گزر گئے (یعنی باوجود ممانعت شکار کھیلنے لگے) تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ (چنانچہ وہ بندر ہو گئے) پس ہم نے اس واقعہ کو اُن لوگوں کے لیے جن کے سامنے ہُوا تھا اور آنے والوں کے لیے عذاب قرار دیا اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت۔

پہلی آیت میں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد منافق ہیں جو بظاہر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور بہ باطن وہ دشمنانِ اسلام تھے یہودیوں اور نصرانیوں کا یہ حال تھا کہ جب تک وہ صدق دل سے توریت پر عمل کرتے رہے اور اپنے انبیاء کو مانتے رہے مومن رہے

لیکن جب وساوسِ شیطانی میں مبتلا ہو کر انھوں نے بداعمالیاں شروع کیں تو ایمان باللہ سے کوسوں دُور ہو گئے۔ صابئین سے مراد وہ لوگ ہیں جو عقلی ڈھکوسلوں سے کام لیتے تھے اور لا آف نیچر پر ہر مسئلہ میں ان کی نظر رہتی تھی۔ پس ان سب سے کہا جا رہا ہے کہ اب بھی اگر تم ہمارے رسولؐ پر اور قرآن پر ایمان لے آؤ گے تو روزِ قیامت تمہارے اعمال کا اجر ضرور ملے گا اور وہاں کے خوف اور رنج سے بچ جاؤ گے۔

جب حضرت موسیٰؑ توریت لے کر آئے اور یہودیوں نے اس کی ضخامت کو دیکھا تو کانوں پہ ہاتھ دھر کر کہنے لگے اس کا تو بوجھ بھی ہم سے نہ اُٹھے گا۔ اس پہ عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ہر چند سمجھایا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے آخر کوہ طور کو ان کے سروں پہ لٹکایا گیا جب انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر یہ ہم پہ گرا تو ہم سب اس کے نیچے دب کر مر جائیں گے۔ تب بادلِ ناخواستہ عمل کرنے کا اقرار کیا۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ۔ (طُور کو تم پر بلند کیا) مفسروں نے اس کی عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں:

(۱) طُور کا سروں پہ چھتری کی طرح آ جانا خلافِ عقل ہے وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا نہ اکھڑا۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کو ایسا معلوم ہوا گویا وہ اُن پہ جھکا آ رہا ہے۔ اس پہ کافی بحث ہم نے اپنی کتاب رموز القرآن میں کی ہے۔

(۲) بعض نے لکھا ہے کوہِ طُور اس وقت آتش فشانی کر رہا تھا۔ یہودیوں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس کی لپیٹ میں آ جائیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ طُور کی وادی میں کوہِ طُور کے سایہ کے نیچے عہد لیا گیا تھا۔

(۳) اُن کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر موسیٰؑ نے بد دعا کی اور یہ طُور ہم پہ آ گرا تو ہم مر جائیں گے۔

جو لوگ معجزاتِ انبیاءؑ کے قائل نہیں ایسی رکیک تاویلیں وہی کر سکتے ہیں۔ کاش وہ اس پہ غور کرتے کہ اگر یہ معمُولی بات ہوتی تو تنبیہ کے موقع پر اس کو ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی جس طرح یہودیوں پر اُن کی نافرمانی کی بدولت اور بہت سے عذاب آئے ان میں ایک عذاب کی صورت یہ بھی تھی تاکہ وہ اپنی سرکشی سے باز آئیں۔ طُور کے بلند کرنے سے یہ مطلب ہے کہ اس کا ایک حصّہ جُھک کر ان کے سروں پر سایہ فگن ہو گیا تھا جس سے ان کو یہ خوف پیدا ہوا کہ وہ اگر ان پر گر گیا تو ہلاک ہو جائیں گے یہ سب کچھ معجزانہ شان کے اندر تھا۔ اگر خدا کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو وہ بڑا گھاٹا اٹھاتے یعنی ان کی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتیں۔

كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ۔ اس میں بھی مفسّرین کا بڑا اختلاف ہے:

(۱) وہ آدمی سے بندر نہیں بنے تھے ورنہ مسئلہ تناسخ کا اسلام میں جواز ثابت ہوگا۔

(۲) ان کی صرف صورت بندروں کی سی ہو گئی تھی باقی جسم انسانوں کا سا رہا۔

(۳) ان کی عادتیں بندروں کی سی ہو گئی تھیں۔

(۴) موجودہ بندر انہی کی نسل سے ہیں۔

یہ سب قیاس آرائیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تناسخ تو جب ثابت ہوتا کہ ایک رُوح کسی دُوسرے بدن میں منتقل ہوئی ہوتی۔ جب رُوح ایک ہی رہے اور بدن کی ہیئت بدل جائے تو وہ تناسخ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ عادتیں

بندروں کی سی ہو گئی تھیں، یہ بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ بندروں کی سی عادتیں تو یوں بھی بہت سے آدمیوں میں پائی جاتی ہیں۔

یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ بندر انہیں بندروں کی نسل سے ہیں۔ لے سبحان اللہ، گویا اس سے پہلے بندر جیسی مخلوق موجود ہی نہ تھی۔ حالانکہ اور جانوروں کی طرح وہ بھی ہمیشہ سے ہیں۔

ہمارے ائمہ کے اقوال سے یہ ثابت ہے کہ وہ بندر بن گئے تھے۔ تین دن اسی حالت میں رہے اس کے بعد وہ مر گئے۔

یومِ سبت کا قصّہ: جس طرح ہمارے یہاں روزِ جمعہ مقدس دن ہے نصاریٰ میں اتوار، یہودیوں میں ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ یہودیوں کا ایک گروہ تھا جو مچھلیوں کا روزانہ شکار کرتا تھا، جیسے ہمارے یہاں مچھیرے روزانہ سمندر یا دریاؤں سے مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں۔ اس دوامی شکار کی وجہ سے مچھلیوں کی تعداد دریا میں روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کا اثر ان کی نسل پر پڑ رہا تھا۔ لہٰذا حکمِ خدا ہوا کہ ایک روز ان کا شکار بند رہا کرے۔ ہفتہ کے روز کوئی شکار نہ کرے۔ شرارت تو یہودیوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی یہ صورت نکالی کہ دریا کے کنارے بہت سے گڑھے کھود دیے اور ان کے اور دریا کے درمیان نالیاں بنا دیں تاکہ جب دریا کا پانی ان گڑھوں میں آئے تو مچھلیاں بھی اس کے ساتھ آ جائیں۔ سبت کی شام کو جا کر نالیوں کا منہ بند کر دیتے تاکہ مچھلیاں دریا میں واپس نہ جائیں۔ اتوار کی صبح کو ان سب کو جا پکڑتے۔ اس نافرمانی کی بنا پر ان کو بندر بنایا گیا اور بعد کو ہلاک کر دیا گیا۔

ان کی تعداد میں اختلاف ہے کسی نے سات لکھی ہے کسی نے بیس کسی نے چالیس۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انبیائے سابقین کی اُمتوں کو نافرمانی کی سزا بصورتِ عذاب فوراً یہیں دنیا میں مل جاتی تھی۔ قومِ عاد و ثمود و اصحابِ رس و اصحابِ مدین اور اصحابِ اُخدود اور امتِ موسیٰؑ کے واقعات قرآن میں پڑھ لو جو لوگوں کی عبرت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن خاتم النبیین سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام چونکہ رحمۃ للعالمینؐ بن کر آئے تھے لہٰذا ان کی امت سے یہ فوری عذاب ہٹا دیے گئے اور ان کی تمام بداعمالیوں کی سزا روزِ قیامت پر موقوف رکھی گئی۔ بداعمال مسلمانوں کو آگاہ ہونا چاہیئے کہ انہیں بے خوف ہو کر گناہ اس خیال سے نہ کرنے چاہئیں کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

ان کے سب اعمال لکھے جا رہے ہیں۔ روزِ قیامت ان سب کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ چھوٹنے کا کوئی نہیں۔ دُنیا کے عذاب سے وہ عذاب ہزاروں گنا زیادہ ہوگا۔ جو واقعات نافرمان قوموں کے بیان کیے گئے ہیں وہ طلسم ہوشربا یا الف لیلہ کے من گھڑت قصّے نہیں کہ اس کان سن کر اُس کان نکال دیے جائیں بلکہ ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ خدا سے دُعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمارے نفسوں کو شرور سے بچائے رکھے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

موسیٰ نے کہا، خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے کو ذبح کرو۔ انھوں نے کہا کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ موسیٰ نے کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہل بنوں۔ وہ بولے اچھا تم اپنے خدا سے دُعا کرو کہ ہمیں بتائے کہ وُہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ نے کہا، خدا فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ تو بہت بوڑھی ہو اور نہ بچھیا ہی ہو بلکہ ان میں سے اوسط درجہ کی ہو اور جو تم کو حکم دیا گیا ہے اُسے بجا لاؤ۔ وُہ کہنے لگے تم اپنے خدا سے دُعا کرو وہ ہمیں یہ تو بتا دے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ نے کہا، خدا فرماتا ہے وُہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے اُسے دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ پھر وُہ کہنے لگے تم اپنے خدا سے دُعا کرو کہ ہمیں یہ بتائے کہ وہ گائے اور کیسی ہو۔ وہ تو اور گاؤں میں مل جائے گی اور اب خدا نے چاہا تو ہم ضرور اس کا پتہ لگالیں گے۔ موسیٰ نے کہا، خدا فرماتا

ہے وہ گائے نہ تو اتنی سدھائی ہوئی ہو کہ زمین جوتے یا کھیت سینچے بھلی چنگی ایک رنگ کی ہو کہ اس میں کوئی داغ دھبّہ تک نہ ہو کہنے لگے اب اس کا بیان ٹھیک ٹھیک ہو گیا۔ الغرض ان لوگوں نے وہ گائے ذبح کی حالانکہ اس کی امید نہ تھی کہ وُہ ایسا کریں گے۔ جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا اور تم میں اس کی بابت پھوٹ پڑی کہ ایک دُوسرے کو قاتل بتانے لگا اور جو تم چھپاتے تھے اللہ کو اس کا ظاہر کرنا منظور تھا پس ہم نے کہا اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر اس کی لاش پر مارو، یوں خُدا مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھا دیتا ہے۔

گائے کا قِصّہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ایک عورت بہت حسین تھی۔ اس کو ایک شخص نے جس کا نام عامیل تھا اور بہت نیک اور مالدار تھا شادی کا پیغام بھیجا اور عامیل کے چچازاد بھائی نے بھی پیغام دیا۔ اس عورت نے عامیل کے پیغام کو منظور کر لیا اور شادی ہو گئی۔ اس کے چچازاد بھائی نے رشک و حسد کے غلبہ سے ایک رات عامیل کو قتل کر دیا اور اس کی لاش دوسرے محلہ کی مسجد کے دروازہ پر رکھ آیا اور خود صبح کو اس کے خون کے قصاص کا دعویٰ دار ہوا۔ اس پر بنی اسرائیل میں سخت ہنگامہ ہُوا۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کو اس کے قتل کا مجرم بناتا تھا۔ خدا کا حکم ہُوا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پہ مارو وُہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ بتا دے گا۔ پہلے تو بنی اسرائیل نے گائے ہی کے بارہ میں بہت سی کج بحثیاں کیں حالانکہ اگر حکم کے ساتھ ہی کوئی سی گائے لے کر ذبح کر دیتے تو اتنے بکھیڑے میں نہ پڑتے پھر اس کے بعد گائے کی خریداری میں بڑی شرارتیں کیں۔ آخر ایک مردِ دیندار کو خدا نے ان احمقوں سے اتنی بڑی قیمت دلوا دی کہ اس شہر کے بنی اسرائیل سب محتاج بن گئے۔ یعنی اس گائے کی کھال میں جتنا سونا آسکے۔ غرض بعد خرابیٔ بسیار ان لوگوں نے گائے ذبح کر کے ایک پارچہ مقتول پر مارا۔ وہ زندہ ہو گیا اور اُس نے اپنے چچازاد بھائی کو اپنا قاتل بتایا پھر اس کو دوبارہ عمر بھی عطا ہوئی (منقول از حاشیہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم بر قرآن مترجم)

اس قِصّہ ہی کی وجہ سے اس سورہ کا نام سورۂ بقر رکھا گیا ہے۔

معلوم ہُوا کہ گائے کے گوشت میں اتنی قوتِ حیات ہے کہ اس سے مردہ زندہ ہو سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ مسلمان گائے کا گوشت زیادہ کھاتے ہیں۔

قابلِ غور یہ امر ہے کہ اس واقعہ کے بعد مسلمانوں نے اس پر ریسرچ کیوں نہیں کی؟ مسلمان بادشاہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں سب کچھ تحقیقات کرائی۔ بڑے بڑے جیّد علما و حکما کو اپنا درباری بنا کر بہت سے علمی مسائل حل کرائے۔ لیکن آج تک اس مسئلہ کی طرف توجہ نہ کی۔ چونکہ قرآن کا بیان کیا ہُوا قصّہ ہے لہٰذا اس کی صداقت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ ضرور مردہ کو زندہ کرنے کا یہ بہترین نسخہ ہے۔ ایسی گائے جس کے صفات قرآن میں مذکور ہیں کیوں نہیں تلاش کرائی گئی۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ایسی گائے اب بھی مل جائے تو بے شک مردہ زندہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسی گائے ملے گی نہیں ورنہ موت کا آسان نسخہ انسان کے ہاتھ آجانے سے پھر کوئی مرے گا ہی نہیں۔ تاہم اس پر تو ریسرچ ہو سکتی تھی کہ ان صفات کی گائے کے گوشت میں یہ تاثیر کیوں پیدا ہوئی۔ ایسی گائیں تو بہت مل سکتی ہیں جو نہ بوڑھی ہوں نہ بچھیا، درمیانی عمر کی ہوں اور ایسی بھی مل سکتی ہیں جنہوں نے نہ کھیت جوتا

ہو نہ دھبہ چلایا ہو۔ مگر یہ بندھی رہی ہوں۔ اب جو چیز تلاش کرنے کی ہے وُہ اس کا کھلتا ہوا زرد رنگ ہے، دوسری چیز اس کے بدن پر ذرا سا بھی داغ دھبہ نہ ہونا ہے پس علم الحیوانات کے ماہرین اور محققوں کو اس پر غور کرنا چاہیئے تھا۔

یہ بھی غور کرنا چاہیئے کہ اس تمام کارروائی میں جناب موسیٰؑ کو کوئی دخل نہ تھا سب کچھ بنی اسرائیل نے خود کیا۔ خود ہی تلاش کیا اور خود ہی اسے ذبح کیا اور خود ہی پارچۂ گوشت کو مقتول پہ مارا۔ البتہ یہ سب کچھ تھا حکمِ خدا سے۔ لہٰذا جو اثر اس کے گوشت میں پیدا ہوئی وہ ایک معجزانہ شان سے نہیں ہوئی بلکہ اس غیر معمولی گائے کے گوشت کے اثر سے ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ تمام مفسرین نے اس واقعہ کو تو نقل کر دیا لیکن اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ ایسا کیوں ہوا۔

آریوں کے اخبار "مسافر" آگرہ میں سوامی دیانند سرسوتی کا ایک مقالہ مسلمانوں کے خلاف چھپا تھا۔ جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ قرآن میں گائے کے ذبیحہ کا کہیں حکم نہیں۔ مسلمانوں نے محض ہندوؤں کی دل آزاری کے لیے گاؤکشی کو جائز کر رکھا ہے۔

جواب یہ ہے کہ قرآن میں سورہ بقر کا مذکورہ بالا واقعہ بتاتا ہے کہ اگر گاؤکشی خدا کے نزدیک جائز نہ ہوتی تو وہ ہرگز بنی اسرائیل کو ذبح کرنے کا حکم نہ دیتا۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جب خدا نے اس خوبصورت اور مخصوص گائے کا ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تو عام گایوں کا ذبیحہ اس کے حکم کے خلاف کیسے ہوا۔

ایک بڑی مصلحت یہ بھی کہ بنی اسرائیل مدتِ دراز سے گائے کی عظمت اور اس کی پوجا پاٹ کرنے کی طرف مائل تھے اسی رجحان سے فائدہ اٹھا کر سامری نے ان کے ظاہری ایمان پر ڈاکہ ڈالا تھا اور بچھڑے کی پوجا کرانی شروع کر دی تھی۔ اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی چاہا کہ گائے کی عظمت کا نقش بنی اسرائیل کے دل سے مٹ جائے۔

بنی اسرائیل کے جو لوگ گائے کے متعلق حیلے حوالے کر رہے تھے وہ اس بنا پر تھے کہ وہ گائے کو ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ قرآن کہتا ہے وہ ہرگز ذبح نہ کرتے اگر ان میں کا دوسرا گروہ ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ممکن ہے اس میں بھی یہ راز ہو کہ جس یتیم بچہ کے پاس یہ گائے تھی خدا اس کو بہت بڑی قیمت بنی اسرائیل سے دلوا کر فائدہ پہنچانا چاہتا ہو۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾ أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾

خدا کی قدرت کا یہ تماشا دیکھنے کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے اور وُہ بھی پتھر کی مثل سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے پانی نکل پڑتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ پڑتے ہیں اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی خوفِ خدا سے لرز کر گر پڑتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ مسلمانو، کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہودی تمہارا سا ایمان لائیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ خدا کا کلام سُن کر اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد بھی اُلٹ پھیر کر دیتا تھا حالانکہ وُہ خوب جانتے تھے۔ یہ جب ان لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے جب آپس میں ایک دُوسرے سے ملتے جُلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو کچھ خدا نے ہم پر (توریت میں) ظاہر کر دیا ہے کیا وُہ تم مسلمانوں کو بتا دو گے تاکہ اس کے سبب سے کل تمہارے خدا کے سامنے تم پر حجت لائیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ جو کچھ چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں، اللہ وُہ سب کچھ جانتا ہے۔

اَفَتَطْمَعُونَ الخ۔ کے بعد سے مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم ان مکار یہودیوں سے یہ امید نہ رکھو کہ یہ تمہارے دین پر ایمان لے آئیں گے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ان میں کا ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا ہے اور سمجھتا بھی ہے لیکن پھر بھی اسے ادل بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔

حضرت رسولِ خدا کے زمانہ میں جب یہودی توریت میں ان آیات کو پڑھتے تھے جو حضرت رسولِ خدا کی تعریف میں تھیں تو ان میں ردّ و بدل کر دیتے تھے۔ ایک دن حضرتؐ نے یہ حکم دیا کہ اب یہودی مدینہ میں نہ آیا کریں کیونکہ ان کے آنے سے مدینہ میں روز نئے جھگڑے اُٹھتے ہیں۔ جو نومسلم ہیں ان کے دل میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ یہ حکم سُن کر یہودیوں نے دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹ موٹ اسلام قبول کر لیا۔ لیکن جب شام کو اپنے گھر لوٹے اور آپس میں ایک دُوسرے سے ملے تو دوسرے یہودی ان منافقوں سے کہنے لگے تم نے یہ کیا غضب کیا کہ مسلمانوں سے جا ملے اور مسلمانوں سے وہ باتیں بیان کر دیں جو خدا نے محمدؐ کے بارہ میں توریت میں نازل کی ہیں تو اب تو مسلمانوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا بڑا پکا ثبوت مل گیا۔ تمہیں اتنی سمجھ نہ آئی کہ دشمن کو اپنے بھید بتانا کیسی کھلی بے عقلی ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ مدینہ کے بعض یہودیوں نے مسلمانوں کو توریت کی وہ آیات سُنا دی تھیں جن میں حضرت رسولِ خدا

کی تعریف تھی۔ جب کعب اور حیّ بن اخطب کو جو یہودیوں کے سردار تھے یہ پتہ چلا تو انھوں نے ان نومسلم یہودیوں کو بہت ڈانٹا اور کہا تم کو چاہیئے تھا کہ ان باتوں کو اپنی زبان پر نہ لاتے۔ روز قیامت مسلمان انہی باتوں سے تمہارے اوپر حجت قائم کریں گے اس کے بعد یہودیوں نے توریت سے ان تمام آیات کو نکال دیا اور تحریف کردہ توریت سب کو سنانے لگے اور لوگوں سے کہنے لگے چونکہ ہماری کتاب میں محمدؐ کا کہیں ذکر نہیں لہٰذا ہم ان پر کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہودی قوم کو اسلام سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے۔ جو آج تک چلی آرہی ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ق ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ط فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ط قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيٓئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ج هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۸۲﴾ ع

ع ۹ ۱۱ ۹

اور کچھ لوگ ان میں ایسے بھی اَن پڑھ ہیں جو کتاب خدا کو اپنے مطلب کے سوا اور کچھ نہیں جانتے وہ فقط خیالی باتیں کیا کرتے ہیں۔ بس وائے ہو اُن لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ یہ اللہ کی بتائی ہوئی ہے تاکہ اس کی وجہ سے تھوڑی سی قیمت یعنی دنیوی فائدہ حاصل کر لیں۔ پس وائے ہو ان پر جو ایسی کمائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گنتی کے چند دن کے سوا ہمیں آگ چھوئے گی بھی نہیں۔ (ذرا ان سے پوچھو) کیا تم نے خدا سے کوئی اقرار لے لیا ہے کہ وہ پھر اپنے عہد کے خلاف کبھی نہ کرے گا یا بے سوچے سمجھے خدا پر طوفان جوڑتے ہو ہاں سچ تو ہے کہ جس نے برائی حاصل کی اور اس کے گناہوں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایماندار ہیں اور جنہوں نے نیک کام کیے ہیں وہ جنتی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

توریت موسیٰؑ کے بعد جب ان کے اوصیا سے نکل کر علمائے یہود کے پاس پہنچی تو انھوں نے یہ خیال کر کے کہ اگر آنحضرتؐ کا حلیہ اور ان کے اوصاف توریت میں باقی رہے تو لوگ دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگیں گے اور ہماری چودھراہٹ ختم ہو جائے گی بہ حیثیت پیشوائے دین اور عالم توریت ہونے کے جو چڑھاوے ہم پر چڑھتے ہیں ان سب سے محروم ہو جائیں گے لہٰذا انھوں نے وہ سب باتیں توریت سے نکال دیں اور لوگوں سے کہنا شروع کیا اس نبی کے متعلق ہماری کتاب میں کوئی ذکر نہیں

دوسرا سبب تحریف کا یہ ہوا کہ ان کی قوم میں جو رؤسا و امرا بدکاریاں کرتے تھے ان کے دلوں سے عذاب آخرت کا خوف مٹانے کے لیے کہہ دیا کرتے تھے آخرت میں ہم پر کوئی عذاب نہ ہوگا کیونکہ ہم اَبْنَآءُ اللّٰهِ اور اَحِبَّآءُهٗ ہیں یعنی اللہ کا کنبہ ہیں ہم پر وہ عذاب کیوں نازل کرے گا اور اگر کچھ کیا بھی تو محض چند روز کے لیے ہوگا باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔ بدکار یہ سن کر خوش ہوتے تھے اور ان کی اس تسلی کے سلسلہ میں بڑی بڑی رقوم ان کو دیتے تھے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ سلاطین و امرا حرام کاری کے جواز پر ان سے فتویٰ چاہتے تھے وہ بڑی بڑی رقمیں لے کر ان کے لیے حرام کو حلال قرار دیتے تھے۔ حضرت یحییٰؑ کے قتل کا فتویٰ ان ہی سیہ کاروں میں سے ستر علمائے نے دیا تھا اور بادشاہ سے بڑے بڑے انعام پائے تھے، پورا واقعہ حضرت یحییٰؑ کے حال میں آئے گا۔

یعنی احبار یا عالموں کا قوم پر اتنا اثر تھا کہ ان کے احکام کے خلاف کسی کی بات سنتے ہی نہ تھے۔ وہ خود توریت کو پڑھتے ہی نہ تھے بس انہی مفتیوں کے فتووں پر اُن کا دین چل رہا تھا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾

(اے یہودیو، وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے (جو تمہارے بزرگ تھے) عہد پیمان لیا تھا، کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح نرمی سے باتیں کرنا اور نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا پھر تم میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب ہی پھر گئے تھے اور تم لوگ ہو ہی اقرار سے پھرنے والے۔

اس معاہدہ کا ذکر جس طرح توریت میں تھا قرآن میں بھی والدین۔ ذوی القربیٰ یتیم۔ مسکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم ہر مسلمان کو بھی ہے۔ اس آیت میں خصوصیت سے تین گروہوں پر احسان کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے:

(۱) والدین۔ والدین کے ساتھ نیکی یہ ہے کہ تم ان کو اس کی تکلیف نہ دو کہ وہ تم سے مانگیں۔ ان کی آواز پر آواز بلند نہ کرو ان کے آگے نہ چلو۔ ان کی طرف تُند نگاہی سے نہ دیکھو۔ اگر وہ تم کو ماریں تو کہو اللہ ان کو بخش دے۔ اگر وہ تم پر غصہ ہوں تو ان کے سامنے اُف تک نہ کہو۔ اگر تم بیٹھے ہو اور وہ آئیں تو کھڑے ہو جاؤ ورنہ لعنت کے مستحق ہو گے۔

(۲) ذوی القربیٰ کے ساتھ نیکی یہ ہے کہ صلۂ رحم کرو ان کے رنج و خوشی میں شریک ہو۔ ان سے مہربانی کا برتاؤ کرو۔

(۳) یتیموں سے نیکی یہ ہے کہ ان سے نرمی کا برتاؤ کرو۔ ان کی تکلیفیں دُور کرو۔ ایسا سلوک کرو کہ ان کو ماں باپ یاد نہ آئیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم (تمہارے بزرگوں) سے یہ عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزیاں نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو شہر بدر کرنا۔ تو تم نے اقرار کیا تھا اور تم بھی (اپنے بزرگوں کے اس اقرار کی) گواہی دیتے ہو کہ ہاں (ایسا ہُوا تھا) پھر وہی لوگ تم ہو کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک جتھے کے ناحق اور زبردستی حمایتی بن کر دوسرے کو شہر بدر کرتے ہو (اور لطف تو یہ ہے کہ) اگر وہی لوگ قیدی بن کر

تمہارے پاس مدد مانگنے کو آئیں تو ان کو تاوان دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا تو پھر کیا تم کتابِ خدا کی بعض آیتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں اُن کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو اور قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی خرید کی پس نہ ان کے عذاب ہی میں کمی کی جائے گی اور نہ وہ کسی طرح کی مدد ہی دیئے جائیں گے۔

ان آیات میں آنحضرتؐ کے زمانہ کے یہودیوں کو ان کے بزرگوں کا یہ واقعہ یاد دلایا گیا ہے، مدینہ میں یہودیوں کے دو گروہ تھے، بنی قریظہ اور بنی نضیر۔ یہ دونوں آپس میں خونریزیاں کرتے رہتے تھے اور ہجرت سے پہلے مدینہ میں دو گروہ مشرکوں کے تھے۔ اوس اور خزرج۔ بنی قریظہ اوس سے مل گئے اور بنی نضیر خزرج سے اور باہم جنگ شروع کر دی۔ جس کو غلبہ ہوتا وہ مغلوب کا گھر لُوٹ لیتا اور وہ لوگ مجبوراً ترکِ وطن کر کے چلے جاتے اور جب پکڑے جاتے تو ان کو خرید لیتے۔ حالانکہ توریت کی رُو سے ان غریبوں کا وطن سے نکال دیا جانا حرام تھا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ توریت کے بعض احکام پر تو عمل کرتے تھے اور بعض پر نہیں۔

تفسیر "تنویر البیان" میں ہے کہ آیہ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ۔ الخ کے متعلق حضرت رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ یہ آیتیں بظاہر یہودیوں کے بارہ میں ہیں لیکن کیا میں ایسے لوگ بتاؤں جو اس اُمت کے یہودی ہیں۔۔ اُمت کا ایک گروہ میرے بعد مذہب پر ہونے کا دعویدار ہو گا لیکن میری اولاد کو قتل کرے گا اور میری شریعت اور سنت کو بدل دے گا۔ میرے حسنینؑ کو اس طرح قتل کرے گا جیسے یہودیوں نے یحییٰؑ و زکریاؑ کو قتل کیا تھا۔ خدا کی طرف سے ان پر ایسی ہی لعنت ہو گی جیسی ان یہودیوں پر ہوئی تھی۔

یہودی بظاہر توریت کو مانتے تھے لیکن اس کے صرف انہی احکام پر عمل کرتے تھے جو ان کی منشا اور مقصد کے موافق ہوتے تھے۔ انبیا علیہم السلام ان کے منافقانہ عمل سے سخت پریشان تھے۔ اکثر اوقات وہ ان کی تکذیب نہایت گستاخانہ لہجہ میں کرتے تھے اور صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ یہ خدا کا حکم نہیں بلکہ آپ نے اپنی طرف سے ہمارے ڈرانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک گروہ حضرت ہارونؑ سے کسی بات پر اُلجھ پڑا۔ حضرت ہارونؑ نے اس کی شکایت حضرت موسیٰؑ سے کی۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کو ڈانٹا اور کہا یاد رکھو اس کی اطاعت بھی تم پر میری اطاعت کی طرح فرض ہے۔ انھوں نے گستاخانہ انداز میں کہا خدا نے ہم کو ایسا حکم نہیں دیا بلکہ آپ نے اپنی طرف سے کہا ہے۔

کتنا مشابہ ہے یہ واقعہ حارث بن نعمان فہری کے واقعہ سے، جس نے غدیرِ خم میں حضرت علیؑ کی خلافت کے اعلان کے بعد حضرت رسولِ خداؐ سے کہا تھا کہ یہ حکم خدا کا نہیں بلکہ آپ نے اپنی طرف سے کہا ہے۔ پھر وہ بعذابِ الٰہی ہلاک ہُوا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) دی اور اس کے بعد بہت سے پیغمبروں کو ان کے قدم بقدم لے چلے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھی واضح اور روشن معجزے دیئے اور پاک رُوح (جبریل) کے ذریعہ ان کی مدد کی تو کیا تم اس قدر بد دماغ ہو گئے کہ جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس تمہاری خواہش کے خلاف حکم خدا لے کر آیا تو تم اکڑ بیٹھے۔ پھر تم نے بعض پیغمبروں کو تو جھٹلایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا اور کہنے لگے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھا ہوا ہے (ایسا نہیں) بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے خدا نے ان پر لعنت کی ہے پس ان میں سے کم لوگ ایمان لاتے ہیں جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب (قرآن) آئی اور وہ اس کتاب (توریت) کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتی ہے اور اس سے پہلے (اس کی امید پر) کافروں پر غالب آنے کی دعائیں بھی مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تھے تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ہو ان منکروں پر، کیسا بُرا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفسوں کی تسلی حاصل کرتے ہیں اور جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر دیتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے جس بندے کو چاہا نواز دیا لہٰذا اب غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور کافروں کے لیے ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو توریت دی جس میں بنی اسرائیل کے لیے قانونِ شریعت مدوّن تھا اور توریت کی تعلیم دینے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے بعد اور انبیا بھی آئے جیسے یوشعؑ۔ شموئیلؑ۔ شمعونؑ۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ شعیاؑ۔ ارمیاؑ۔ عزیرؑ۔ حزقیلؑ۔ یونسؑ۔ الیاسؑ۔ زکریاؑ۔ یحییٰؑ۔ مگر بنی اسرائیل وہ نالائق قوم تھی کہ کسی نبی کو بغیر جھٹلائے چھوڑا ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ، موسیٰؑ کے بعد صاحبِ شریعت ہو کر آئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے معجزات عطا فرمائے تھے اور رُوح القدس یعنی جبریلؑ کو ان کی مدد کے لیے معین کیا تھا۔ بعض علماء نے اس سے مراد طہارت جناب عیسیٰؑ لی ہے یعنی ان کو ہر گناہ سے پاک و پاکیزہ بنایا۔ لیکن یہودیوں نے ان کو نہ مانا۔

بنی اسرائیل کے پاس جب کوئی حکم ایسا آتا جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا تو اکثر حکم کرنے لگتے کہ صاحب ہم تو اس کو نہیں مانیں گے، خدا سے کہیئے کہ اس کو بدلے۔ اگر ان کی یہ منشا پوری نہ ہوتی تھی تو اپنے زمانہ کے نبی کو قتل کر دیتے تھے اور ساری کتاب ہی سے انکار کر دیتے تھے۔

یہودی کہا کرتے تھے کہ محمدؐ بن عبداللہ کا مصاحب جبرئیلؑ ہے وہی وحی لایا کرتا ہے اور چونکہ یہ فرشتہ ہم کو بہت تکلیف دے چکا ہے۔ ہم پر عذاب نازل کرتا رہا ہے لہٰذا یہ ہمارا دوست کیسے ہو سکتا ہے اگر کوئی اور فرشتہ وحی لاتا تو ہم ایمان لے آتے۔ اس پر خدا نے اپنے رسولؐ سے کہا کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے۔

جب قرآن اس کتاب کی جو یہودیوں کے پاس تھی تصدیق کر رہا تھا تو یہودیوں کو چاہیئے تھا کہ اسے مان لیتے لیکن وہ تو حضرتؐ کی رسالت ہی کے خلاف تھے، کیسے مان لیتے۔ توریت میں حضرتؐ کے متعلق جو پیش گوئیاں تھیں یہودی ان کی بنا پر بڑی بے چینی سے آنے والے رسولؐ کا انتظار کر رہے تھے اور توریت کی اس پیش گوئی کو بار بار کفار و مشرکین کے سامنے بیان کر کے کہتے جب اس نبی کا ظہور ہو گا تب وہ تمہاری سرکوبی کرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ آنے والا نبی، بنی اسرائیل میں سے ہو گا لیکن جب حضرتؐ کا ظہور بنی اسمٰعیل میں ہوا تو یہودی رشک و حسد سے جل مرے اور حضرتؐ کے جانی دشمن بن گئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ

اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع

جب ان سے کہا گیا کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں ہم تو اسی پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر یعنی بنی اسرائیل پر نازل کیا گیا ہے اس کے علاوہ جو آیا اس کے ماننے سے وُہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اے رسول، ان سے کہو اگر تم اپنے قول میں سچے ہو (اور تعلیم توریت پر ایمان لانے والے ہو) تو اللہ کے پیغمبروں کو جو بنی اسرائیل ہی میں ہوئے تم قتل کیوں کرتے رہے۔ تمہارے پاس موسیٰ واضح اور روشن معجزات لے کر آئے پھر بھی ان سے پیٹھ موڑ کر گئو سالہ پرستی کرنے لگے۔ بات یہ ہے تم ہو ہی ظالم۔ اور وُہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے سروں پر طور کو ہم نے بلند کیا تھا اور تمہیں تاکید کی تھی کہ جو ہدایتیں ہم کر رہے ہیں ان کی پابندی سختی سے کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمہارے بزرگوں نے کہا ہم نے سُن لیا مگر ہم مانیں گے نہیں اور ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں گھول کر پلا دی گئی تھی۔ اے رسول، ان سے کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تمہیں بہت بُرا حکم دیتا ہے اور یہ بھی کہہ دو کہ اگر سب لوگوں کو چھوڑ کر اللہ کے نزدیک دارِ آخرت خاص کر تمہارے ہی لیے ہے تو اگر اس قول میں سچے ہو تو ذرا تمنائے موت تو کرو چونکہ یہ پہلے سے اپنی بداعمالیاں بھیج چکے ہیں لہٰذا ہرگز ہرگز یہ موت کی تمنا نہ کریں گے اور اللہ تو ظالموں کے حالات کا خوب جاننے والا ہے۔ تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے یہ تو اس معاملہ میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کئی ہزار برس جئے لیکن یہ لمبی عمر اُن کو عذاب سے تو نہیں بچا سکتی اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ وہ سب دیکھ رہا ہے۔

جب یہودیوں سے رسولؐ کی رسالت اور قرآن کے مُنزل من اللہ ہونے پر ایمان لانے کو کہا جاتا تو کہتے ہم تو صرف اسی کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری قوم پر نازل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہم نہ کسی کتاب پر ایمان لائیں گے نہ کسی نبی پر۔ ہمارا دین بھی سچا اور ہمارے

رسول بھی سچے۔ خدا کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ اگر تم اپنی کتاب کی تعلیم کو ماننے والے تھے اور انبیا کو سچا جانتے تھے تو پھر ان کو قتل کیوں کرتے تھے۔ اگر تم موسیٰؑ پر ایمان لا چکے تھے اور اپنے اس ایمان میں سچے تھے تو جب چند روز کے لیے موسیٰؑ طور پر گئے تھے تو ان کے جاتے ہی تم نے خدا کو چھوڑ کر بچھڑے کی پُوجا کیوں شروع کر دی تھی۔ کیا سچا ایمان ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب یہ سوال مسلمان ان سے کرتے تھے تو لاجواب ہو کر رہ جاتے تھے۔

یہودیوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جنت بنی ہی خاص کر ہمارے لیے ہے ہمارے سوا سب قومیں جہنمی ہیں تو ان سے کہا گیا، اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر مرنے کی تمنا کیوں نہیں کرتے کیونکہ وہاں تو تمہیں بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی۔ اُن کے شوق میں اس دنیا کو چھوڑنا کیوں نہیں چاہتے۔ (جھوٹے مکار فریبی) محض لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے یہ جھوٹا پروپیگنڈا کرتے پھرتے تھے۔ وہ کیا تمنائے موت کرتے وہ تو زندگانیِ دنیا کے سب سے زیادہ حریص تھے۔ لیکن اس سے ہوتا کیا ہے اگر وہ ہزاروں برس یہاں رہتے تو بھی وُہ عذابِ الٰہی سے بچ نہیں سکتے تھے۔ یہودی مسلمانوں کو بہکانے کے لیے ان سے کہا کرتے تھے :

(۱) تمہاری ہدایت کے لیے صرف ایک نبی آیا جسے تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا اور ہمارے یہاں تو بیشمار انبیا آئے جن کو تم بھی مانتے ہو۔

(۲) ہم اللہ کے دوست کی اولاد اور اس کے کنبہ والے ہیں۔ ہمیں وہ کبھی سزا نہ دے گا۔

(۳) ہم کو اُس نے دولت دی حکومت دی۔ تمہارے لیے نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔

ایسی باتیں سُن کر ضعیف الایمان مسلمان ڈگمگا جاتے تھے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اے رسول کہدو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ اللہ کے حکم سے اس نے قرآن کو تمہارے قلب پر نازل کیا ہے، یہ قرآن تصدیق کرتا ہے ان کتابوں کی جو اُس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور جو اس کے سامنے ہیں اور یہ قرآن مومنوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔ جو کوئی اللہ کا اس کے ملائکہ کا اس کے رسولوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے تو بے شک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے اور ہم نے اے رسول تم پر روشن آیات نازل کیں۔ سوائے فاسق لوگوں کے کوئی ان سے انکار نہیں کرے گا جب کبھی بھی انھوں نے کوئی عہد کیا تو ایک گروہ نے اسے پسِ پشت ڈال دیا بلکہ اکثر ان میں سے ایمان لائے ہی نہیں۔ اللہ کی طرف سے جب ان کے پاس ایک رسول (محمدؐ) آیا جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے تو بجائے اس پر ایمان لانے کے ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے کتابِ خدا کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی مُلۡکِ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَمَا کَفَرَ سُلَیۡمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ کَفَرُوۡا یُعَلِّمُوۡنَ النَّاسَ السِّحۡرَ ٭ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ ؕ فَیَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡهُمَا مَا یُفَرِّقُوۡنَ بِهٖ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَزَوۡجِهٖ ؕ وَمَا هُمۡ بِضَآرِّیۡنَ بِهٖ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَیَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّهُمۡ وَلَا یَنۡفَعُهُمۡ ؕ وَلَقَدۡ عَلِمُوۡا لَمَنِ اشۡتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡا بِهٖۤ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَمَثُوۡبَۃٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ خَیۡرٌ ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

اور وہ اس منتر کے پیچھے پڑ گئے جس کو سلیمان کے زمانۂ سلطنت میں شیاطین جپا کرتے تھے حالانکہ سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور جو چیزیں ہاروت و ماروت دونوں فرشتوں پر بابل میں نازل کی گئی تھی حالانکہ وہ دونوں فرشتے کسی کو سکھاتے نہ تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے تھے

کہ ہم دونوں تمہارے لیے ذریعہ آزمائش ہیں لہٰذا اس پر عمل کر کے بے ایمان نہ بن جانا۔ اس پر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بی بی میں جدائی ڈال دیں حالانکہ بے اذنِ الٰہی وُہ اس کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے اور یہ لوگ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو خود انہی کو نقصان پہنچاتی تھیں کوئی نفع نہ دیتی تھیں باوجودیکہ وُہ یقینی طور پر جان چکے تھے کہ جو شخص ان برائیوں کا خریدار ہو گا وہ آخرت میں بے نصیب رہے گا۔ بے شک یہ معاوضہ کیسا بُرا ہے جس کے بدلہ انھوں نے اپنی جان کو بیچا۔ کاش وہ اسے کچھ سوچے سمجھے ہوتے اگر وہ ایمان لاتے اور جادو وغیرہ سے بچ کر پرہیز گار بنتے تو خدا کی بارگاہ سے جو ثواب ملتا وہ اس سے کہیں بہتر ہوتا۔

شیطان تو انسان کی گھات میں لگا ہُوا ہی ہے خصوصاً بنی اسرائیل پر تو اس کا جادو سب سے زیادہ چلتا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد اس نے بنی اسرائیل کو یہ پٹی پڑھائی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ سلیمانؑ نے جو تمام انسان اور جنّات وغیرہ کو اپنے قابو میں کر لیا تھا وہ عملِ تسخیر کیا تھا۔ میں نے ان کے تخت کے نیچے سے وہ کتاب نکال لی ہے جس میں جادُو کے وہ منتر اور ٹونے ٹوٹکے لکھے ہوئے ہیں جن سے سلیمانؑ کام لیتے تھے۔ وہ احمق اس کے دامِ فریب میں آ گئے۔ اور اس سے جادو سیکھنا شروع کر دیا۔ منجملہ اور کرشموں کے سب سے بڑا کرشمہ یہ تھا کہ شادی شدہ عورتوں کو ان کے شوہروں سے جُدا کر کے اپنے تصرف میں لاتے تھے اس سے تمام قوم میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور جادوگروں سے لوگ حد درجہ خائف رہنے لگے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو بشکل انسانی اس زمانہ کے پیغمبر کے پاس بھیجا کہ لوگوں کو بتائیں کہ ہم اس جادو کا توڑ سکھانے آئے ہیں تاکہ وہ جادوگروں کے ظلم سے محفوظ رہیں۔ یہ خبر سنتے ہی لوگ ان کے پاس آنے لگے۔ انھوں نے ان سے کہا دیکھو ہم تمہارے لیے اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہیں۔ خبردار کوئی عمل ایسا نہ کرنا جو خلافِ شرع ہو صرف اس لیے ہم تمہیں سکھاتے ہیں کہ تم پر جادو کا اثر نہ ہو۔ تم خود کسی پر جادو نہ کرنا ورنہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ یہ واقعہ ارضِ بابل کا ہے۔

اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جب جادو حرام ہے تو فرشتوں نے لوگوں کو اس کی تعلیم کیوں دی۔ جواب یہ ہے کہ جب تک ان کو بتایا نہ جاتا کہ جادو اس چیز کا نام ہے وہ کیسے جانتے کہ جادو کیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم اگر کسی سے کہیں کہ گالیاں نہ دیا کرو تو ان کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ اس قسم کے الفاظ گالی کہلاتے ہیں۔ وہ جادو کا توڑ بتاتے تھے تو یہ کہہ کر بتاتے تھے کہ تم خود ایسا نہ کرنا۔ یہ کوئی بُری بات نہ تھی۔ مقصود یہ بتانا تھا کہ ان الفاظ سے جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

یہ تھا اصلی واقعہ مگر مفسرین اور مورخین نے اس واقعہ میں وہ رنگ بھرا کہ طلسم ہوشربا اور الف لیلہ کی ایک داستان بنا دیا۔ لکھتے ہیں جب ہاروت و ماروت خوش رو نوجوانوں کی صورت میں زمین پر آئے تو یہاں کی دو حسین عورتوں پر جن کے نام زُہرہ اور مشتری تھے عاشق ہو گئے اور وصل کے خواہشمند ہوئے۔ انھوں نے کہا جب تک آپ ہم کو وہ اسمِ اعظم نہ بتائیں گے جن سے آپ آسمان پر آتے جاتے ہیں ہمارے وصل کی لذت سے محروم رہیں گے۔ وہ تو دیوانے بنے ہوئے تھے ہی اسمِ اعظمِ الٰہی ان کو سکھا بیٹھے۔ وہ ان کو پڑھ کر فوراً آسمان پر اُڑ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک کو زُہرہ ستارہ بنا دیا دوسری کو مشتری اور اس گناہ کی پاداش میں ہاروت و ماروت کو بابل کے ایک کنوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا۔ ان کے منہ اور ناک سے دھوُاں نکلنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ وہ قیامت تک

اس میں اسی طرح لٹکے رہیں گے۔ (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہِ)

بہت سے لوگ جادو وغیرہ کا یقین نہیں رکھتے حالانکہ اس سے خوفناک اثرات ہر زمانہ میں لوگوں کے سامنے آتے رہے ہیں۔ انگریز محققین نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ حضور سرورِ کائنات ؐ پر بھی یہودیوں نے جادو کیا تھا جس کے توڑ کے لیے سورہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ نازل ہؤا۔ ہم نے خود کئی بار لوگوں کے اوپر جادو کا اثر دیکھا ہے اس کے ساتھ اہلِ ایمان پر یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو لوگ تعویذ گنڈوں کے خلاف ہیں وہ اپنے اس خیال میں درست نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ شیطانی عمل میں تو اثر ہو اور رحمانی عمل اس کے توڑ میں بے اثر رہے۔ کیا شیطان کی قوت خدا سے زیادہ ہے ہرگز نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ڈاکٹر اور طبیب ادویہ کے ذریعہ سے مریضوں کا علاج کریں اور ان کو شفا حاصل ہو جائے اور اسمائے الٰہی یا آیاتِ قرآنی سے علاج کیا جائے تو شفا نہ ہو اور لوگ اسے ڈھکوسلا بتائیں۔ جس خدا نے ادویات میں یہ اثر بخشا ہے کیا اپنے ناموں میں اپنی کتاب مقدس کی آیات میں یہ اثر نہیں بخش سکتا۔ ایک مؤمن تو اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ائمہ نے بہت سے علاج آیاتِ قرآنی دم کرکے اور اسمائے الٰہی پڑھ کر کیے ہیں اور ان کو شفا حاصل ہوئی ہے۔ ہم سالہا سال سے اس روحانی علاج سے کام لے رہے ہیں اور الحمد للہ ان سے لوگوں کو تسکین بخش فائدے ہو رہے ہیں۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ اس قسم کے معالج کو پاک نفس ہونا چاہیئے۔ اور عملیات کے جو منقولہ طریقے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ تعویذوں کو گلے میں ڈالنا یا بازو پر باندھنا جو لوگ عار سمجھتے ہیں وہ آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی کی توہین کرتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ اعتقادِ صادق کے ساتھ کوئی تعویذ گلے میں ڈالا جائے اور شفا نہ ہو۔ جس طرح ڈاکٹروں اور طبیبوں کی دوائیں اکثر اوقات امراض کی پیچیدگی سے اپنا اثر نہیں کرتیں یا تشخیص میں غلطی کرنے سے معالج اپنے علاج میں کامیابی حاصل نہیں کرتا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ایک مریض کا ایمان صحیح نہ ہو۔ بے نمازی ہو۔ احکامِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کرنے سے تعویذ بے اثر رہے لیکن اگر شرائط پر عمل ہو تو ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اثر ہوگا اور ضرور ہوگا۔ یہ اسرارِ الٰہیہ ہیں ہم ان کے راز سے واقف نہیں۔

حرز ابو دجانہ۔ حرز جواد۔ دعائے مشلول۔ جوشن کبیر۔ جوشن صغیر۔ حرز امیر المومنین۔ دعائے یَا مَنْ تَحَلَّ۔ سورہ الحمد۔ ایسے مجرب عمل ہیں کہ امراض کی شفا میں تیر بہدف ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ ان کو قرینہ سے پڑھا جائے۔

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ جب کسی سواری پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھ لیا کرو۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ۔ پھر اس سواری پر کوئی حادثہ پیش نہ آئے گا اگر اتفاقاً گر بھی جاؤ گے تو چوٹ نہ لگے گی۔ یہ سب کیا ہے؟ آیاتِ الٰہیہ کے اثرات۔

اس طرح دعاؤں میں اثر پیدا کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، رجوعِ قلب اور آنکھ کے آنسو خوفِ خدا میں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا تھا یَا ابْنَ عِمْرَانَ ھَبْ لِیْ مِنْ قَلْبِكَ الْخُضُوْعَ وَمِنْ عَیْنِكَ الدُّمُوْعَ تَجِدْنِیْ قَرِیْبًا مُجِیْبًا (اے موسیٰ دو چیزیں مجھے دے دو، اپنے دل کی رجوع اور اپنی آنکھ کے آنسو۔ پھر جو دعا تم کرو گے میں اسے قبول کروں گا)۔ کسی آیت یا دعا کے عمل میں جو ایام مقرر کیے جاتے ہیں وہ صرف اس غرض سے ہوتے ہیں کہ ان ایام میں کسی نہ کسی وقت تو دل اس کی طرف رجوع کر ہی جائے گا۔

تعویذوں کے اثرات

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾

اے ایماندارو (اگر رسول کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو تو) رَاعِنَا (ہماری رعایت کر) نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا (ہم پر نظرِ توجہ رکھ) کہا کرو (کان لگا کر) سنتے رہو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (اے رسول) اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے بھلائی (وحی) نازل کی جائے (ان کا تو اس میں کچھ اجارہ نہیں) جس کو چاہتا ہے اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور خدا بڑا افضل کرنے والا ہے ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا تمہارے ذہن سے مٹا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور نازل کر دیتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان و زمین کی سلطنت خدا ہی کے لیے ہے اور خدا کے سوا نہ کوئی تمہارا سرپرست ہے نہ مددگار (مسلمانو) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے رسول سے ویسے ہی (بیڈھنگے) سوالات کرو جس طرح موسیٰ سے (سابق زمانہ میں بے تکے) سوالات کیے گئے تھے اور جس نے ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کیا وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا۔ عبرانی زبان میں راع کے معنی بد کے ہیں اور عربی زبان میں چرواہے اور رعایت کرنے کے ہیں۔ جب حضرت رسولِ خداؐ کوئی بات بیان فرماتے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی تو وہ روک کر مکرر پوچھتا تھا حضرتؐ اس کو بیان فرما دیتے تھے یہودی جب ایسی صحبتوں میں شریک ہوتے اور ان کو روکنا مقصود ہوتا تو رَاعِنَا کہہ کر خطاب کرتے۔ ان کی

دیکھا دیکھی بے سمجھے بوجھے مسلمان بھی یہی کہنے لگے۔ خدا نے ان کو منع کیا کہ تم رَاعِنَا کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو کیونکہ اس میں دو پہلو مذمت کے ہیں، ایک معنی ہیں ہمارے چرواہے دوسرے معنی ہیں ہمارے بد اور ایک پہلو اچھا ہے یعنی ہماری رعایت کرو۔ بلکہ اس کی بجائے اُنْظُرْنَا کہہ کر خطاب کیا کرو کہ اس میں کوئی پہلو مذمت کا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس معاملہ میں یہودیوں کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو دشمن اسلام ہونے کی وجہ سے ہر طرح حضرتؐ کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں دوسرے وہ حضرتؐ کی مجلس میں کان لگا کر سننے کے لیے نہیں آتے۔ اے مسلمانو، تم ایسا نہ کرو جو کچھ حضرتؐ فرماتے ہیں اُسے کان لگا کر سنو۔ جب یہودیوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے رَاعِنَا کہنا شروع کیا تو یہودی اپنے مقام پہ جا کر خوب قہقہے لگاتے اور کہتے ہم تو مسلمانوں کے رسُول کو بُرا کہا ہی کرتے تھے اب مسلمان خود بھی کہنے لگے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ یہودیوں نے توریت میں جس نبی کی پیش گوئیاں پڑھی تھیں اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہوگا اور نبوت بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل نہ ہوگی۔ ادھر مشرکین اس خیال میں مست تھے کہ یہودی جس نبی کے آنے کی بشارت دیتے ہیں وہ ولید و مغیرہ و نعیم ثقفی ہوں گے جو ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہیں پس خدا نے ان لوگوں کے خیالات کی تردید میں فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر دیتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ۔ یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو انہیں خواہ مخواہ چھیڑنے اور اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے سوالات کیا کرتے تھے۔ کبھی کہتے تمہارا کیسا خدا ہے کہ جو کتابیں نازل کرتا ہے خود ہی اپنی غلطی پر آگاہ ہو کر انھیں منسوخ کر دیتا ہے۔ کبھی کہتے تمہارے رسول بھی کچھ سمجھ بوجھ کے آدمی نہیں ہیں آئے دن احکام بدلا کرتے ہیں پہلے ایک حکم دیتے ہیں جب کام نہیں چلتا تو پشیمان ہو کر اس حکم کو بدل دیتے ہیں۔ خدا نے اس پر ان کو پھٹکار بتائی اور فرمایا حکم کا اُدلنا بدلنا ہمارا کام ہے۔ کیونکہ قانونِ شریعت قانونِ مصلحت ہے اور یہ قانون ہمارا دیا ہوا ہے ایک وقت مصلحت تھی کہ ہم نے موسیٰؑ کو نبی کیا اور توریت دی۔ دوسرے وقت مصلحت دیکھ کر ہم نے عیسیٰؑ کو رسول بنایا اور انجیل دی اب مصلحت یہ ہے کہ ہم نے محمدؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا اور ان کو ایک نیا قانون بصورت قرآن دیا ہم جو حکم منسوخ کرتے ہیں وہ مصلحتِ وقت اور زمانہ کے حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ تم اس میں دخل دینے والے کون۔ تم ہماری مصلحتوں کو جب نہیں سمجھ سکتے تو اس پر اعتراض کیوں کرتے ہو۔ ہم اگر کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ یہودی احکامِ توریت کو دوامی سمجھتے تھے اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ جانتے تھے اور توریت کے احکام میں جو تحریف کر لی تھی اس کو بھی حکمِ خدا سمجھ کر دوامی مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بنائے ہوئے احکام کو منسوخ کیا اور ان کے تصرفات کو لغو قرار دیا اور توریت کی بجائے قرآن کے احکام کو دوامی قرار دیا۔ جو بلحاظ فطرتِ انسانی ان سے بہتر ہیں۔ یہ جو فرمایا ہے کہ جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اُن سے قرآن کی آیت مراد نہیں بلکہ شریعت موسوی کے وہ احکام مراد ہیں جو شریعتِ محمدی میں بدل گئے ہیں۔ یا وہ احکام شریعت موسوی مراد ہیں جن کو یہودیوں نے بھلا دیا تھا۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ تنسیخ خدا کی مصلحت پر موقوف ہے مثلاً رسولؐ کو حکم ملا فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (تم ان سے روگردانی کرو تم پر کوئی الزام نہ ہوگا۔) جب مصلحت بدلی تو حکم ہوا اُدْعُهُمْ بِرَحْمَةٍ (ان سے نرمی کا برتاؤ کرو)۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اہل کتاب میں سے اکثر لوگ اپنے دلی حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا دیں حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے اس کے بعد بھی یہ تمنا باقی ہے پس تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا کوئی اور حکم بھیجے۔ بیشک خدا ہر شے پر قادر ہے نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیئے جاؤ اور جو کچھ بھلائی اپنے لیے خدا کے یہاں پہلے سے بھیج دو گے اس کے ثواب کو موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اسے ضرور دیکھ رہا ہے یہودی کہتے ہیں کہ یہود کے سوا، اور نصاریٰ کہتے ہیں نصرانیوں کے سوا کوئی بہشت میں جانے ہی نہ پائے گا یہ ان کی خیالی باتیں ہیں۔ اے رسولؐ، تم ان سے کہو کہ بھلا اگر تم اس قول میں سچے ہو کہ بہشت میں ہم ہی جائیں گے تو کوئی دلیل پیش کرو۔ البتہ جس نے خدا کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور اچھے کام کرتا رہا۔ اس کے لیے اس کے پروردگار کے یہاں اس کا بدلہ موجود ہے اور آخرت میں ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا نہ غم۔

یہودیوں کو بڑا غرّہ اس بات پر تھا کہ چونکہ سب سے زیادہ انبیا ہماری قوم میں ہو گزرے ہیں اور ہم ان کی اولاد ہیں لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کی اولاد کو داخل دوزخ کرے۔ اسی خیالی پلاؤ نے ان کو بدکاریوں پر آمادہ کیا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾

یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ بھی نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی مذہب ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے حالانکہ یہ دونوں فریق کتاب خدا پڑھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی بے تکی باتیں وہ (مشرکینِ عرب) بھی کیا کرتے ہیں جو احکامِ خدا کو کچھ بھی نہیں جانتے پس جس معاملہ میں یہ لوگ جھگڑا کر رہے ہیں (دنیا میں تو طے نہ ہوگا) البتہ قیامت میں خدا ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔

یہودی نہ تو حضرت عیسیٰؑ کو نبی مانتے تھے اور نہ انجیل کو مُنَزَّل مِنَ اللہ کتاب جانتے تھے اس لیے نصاریٰ سے ان کو سخت عداوت تھی۔ نصاریٰ اپنے اس خیال کی بنا پر کہ وہ ابن اللہ کے ماننے والے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ نے ان کے تمام گناہ اپنے اوپر لے لیے ہیں وہ اپنے کو یہودیوں سے از راہِ قربتِ ایزدی بہتر جانتے تھے۔ یہودی چونکہ احکامِ توریت کی بجا آوری میں بہت غفلت برتتے تھے لہٰذا نصاریٰ ان کو طعنہ دیتے تھے کہ تمہارا مذہب چونکہ بدکاری سے نہیں روکتا اس لیے تم جنّت میں نہیں جا سکتے۔ غرض اس دشمنی کی بنا پر آپس میں جنگ ٹھنی رہتی تھی۔ یہودیوں کا گروہ چونکہ زیادہ بڑا تھا اس لیے اکثر اوقات وہ نصاریٰ پر غالب آتے تھے۔ اسلام دشمنی میں دونوں برابر تھے فرق اتنا تھا کہ یہودی علماء نہایت سخت دل اور ظلم پسند تھے اور علمائے نصاریٰ جو رہبان و قسّیس کہلاتے تھے نرم دل تھے اور مسلمانوں سے مہذب طریقہ سے ملتے جلتے تھے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعٰى فِي خَرَابِهَا ۚ أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّدْخُلُوهَا إِلَّا خَآئِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهُ ۖ بَلْ لَّهُ مَا

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُونَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضٰٓى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ أَوْ تَأْتِينَآ اٰيَةٌ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشٰبَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوقِنُونَ ﴿۱۱۸﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۗ أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۱۲۱﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی مسجدوں میں اس کا ذکر کیے جانے سے روکے اور اس کی بربادی کے درپے ہو۔ ایسوں کو اس میں جانا مناسب نہیں مگر سہمے ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا بھاری عذاب۔ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں جس طرف بھی تم رُخ کرو گے پس اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔ بے شک اللہ بڑی گنجائش والا اور خوب واقف ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے حالانکہ اللہ تو اس بکھیڑے سے پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں وہی آسمان و زمین کا موجد ہے اور جب کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو اس سے صرف اتنا کہہ دیتا ہے 'ہوجا' پس وہ (خود بخود) ہو جاتا ہے۔ اور جو مشرکین کچھ نہیں جانتے کہتے ہیں کہ خدا ہم سے خود کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمارے پاس خود اس کی کوئی نشانی کیوں نہیں آئی۔ اسی طرح ان لوگوں کی سی باتیں وہ لوگ بھی کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے۔ ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کو تو ہم اپنی نشانیاں صاف صاف دکھا چکے۔ اے رسولؐ ہم نے تم کو دینِ حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور دوزخیوں کے بارہ میں تم سے کچھ نہ

پوچھا جائے گا (اے رسول) نہ تو یہودی کبھی تم سے رضامند ہوں گے اور نہ نصاریٰ یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی کرو۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی ہدایت ہی بس ہدایت ہے (باقی سب ڈھکوسلا ہے) اگر تم اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو (یاد رہے کہ پھر) تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہ کوئی سرپرست ہوگا نہ مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب (قرآن) دی ہے وہ لوگ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے یہی لوگ اس پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھاٹے میں ہیں۔

مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ الخ جب بخت نصر کو بنی اسرائیل پر غلبہ ہوا تو اس نے نصاریٰ کو سخت مصیبت میں مبتلا کیا۔ اس نے ان کے مردوں کو قتل کیا اور ان کے گھروں کو لوٹ لیا۔ بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس آیت میں مسجد سے مراد بیت المقدس ہے، چونکہ بیت المقدس کی ہر جگہ بجائے خود ایک مسجد ہے اس لیے مساجد کہا گیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ منع کرنے والوں سے مراد مشرکین قریش ہیں۔ جنہوں نے حضرت رسولِ خدا کو مسجد الحرام میں آنے سے روکا تھا اور اس آیت میں جو مسجد کی بربادی کا ذکر ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جب مومن مسجد میں داخل نہ ہو سکے اور خدا کی عبادت نہ کر سکے تو یہ بھی مسجد کی ویرانی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الخ مروی ہے کہ جب آیت تحویل قبلہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے نماز میں کعبہ کی طرف رُخ کیا۔ یہودیوں نے مذاق اڑایا کہ مسلمانوں کا دین بھی کیا دین ہے کبھی بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں کبھی کعبہ کی طرف۔ ان کا قبلہ ہی اب تک معین نہیں ہوا۔ اس کا جواب ان کو دیا گیا کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے پس جدھر رُخ کر لو ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔ خدا کے لیے نہ کوئی سمت ہے نہ کوئی جگہ۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ خدا چاہے تو تمام زمین کو مسجد قرار دے سکتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۔ یہودی کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ نصاریٰ کہتے تھے عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے اللہ نے ان دونوں کے اعتقاد کی تردید کر دی کہ وہ پاک ذات ہے نہ اس کے کوئی جورو ہے نہ بیٹا ہے۔ یہ سب خدا پر اتہام لگا کر اپنا دین برباد کر رہے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الخ جو لوگ مشرک اور جاہل ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ اے محمدؐ، خدا ہم سے اس طرح کلام کیوں نہیں کرتا جس طرح بذریعہ وحی تم سے کرتا ہے۔ ہمارے پاس اس مضمون کی کوئی آیت کیوں نہیں بھیجتا کہ محمدؐ ہمارا رسول ہے تاکہ ہم مان جائیں۔ یہ جاہل لوگ اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ ہر شخص کا نفس اس قابل کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر نزولِ وحی ہو سکے۔ اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کو مخصوص کیا ہے۔ دوسرے اسی پر کیا موقوف ہے مشرکین، آنحضرتؐ میں بہت سی نشانیاں ایسی دیکھ رہے تھے جو ان کی نبوت کی دلیل تھیں تو اگر ان کے پاس کوئی آیت بھی آجاتی تو اُسے کیسے مان لیتے۔ خوئے بد را بہانہ بسیار۔

یہود و نصاریٰ جو آنحضرتؐ سے ناراض تھے وہ اس وجہ سے نہیں کہ حضورؐ نے امرِ حق کو واضح کرنے میں کوئی کوتاہی کی تھی بلکہ اس لیے کہ انہوں نے آیاتِ الٰہی کو توڑ مروڑ کر کیوں نہیں بیان کیا اور ان کی طرح خدا پرستی کو خود پرستی کے لباس میں کیوں نہیں پیش کیا اور احکامِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس طرح کام کیوں نہ لیا جیسے وہ خود کر رہے تھے۔ وہ دنیوی حالات کو بہتر بنانے کے لیے ان سے مل جل کر کیوں نہیں رہے۔ ان کی بداعمالیوں کو اُجاگر کیوں کیا۔ توریت میں جو تصرفات

انہوں نے کیے تھے ان کو لوگوں پر ظاہر کیوں کیا۔

مشرکین اس لیے ناراض تھے کہ ان کے معبودوں کی مذمت کیوں کی۔ بت پرستی کو باطل پرستی کیوں کہا۔ لوگوں کو بت پرستی سے روکا کیوں۔ جو عقیدہ ان کے بزرگوں سے چلا آرہا تھا اس کی شدت سے مخالفت کیوں کی۔ ایسے خدا پر ایمان لانے کی طرف لوگوں کو توجہ کیوں دلائی جو نہ دیکھنے میں آتا ہے نہ اس کے لیے کوئی جگہ ہے۔ ان کے اسلاف کی حماقت کا مذاق کیوں اڑایا اور نجس العین کیوں کہا۔

غرض ہر قوم اپنے اپنے مطلب کو دیکھ رہی تھی۔ حقیقتِ امر پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتی تھی۔ انسان جس امر سے جاہل ہوتا ہے اس کا دشمن ہوتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اے بنی اسرائیل میری اُن نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھیں اور میں نے تم کو اس وقت کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اس دن سے ڈرو جس میں ایک شخص دوسرے کے کام نہ آئے گا اور نہ کسی کا فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی کی مدد کی جائے گی۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے چند کلمات

میں ابراھیم کی آزمائش کی پس وہ اُن سب میں پُورے اُترگئے تو خدا نے ان سے کہا میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد سے (بھی بنائے گا)۔ خدا نے کہا ظالم لوگ میرے اس عہدۂ امامت کو نہ پائیں گے۔ ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے اور امن پانے کی جگہ بنایا۔ مقام ابراہیم پر نماز پڑھو، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکُوع و سجُود کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے رب سے یہ دُعا کی، اے میرے پالنے والے اس گھر کو جائے امن قرار دے اور میری اولاد میں سے ان لوگوں کو پھلوں کا رزق دے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائیں۔ خدا نے فرمایا (تمہاری اولاد میں سے) جو کفر اختیار کرے گا اُسے کچھ دن تو (نعماتِ دنیا سے) فائدہ حاصل کرنے دوں گا پھر اُسے عذابِ جہنم کا مزہ چکھاؤں گا اور وُہ کیسی بُری ٹھہرنے کی جگہ ہے

اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ۔ مولانا فرمان علی صاحب نے اپنے مترجم قرآن کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ جن کلمات میں حضرت ابراھیمؑ کا امتحان لیا گیا تھا۔" اس میں اختلاف ہے کہ وہ کونسی باتیں تھیں، ایک روایت میں ہے وہ تھیں۔ سارے سر میں بال ہوں تو مانگ نکالنا۔ کُلّی کرنا۔ ناک میں پانی دینا۔ تین دفعہ مسواک کرنا۔ مونچھوں کا کٹوانا۔ بغل کے بال منڈوانا۔ زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ ختنہ کرانا۔ پانی سے استنجا کرنا۔ ناخن کٹوانا۔ انہی باتوں کا نام سنت ابراھیمیؑ ہے۔

مولانا کا یہ لکھنا تو تسلیم ہے کہ یہ سنتِ ابراہیمیؑ ہیں لیکن یہ قابلِ قبول نہیں کہ ان چیزوں میں امتحان لے کر ان کو منصبِ امامت پر فائز کیا گیا۔ یہ تو معمولی باتیں ہیں جن کو ایک پاکیزگی پسند انسان بجالانا ضروری سمجھتا ہے۔ جیسے کُلّی کرنا۔ مسواک کرنا بغلوں کے بال منڈوانا۔ زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ ناخن کٹوانا۔ ان کے اوپر عہدۂ امامت کا انحصار کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں جن باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا گیا وہ حضرت ابراہیمؑ کے وہ سخت امتحانات تھے جن میں کامیاب ہونا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ مثلاً بُت پرستوں میں رہ کر جبکہ کوئی ان کا مددگار نہ تھا بت پرستی کی مذمت کرنا ان کے بتوں کو توڑنا پھوڑنا آتشِ نمرود میں پھینکا جانا۔ ستارہ پرستی کی تردید ایسی حالت میں کرنا جبکہ قوم کے بیشتر افراد ستارہ پرست تھے۔ پھر نمرود سے مقابلہ اور مباحثہ۔ پھر بیٹے کے ذبح کرنے پر آمادہ ہونا۔ ان میں سے ہر مصیبت بجائے خود ہزار مصیبتوں کا مجموعہ تھا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ بڑے صبر استقلال و ثبات کے ساتھ ان منزلوں سے گزر گئے۔ اس کمال ایمان کے صلہ میں ان کو بارگاہ ذوالجلال سے عہدۂ امامت ملا۔ بارگاہِ ایزدی کا یہ سب سے بڑا عہدہ تھا۔ جناب ابراھیمؑ نے یہ پانچواں منصب بھی حاصل کیا۔ وہ عبد تھے۔ نبی تھے۔ رسول تھے۔ خلیل تھے۔ سب سے آخر میں امامِ خلق بنائے گئے۔ تھوڑے سے تامل کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو شخص اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوگا اس کے اختیارات کیا ہوں گے اور اس کی رُوحانی عظمت کس پایہ کی ہوگی۔ اس عہدہ کو پانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان و زمین کا تمام نظام دکھا دیا۔ وَکَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ۶/۷۵ غور کیجئے جس شخص نے آسمان و زمین کے تمام نظام کو دیکھ لیا ہو اس کا یقین کس پایہ کا ہوگا۔ یہ ہے عہدہ امامت کی معلومات اور

اختیارات کی ایک ہلکی سی جھلک۔

امامت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک امامتِ کبریٰ یعنی امامت کلیہ مطلقہ جو حاوی ہوتی ہے تمام کائنات کے علم پر اور جس کے اختیارات کی حدود زمین سے آسمان تک ہوتی ہیں۔ دوسری امامتِ صغریٰ جو ہر نبی کو حاصل ہوتی ہے۔ یعنی ہر نبی اپنی امّت کا امام ہوتا ہے یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ۔ بنی اسرائیل ۱۷/۷۱ (روزِ قیامت ہم ہر امّت کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے) یہ امام صرف اپنی امّت کا گواہ ہوتا ہے اس کو اتنا ہی علم دیا جاتا ہے جو بلحاظ امّت اور بلحاظ مقتضیاتِ روزگار ضروری ہو۔

پھر امام دو طرح کے ہوتے ہیں: خیر کی طرف بُلانے والے اور شر کی طرف بُلانے والے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ۔ انبیاء علیہم السلام خیر کی طرف بلانے والے ہوتے ہیں اور اشرار امّت شر کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں جو خیر کی طرف بُلانے والے ہیں ان سب کے مراتب یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (یہ ہمارے رسول ہیں جن میں سے ہم نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے)۔ پ ۳

تمام انبیاءؑ و مرسلین میں یہ شرف صرف حضرت ابراہیمؑ کو حاصل ہے کہ وہ شَجَرَةُ الْاَنْبِیَا کہلاتے ہیں یعنی تمام نبوّتوں کی اصل اور بنجڑ جناب ابراھیمؑ ہیں۔ اور یہ فضیلت بھی انہیں سے مختص ہے کہ ان کی نبوت پر تمام اہلِ کتاب کا اتفاق ہے۔ یہودی ہوں یا نصاریٰ یا مسلمان سب ان کی عظمت کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی انہی کی ہے کہ زمین پر سب سے پہلے خدا کا گھر بنانے والے وہی ہیں۔ اور یہ بھی اعزاز اللہ تعالیٰ نے انہی کو بخشا ہے کہ امامتِ کلیہ مطلقہ انہی کو دی گئی اور یہ بھی کہ اسلام جو اللہ کا دین ہے ملتِ ابراہیمیؑ کے نام سے مشہور رہا۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ الخ الغرض جب حضرت ابراہیمؑ نے یہ مژدۂ رُوح افزا سنا کہ اللہ تعالیٰ ان کو امام خلق بنانے والا ہے تو فوراً بارگاہِ الٰہی میں یہ عرض کی کہ میری طرح میری اولاد کو بھی امام بنائے گا۔ خدا نے جواب دیا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرے اس عہد کو ظالم لوگ نہیں پائیں گے)۔ اس جواب سے اس عہدہ جلیلہ کی عظمت و جلالت کا پتہ چلتا ہے یعنی جس کے دامن اعمال پر ظلم کا ہلکا سا دھبہ بھی لگا ہوگا وہ امام منصوص من اللہ نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ عمر کے کسی حصہ میں ہو۔

ظلم تین قسم کا ہوتا ہے:

(۱) وہ ظالم جس نے صرف اپنے نفس پر ظلم کیا ہو اگر ایسا ظلم ترکِ اولیٰ کی مد میں آتا ہے تو بخش دیا جاتا ہے۔ جیسے آدم علیہ السّلام نے ممنوعہ پھل کھا کر اپنے اوپر ظلم کیا۔ خدا نے ان کو بخش دیا اور ان کی خلافت پر اس ظلم کا کوئی اثر نہ پڑا۔

(۲) ظالم لِغیرہٖ۔ یعنی جو شخص کسی دوسرے پر ظلم کرے گا وہ اس وقت تک معاف نہ ہوگا جب تک مظلوم اس کو معاف نہ کرے اور اللہ تعالیٰ ظالم و مظلوم کے درمیان عدل و انصاف کرے گا اور اس ظلم کی سزا ظالم کو ضرور دے گا چاہے وہ ظلم تھوڑا ہو یا بہت ایسا ظالم عہدۂ امامت کے لائق نہ ہوگا۔

(۳) تیسرا ظلم جو سب سے بڑا ظلم ہے وہ شرک باللہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ یہ ظلم اگر کسی نے آنِ واحد کے لیے بھی کیا ہے تو وہ عہدۂ امامت پانے کا اہل نہیں قرار پائے گا۔ دوم و سوم دونوں قسم کے لوگ دربارِ الٰہی کے کسی عہدہ پر فائز نہیں

ہو سکتے کیونکہ وہ ساقط الاعتبار ہو چکے۔ جو شخص ایک بار بہک سکتا ہے وہ پھر بھی بہک سکتا ہے۔ جس کی عقل ایک بار دھوکا کھا سکتی ہے وہ دوسری بار بھی کھا سکتی ہے اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ ظلم نہ کرے گا۔ دوسرے ظالم کی وقعت نگاہِ خلق سے گر جاتی ہے وہ اس کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگتے ہیں پس ایسے شخص کو خدا اپنی طرف سے حاکم کیوں بنائے جس کو عام لوگ نفرت سے دیکھتے ہوں۔ توبہ کرنے کے بعد اس کا گناہ تو بخشا جا سکتا ہے مگر کوئی عہدۂ الٰہی نہیں پا سکتا۔ اگر کوئی مشرک مسلمان ہو جائے تو اسلام کی کچھ مخصوص رعایتوں سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے مثلاً مسلمان اس کے ساتھ کھا پی سکتے ہیں۔ شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اس کو میراث مل سکتی ہے۔ ہمسائیگی کے حقوق اسے مل سکتے ہیں اس کے ساتھ مؤاخات اور ہمدردی ہو سکتی ہے۔ قتل و نہب و غارت سے بچ سکتا ہے لیکن کوئی عہدہ البتہ نہیں پا سکتا۔ چنانچہ صفوف انبیاء و مرسلین میں کوئی نظیر ایسی ڈھونڈے نہیں ملتی۔

تمام عہود الٰہیہ اللہ تعالیٰ نے معصوم ہستیوں سے مخصوص کیے ہیں یعنی ان لوگوں سے جو مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ ہر قسم کے گناہ سے چھوٹا ہو یا بڑا، پاک صاف رہے ہوں اور ان کو خدا کی طرف سے علم دیا گیا ہو جیسے جناب ابراہیمؑ کو بچپن ہی سے صاحبِ عقل و ہوش بنا دیا گیا تھا۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ ۔ (انبیاء ۔ ۲۱/۵۱) یہی وجہ ہے کہ جو لوگ عہدۂ الٰہیہ پر مامور ہوتے ہیں ان کو کبھی معزول نہیں کیا جاتا وہ مرتے دم تک اسی عہدہ پر فائز رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں چونکہ مرتد و مشرک سب قسم کے لوگ ہونے والے تھے لہٰذا خدا نے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کہہ کر ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جو صفتِ ایمان سے خارج ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ کی اولاد دو نسلوں میں چلی۔ ایک جناب اسحٰقؑ کی نسل میں دوسرے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں۔ اولادِ جناب اسحٰقؑ میں امامتِ کبریٰ کسی کو نہیں ملی۔ جو انبیاء آئے وہ اپنی اپنی قوم کے ہادی بن کر آئے اور جو سلطنت ان کو ملی وہ صرف سطحِ زمین تک محدود رہی خواہ یوسفؑ ہوں یا سلیمانؑ یا داؤدؑ۔ دوسری نسل جو جناب اسمٰعیلؑ سے چلی اس میں صرف ایک نبی ہوئے یعنی سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ وہ نہ صرف اہلِ زمین کے امام و حاکم تھے بلکہ تمام عالموں پر زمین سے لے کر آسمان تک سب موجودات و مخلوقاتِ خداوندی پر امام اور حاکم تھے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن کو نازل کیا تاکہ وہ تمام عالموں کے لیے عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا ہو۔) یہ امامتِ کبریٰ حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے بالاتر مرتبہ رکھتی تھی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو نظامِ کائنات زمین پر دکھایا گیا تھا اور نبی آخر الزمانؐ کو قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى تک لے جا کر دکھایا گیا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ غور یہ بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کسی عہدہ کے ملتے وقت اپنی اولاد کو یاد نہیں کیا لیکن جب امام بنائے گئے تو اولاد یاد آئی۔ غالباً اس کی یہی وجہ ہوگی کہ وہ بعلمِ نبوت یہ جانتے تھے کہ نبیوں یا مرسلوں کے آنے کا سلسلہ کسی نہ کسی وقت ختم ہو جائے گا سوائے عہدہ امامت کے کہ قیامت تک ایک نہ ایک امام ہر زمانہ میں باقی رہنے والا ہے۔

نسلِ ابراہیمؑ میں صرف سرکارِ دو عالمؐ کا سلسلۂ نبوت قیامت تک چلنے والا ہے اور جو کتاب حضرتؐ پر نازل ہوئی وہ بھی قیامت تک لوگوں کی ہدایت کے لیے موجود رہے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ کے بعد امامتِ کبریٰ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو ہدایتِ خلق کا بندوبست کیا ہوگا۔ اگر صرف قرآن رہ جائے گا تو وہ بلحاظ صامت ہونے کے کیسے ہدایت کرے گا اور اگر امتِ رسولؐ میں اس

کی آیات کے سمجھنے میں اختلاف ہوگا تو اس اختلاف کو دور کون کرے گا۔ قرآن خود تو ناطق نہیں اور اختلاف سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک امت کا تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ اختلاف قرآن کو نہ سمجھنے ہی سے پیدا ہوا ہے۔ علمائے امت اس اختلاف کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اختلاف ہوا اور اس حد تک کہ اصول و فروع میں کوئی مسئلہ ایسا نہ رہا جس میں علمائے امت کا اختلاف نہ ہو تو کیا قرآن اختلاف پیدا کرنے کے لیے نازل ہوا تھا؟ وہ تو اختلاف مٹانے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے ہادی بنائے ایک ناطق اور ایک صامت۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ مائدہ ۵/۱۵ (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ہدایت کو ایک نور آیا ہے اور ایک کتاب مبین)۔ تمام مفسرین نے نور سے مراد ذاتِ رسولؐ لی ہے۔ منشا یہ ہے کہ جو بات قرآن میں نہ سمجھو وہ رسولؐ سے پوچھ لو۔ اگر صرف قرآن کافی ہوتا تو رسولؐ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پس اس پر غور کیا جائے کہ رسولؐ کے بعد کوئی ہادی کیوں نہ رہے۔ اور رسولؐ کے بعد والے مسلمانوں کے لیے اس کا کیا بندوبست ہوا کہ اگر قرآن سمجھ میں نہ آئے تو فلاں نور سے پوچھ لینا۔ اس ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر رسولِ خدا نے قرآن کے ساتھ اپنے اہلبیتؑ کو کیا۔ جیسا کہ حدیثِ ثقلین سے ظاہر ہے یہ اہلبیتِ رسولؐ انہی صفات کے رکھنے والے تھے جو رسولؐ میں تھیں۔ رسولؐ کی طرح وہ بھی خدا کے یہاں سے علم حاصل کیے ہوئے تھے اور رسولؐ کی طرح معصوم تھے۔ بمصداق آیتِ تطہیر ہر قسم کے رجس سے پاک تھے۔ اُن کے معجزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام عالموں پر ان کا تصرف تھا۔ ان کے سید و سردار حضرت علی علیہ السلام تھے جو کتابِ خدا کا پورا پورا علم رکھتے تھے۔ اور مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ کے مصداق تھے پس کیوں نہ ان کو رسول کی طرح صاحبِ امامتِ کبریٰ مانا جاتے۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان کا نام نہیں لیکن قرآن میں تو تمام انبیاء و مرسلین کے نام بھی نہیں۔ تمام احکام کی توضیح بھی نہیں بس جس طرح احادیثِ رسولؐ سے اور باتوں کا علم حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح ان کے اہلبیتؑ کے تعین و تشخص کو بھی حاصل کیا جائے ورنہ یہ کیا بات ہوگی کہ بعض باتوں پہ ایمان لاؤ اور بعض پر نہ لاؤ۔ نام تو قرآن میں تھے مگر اپنی جگہ پر نہ رہے یہ دوسری بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی وہ صفات جا بجا بیان کی ہیں جو اس امامتِ کبریٰ کے مصداق ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ غور یہ بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے متعلق سوال کیا تھا کہ کیا وہ بھی امام بنائے جائیں گے۔ تو اس کا جواب قدرت کو یہ دینا چاہیئے تھا کہ تمہاری اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے وہ عہدۂ امامت کو نہ پائیں گے۔ لیکن جو جواب دیا گیا ہے وہ عمومیت کے ساتھ ہے یعنی تمہاری اولاد ہی کیا جو کوئی بھی ظالم ہوگا اس عہدہ کو نہ پا سکے گا یعنی میرا یہ حکم عام ہے کہ کسی نسل کا ہو یا کسی قوم کا یا کسی خطہ کا رہنے والا ہو اگر وہ صاحبِ اعمالِ صالحہ نہیں اور شرک باللہ اس میں پایا گیا ہے تو امامت ہرگز ہرگز اس کو نہیں مل سکتی۔

اس آیت میں دو باتوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر کر دیا ہے ایک یہ کہ امامت کا عہدہ میری طرف سے دیا جائے گا خدا کے سوا کوئی کسی کو امام نہیں بنا سکتا۔ دوسرے یہ کہ جس کو میں امام بناؤں گا وہ معصوم ہوگا۔ کسی چھوٹے بڑے ظلم کا تعلق اُس سے ہوگا ہی نہیں عمر کے کسی حصہ میں بھی۔

اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ظالم کس کس کو کہا ہے:

۱۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ پ ۲۱ لقمان ۳۱/۱۳ (شرک سب سے بڑا گناہ ہے)۔

۲- وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ - سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۴ (اور خدا کی نعمتوں اور احکام سے انکار کرنے والے بھی ظالم ہیں)۔

۳- وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ - سورۂ بقرہ - آیت ۲۲۹ (اللہ تعالیٰ کی حدوں کو پھاندنے والے بھی ظالم ہیں)۔

پس معلوم ہوا جب تک کوئی شرک و کفر یا معصیت میں مبتلا رہے گا عہدۂ امامت اُسے نہیں مل سکتا۔

رہے وہ لوگ جو شرک کے بعد اسلام لائے یا کفر کے بعد مومن ہوئے یا گناہ سے توبہ کر کے اعمالِ صالحہ کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بھی امام نہیں بن سکتے جیسا کہ خدا فرماتا ہے وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (پ ۱۲ ہود - ع - ۱۰) یعنی خبردار اُن لوگوں کی طرف مائل نہ ہو جانا جو پہلے گناہگار رہ چکے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیئے کہ اللہ تعالیٰ نے امامت کے ملنے کو عہدِ الٰہی قائم رکھنے پر متعلق کیا ہے اور قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ عہد سے مراد گناہوں سے بچنا ہے۔ آیہ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یٰسٓ) سے معلوم ہوا عہد یہ ہے کہ اے بنی آدم تم شیطان کی عبادت نہ کرنا یعنی اس کے بندے بن کر اس کی اطاعت نہ کرنا چونکہ ہر گناہ اطاعتِ شیطان ہے لہٰذا گناہگار امام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس پر سے خدا اور بندوں کا بھروسہ اُٹھ جاتا ہے۔

جو لوگ بت پرست رہ چکے ہوں وہ اپنی عقل کی کمزوری کا ثبوت دے چکے ہیں اس کے بعد بھی ان کی عقل پر جہالت کا پردہ چھا سکتا ہے چنانچہ اسلام میں بہت سے ایسے لوگ پائے گئے کہ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے منافقت اختیار کی اور اسلامی مفاد کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو اگر عہدۂ الٰہیہ دے دیا جائے تو وہ صحیح معنی میں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ان کے ایمان کی کمزوری جو ان کو منافقت کی طرف لے گئی ہے وہ اسلام کو تباہ کرنے کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔

عہدۂ امامت کا تعلق دینی اور دنیوی حکومتوں سے ہوتا ہے یعنی معاشرتی تمدنی اور سیاسی اصلاحات کے ساتھ وہ اخلاقی، نفسانی اور روحانی کمزوریوں کا دُور کرنے والا بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کو دینی اور دنیوی تمام علوم کا ایسا بڑا عالم ہونا چاہیئے کہ کسی سوال کے جواب میں یہ نہ کہے کہ میں نہیں جانتا ایسا عالم وہی ہو سکتا ہے جس کا علم وہبی ہو نہ کہ کسبی۔

جناب ابراہیم علیہ السلام اپنی جس اولاد کے لیے امامت کے خواستگار تھے اُن کا اِن تمام اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے جناب ابراہیمؑ کی تمام اولاد یکساں نہ تھی ان میں مومن و کافر دونوں قسم کے لوگ تھے۔ پس کافروں سے متعلق یہ دعا تو ہو ہی نہیں سکتی اور جن مومنوں سے متعلق ہو ان کا اوّل تو معصوم ہونا پھر علم وہبی رکھنا بھی ضروری ہے۔

جناب ابراہیمؑ کی اس شاخ میں جو جناب اسمٰعیل علیہ السلام سے چلی یہ امامت کلیہ جناب رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملی۔ وہ تمام کائنات پر حقِ تصرف رکھتے تھے۔ حضرتؐ کے بعد بھی یہ سلسلہ گم نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ آپؐ کی امت کو قیامت تک ایسے رہنما کی ضرورت ہر زمانہ میں باقی رہے گی جو معصوم ہو اور مکتب مِنْ لَّدُنْ کا تعلیم یافتہ ہو۔ چنانچہ رسولؐ نے وفات سے پہلے اُس گروہ کی نشاندہی کر دی جو اس امامتِ کلیہ کے حق دار تھے۔ آپؐ نے فرمادیا کہ میرے بعد بارہ امام ہوں گے۔ جناب جابر بن عبداللہ انصاری کو ان کے نام بھی بتا دیئے۔ اگرچہ ان میں سے دو کے سوا کسی کو حکومتِ ظاہری کا موقع نہیں ملا تاہم انہوں نے اپنے معجزات سے یہ ثابت کر دیا کہ اشیائے کائنات پر ان کو کس درجہ تصرف حاصل ہے اور مختلف اقوام کے سوالات کے جواب دے کر ثابت کر دیا کہ وہ وہبی علم رکھنے والے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ یہی ثبوت تھا

اس امر کا کہ وہ خدا کے یہاں سے علم حاصل کیے ہوئے آئے تھے۔

یہی وہ ذریت ابراہیمؑ تھی جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بعد خدا سے عہدہ امامت عطا کرنے کے لیے دعا کی تھی۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو خدا سے یہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر لینا تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم دونوں کو اسلام کے راستہ پر ثابت قدم رکھنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ لوگوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کر لے بے شک تو بڑا توبہ کا قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے اس امتِ مسلمہ میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ کر دے۔ بے شک تو غالب اور صاحبِ تدبیر ہے۔

جن لوگوں نے وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ہم کو اپنا مسلمان بندہ بنا لے وہ غلط ہے۔ اگر ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام ابھی تک مسلمان ہی نہ تھے تو خدا ان سے یہ خدمت کیوں لے رہا تھا۔ حالانکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیں فعلیتِ اسلام پر قائم رکھ یعنی جو کام تیرے ایک فرمانبردار بندے کے لیے لازم ہیں وہ ہم سے ہمیشہ ہوتے رہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے اسلام مانگ رہے تھے ان کا اسلام تو بلاواسطہ تھا وہ تو خدا کے یہاں سے اسلام لیے ہوئے آئے تھے جیسا آگے آئے گا۔ ہاں اس پر ثابت قدم رہنے کی دعا ان کو ضرور کرنی چاہیئے تھی۔

اس کے بعد وَابْعَثْ فِيْهِمْ کا ترجمہ لوگوں نے یہ کیا ہے کہ مکہ والوں میں سے ایک رسول بھیج۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ مکہ والے یہاں کہاں سے آ گئے اوپر والی آیتوں میں تو کہیں اس کا ذکر نہیں۔ اگر ذکر ہے تو امتِ مسلمہ کا ہے پس هم کا مرجع وہی ہو سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول ایسے لوگوں میں مبعوث ہو جن کا اسلام ہماری طرح بے واسطہ ہو خدا کے مسلمان بنائے ہوئے ہوں بندوں کے نہیں۔ چنانچہ اس وقت تک حضرت رسولِ خدا نے اعلانِ رسالت نہیں کیا جب تک حضرت علیؑ پیدا ہو کر خاصے

سیلانے نہیں ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ یہ چاہتے تھے کہ جب نبی آخر الزماںؐ اعلانِ رسالت کریں تو سب سے پہلے جو ان کی تصدیق کرے وہ ایسا شخص ہو جس کے منہ سے کفر کی بُو نہ آتی ہو اور خدا کے یہاں سے مسلمان بنا بنایا آیا ہو۔ چونکہ امت کا لفظ صرف فردِ واحد پر بھی بولا جاتا ہے جیسے خدا نے فرمایا ہے کَانَ اِبْرٰهِیْمُ اُمَّةً قَانِتًا۔ لہٰذا ایک علیؑ کے ہونے سے امت مسلمہ کا وجود پایا گیا ـــ رسول کے سپردِ اللہ نے چار خدمتیں کیں:

۱۔ آیاتِ الٰہیہ کو پڑھ کر سنانا۔ یہ تعلیم ہر اس شخص کے لیے تھی جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا تھا۔

۲۔ مطالبِ کتاب کو سمجھانا۔ یہ اوسط درجہ کے مسلمانوں کی تعلیم کا بند و بست تھا۔

۳۔ حکمت کی تعلیم دینا یعنی حکمتِ نظری اور عملی دونوں کو سمجھانا۔ یہ تعلیم اہلِ بیتِ رسولؑ سے مخصوص تھی۔ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ اس میں اگرچہ دوسرے بھی جزوی طور پر شریک تھے لیکن حکمت کی پوری تعلیم سوائے حضرت علیؑ کے دوسروں سے مخصوص نہ ہوئی۔

۴۔ نفسوں کا پاک و پاکیزہ بنانا۔ اس میں صاحبانِ زہد و تقویٰ کو شرکت حاصل تھی لیکن مکمل تزکیہ والے تو صرف وہی لوگ تھے جن کی شان میں آیتِ تطہیر نازل ہوئی۔ حضرت علیؑ کے سوا کسی اور کے لیے حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا نَفْسُكَ نَفْسِيْ۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ جو پاکیزگیِ نفس آنحضرتؐ کو حاصل تھی وہی حضرت علیؑ کو حاصل تھی۔ آیہ مباہلہ کی عملی تفسیر سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

آیات کی تلاوت سب سے پہلے آنحضرتؐ، علیؑ کے سامنے کرتے تھے یعنی جو وحی ہوتی تھی وہ سب سے پہلے علیؑ کو سناتے۔ کیونکہ خلوت و جلوت، سفر و حضر، رزم و بزم میں ہر وقت علیؑ آپؐ کے ساتھ رہتے تھے۔

تعلیم کی صورت یہ تھی کہ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ رسولؐ اللہ سے جب میں کوئی بات پوچھتا تھا تو مجھے بتاتے تھے اور جب میں چپ رہتا تھا تو خود تعلیم دیتے تھے۔ اپنے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کرتے تھے، هٰذَا اَسْفَطُ الْعِلْمِ هٰذَا لُعَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ هٰذَا مَا زَقَّنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ زَقًّا۔ (یہ سینہ علم کا خزانہ ہے یہ لعابِ رسولؐ کا اثر ہے یہ وہ تعلیم ہے جو رسولؐ اللہ نے مجھے اس طرح دی جیسے طائر اپنے بچہ کو بھراتا ہے) کتابِ خدا کی تعلیم اس طرح ہوئی کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا، عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِيٍّ۔ (قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ)۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

سوائے احمق آدمی کے طریقہ ابراہیم سے کوئی بھی نفرت نہیں کر سکتا ہم نے ان کو دنیا ہی میں منتخب کر لیا اور وہ آخرت میں بھی نکوکاروں میں سے ہوں گے۔ جب ان کے رب نے ان سے کہا کہ اسلام قبول کرو تو انھوں نے کہا میں عالموں کے پالنے والے پر اسلام لے آیا۔ اور ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو اسی طریقہ (اسلام) کی وصیت کی اور کہا اے فرزندو اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو برگزیدہ کیا ہے پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان بن کر (اے یہودیو) کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تھی۔ جب انھوں نے اپنی اولاد سے کہا تھا میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے تو انھوں نے جواب دیا تھا ہم آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق کے معبود کی۔ جو خدائے واحد ہے عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں گے۔

ملتِ ابراہیمؑ کے جو اصول تھے ہر نبی کے زمانہ میں وہی رہے البتہ فروعی احکام جو شریعت کہلاتے ہیں بدلتے رہے۔ اسلام کے وہ اصول ایسے مبنی بر عقل و فہم ہیں کہ سوائے بیوقوف آدمی کے کوئی دوسرا ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کا اسلام بے واسطہ تھا یعنی خدا کا تعلیم کردہ تھا کسی اور نے ان کو مسلمان نہیں بنایا تھا بلکہ وہ خدا کے یہاں سے مسلمان بنے ہوئے آئے تھے۔

یہودی کہتے تھے کہ ہمارا دین وہی ہے جو ابراہیمؑ و یعقوبؑ کا تھا۔ لہٰذا ان سے کہا جا رہا ہے کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ مرنے لگے تھے۔ کیا یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ تم دینِ یہود پر قائم رہنا۔ یعنی غلط کہتے ہو۔ انھوں نے تو مرتے وقت اپنی اولاد کو جمع کر کے یہ پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کو خدا مانو گے اور کس کی پرستش کرو گے تو انھوں نے جواب دیا تھا

ہم اس کی عبادت کریں گے جس کی آپ کرتے ہیں یا آپ کے دادا ابراہیمؑ اور آپ کے چچا اسمٰعیلؑ یا آپکے باپ اسحٰقؑ کرتے تھے۔

اس آیت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آباء کے تحت حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ وہ چچا تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب چچا کو باپ کہتے تھے جیسے ہمارے یہاں بھی چچا کو چھوٹا آبا کہا جاتا ہے پس اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آذر کو جو حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا لفظ اَب (باپ) سے ذکر کیا ہے۔ عقلاً بھی کوئی نبی کسی مشرک و کافر کی گندی نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا نطفہ اصلابِ طاہرہ سے اجسامِ طاہرہ کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

(اے یہودیو) یہ وہ لوگ تھے جو چل بسے جو انھوں نے کیا وہ اُن کے آگے آئے گا اور جو تم کروگے تمہارے آگے آئے گا جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ، تو راہِ راست پر آجاؤگے۔ اے رسول ان سے کہہ دو کہ ہم ابراہیم کے طریقہ پر ہیں جو باطل سے کترا کر چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ

ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

۱۶ ع ۱۲ ۱۶

اور اے مسلمانو، ان سے کہو ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اُس پر بھی جو ہم پر نازل کیا گیا ہے (قرآن) اور جو ابراہیمؑ اسمٰعیل و اسحٰق ولیعقوب پر نازل کیا گیا تھا اور جو کتاب موسٰی و عیسٰی پر نازل کی گئی اس پر بھی اور جو اور پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا اس پر بھی، اور ہم تو ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو خدا کے فرمانبردار ہیں اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم لے آئے ہو تو وُہ راست پر آجائیں گے اور اگر اس طریقہ سے منہ پھیر لیں تو (سمجھو) وہ تمہاری ضد پر ہیں تو اے رسول ان کے شر سے بچانے کو تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ سب حالات کو خوب جانتا ہے اور سنتا ہے۔ مسلمانوں سے کہو کہ رنگ تو خدا ہی کا رنگ ہے جس میں تم رنگے گئے اور خدائی رنگ سے بہتر کون رنگ ہوگا۔ ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اے رسول تم ان سے پوچھو کیا تم ہم سے خدا کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا بھی ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے، ہم تو بس نرے کھرے اُسی کے ہیں۔ کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق ولیعقوب اور اولادِ یعقوب سب کے سب یہودی اور نصرانی تھے۔ اے رسول ان سے پوچھو تو کہ تم زیادہ واقف ہو یا خدا۔ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کے پاس خدا کی گواہی موجود ہو کہ وہ یہودی نہ تھے اور پھر وہ اس گواہی کو چھپائے (یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے بے خبر نہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مر چکے اور جو کچھ وہ کر گئے ان کے لیے تھا اور جو کچھ تم کروگے تمہارے لیے ہوگا اور جو کچھ وہ کر گئے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی۔

سابق زمانوں میں انبیاء و مرسلین پر جو کتابیں یا صحیفے نازل ہوئے ان سب کی تصدیق کرنا لازم ہے اور ان کے درمیان بحیثیت فرستادۂ خدا ہونے کے کوئی فرق نہ کرنا چاہیے۔ یہودی آنحضرتؐ کی بعثت کے متعلق آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں سب کچھ پڑھ چکے تھے پھر بھی وہ حضرتؐ کی رسالت اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتے تھے یہ صرف ہٹ کی بات تھی ورنہ حقیقت تو ان پر واضح ہو چکی تھی۔

نصاریٰ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کو زرد رنگ کے پانی میں نہلایا گیا تھا اور اس پانی کو محفوظ کر لیا گیا تھا اس کا ایک قطرہ اور زرد رنگ کے پانی میں شامل کر کے اس کو متبرک بنایا جاتا تھا اور اس میں اپنے بچوں کو غسل دیتے تھے جسے اصطباغ یا بپتسمہ

کہا جاتا ہے جب تک یہ غسل نہیں دیا جاتا تھا وہ اس کو پورا عیسائی نہیں سمجھتے تھے اور جب غسل ہو چکتا تھا تو کہتے تھے :- "Now he is true Christian." مسلمانوں سے طنزاً کہتے تھے چونکہ تمہارا اصطباغ نہیں ہوتا اس لیے تمہارا دین سچا نہیں۔ خدا نے ان کے جواب میں مسلمانوں سے فرمایا تم ان سے کہو کہ اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے اللہ نے ہم کو ایمان کے رنگ میں رنگا ہے۔ یہ زرد رنگ کے پانی میں رنگنا احمقانہ فعل ہے۔ کہیں ان ظاہری غسلوں سے رُوحانی و ایمانی قوت کسی کے اندر آتی ہے ——— حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطری دین ہے۔ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ وَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ وَیُنَصِّرَانِہٖ وَیُمَجِّسَانِہٖ یعنی ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے بعد میں ماں باپ اُسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ اگر اس کو عقلِ فطری پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً وہ صاحبِ عقل و ہوش ہو کر اللہ کی توحید کی گواہی دے گا کیونکہ انسانی فطرت جیسے ایک بدن میں دو دل یا دو رُوحیں برداشت نہیں کر سکتی اسی طرح اس کائنات کے دو یا دو سے زیادہ مدبر و منتظم ہونے کو بھی تسلیم نہیں کر سکتی ——— اس کا ثبوت کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ ہر قوم بچہ پیدا ہونے کے بعد کوئی رسم ایسی ادا کرتی ہے جس سے وہ بچہ اُن کے دین میں داخل ہو جائے۔ مثلاً ہندو جنیو پہناتے ہیں اس کے بعد وہ سچا ہندو بن جاتا ہے اس سے پہلے وہ اُس کو اپنے دین میں داخل نہیں سمجھتے مزید ثبوت اس کا یہ ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کو مرنے کے بعد جلاتے نہیں بلکہ دباتے ہیں اور دبانا فطرتِ اسلامی کا تقاضا ہے۔ اسی طرح عیسائی جب تک اصطباغ نہ ہو اُسے ٹرو کرسچین یعنی سچا عیسائی نہیں سمجھتے۔ مزید ثبوت یہ ہے کہ ایسے بچے کو وہ اُس قبرستان میں دفن نہیں کرتے جہاں عیسائیوں کی قبریں ہوں بلکہ اس کے کسی کونے گوشے میں دبا دیتے ہیں۔ مجوسی جب تک ہنسلی نہیں پہناتے اس کو سچا آتش پرست نہیں سمجھتے۔ سکھ جب تک کڑا انہیں پہناتے سچا سکھ نہیں سمجھتے۔ یہ فطرتِ اسلامی کی قوت ہے کہ وہ ان تمام مذاہب کے گلے دبا کر اسلامی اصول کے تقاضے پورا کراتی ہے۔ غور کیجئے جو چیز خارج نہ ہو اس کو داخل کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔
کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسلام میں بھی تو ختنہ کے بغیر مسلمان نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ کہنا قطعاً غلط ہے ختنہ سے پہلے بھی بچہ مسلمان ہی ہوتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر وہ مرجائے تو اس کا کفن دفن اسی طرح ہوتا ہے جس طرح سب مسلمانوں کا ہوتا ہے میراث اسی طرح ملتی ہے جیسے بڑوں کو۔
ختنہ سنتِ ابراہیمیؑ ہے جو فطرت کے ایک تقاضا کے مطابق ہے یعنی عورت سے مباشرت کے وقت اگر حشفہ پر کھال ہو تو وہ مانع لذت ہے اس لیے اس کو کٹوا دیا جاتا ہے۔ اگر ختنہ پر اسلام موقوف ہوتا تو کوئی کافر بغیر ختنہ کرائے دائرہ اسلام میں داخل نہ ہو سکتا مسلمان ہونے کے بعد بھی وہ ختنہ کرا سکتا ہے۔

یہودی کہتے تھے کہ ہمارے باپ دادا جو اعمالِ صالحہ دنیا میں کر گئے ہیں اُن کی وجہ سے ہم پر عذاب نہ ہوگا کیونکہ خدا اپنے پیارے بندوں کی اولاد کو جہنم میں نہ بھیجے گا۔ اسی طرح نصاریٰ کہتے تھے کہ عیسٰی مسیح نے ہمارے تمام گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیا۔ قرآن ان دونوں خیالوں کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم سے پہلے جو کچھ کر گئے وہ جانیں ان کے اعمال جانیں تم سے ان کا کوئی تعلق نہیں جو کچھ تم کرو گے اُس کی جزا سزا تم کو آخرت میں ملے گی۔ روزِ قیامت اس کا کوئی لحاظ نہ ہوگا کہ یہ کس کا بیٹا یا پوتا ہے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے خود کیا کیا ہے۔

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

تحویلِ قبلہ کے متعلق بعض بیوقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف پہلے سجدہ کرتے تھے اس سے دوسرے قبلہ (کعبہ) کی طرف مڑنے کا کیا باعث ہوا۔ اے رسول تم ان کے جواب میں کہو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے اور جس طرح تمہیں قبلہ کے بارہ میں ہدایت کی ہے اس طرح تم کو امتِ عادل بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابل تم گواہ بنو اور رسول تمہارے مقابل میں گواہ بنیں۔ اور جس قبلہ کی طرف تم پہلے سجدہ کرتے تھے ہم نے اس کو صرف اس وجہ سے قبلہ قرار دیا تھا کہ جب قبلہ بدلا جائے تو ہم ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے الگ دیکھ لیں جو اُلٹے پاؤں پھرتے ہیں اگرچہ یہ تبدیلی ان لوگوں کے سوا جن کو خدا نے ہدایت کی ہے سب ہی پر شاق ہے اور خدا ایسا نہیں ہے کہ تمہارا ایمان یعنی نماز کو جو بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے ہو ضائع کر دے، بے شک خدا لوگوں پر بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اے رسول قبلہ بدلنے کے لیے تمہارا بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں تو ہم ضرور تم کو ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے کہ تم خوش ہو جاؤ۔ اچھا تو تم نماز ہی میں مسجد الحرام (کعبہ) کی طرف منہ کر لو۔ اور اے مسلمانو، تم جہاں کہیں ہو اس کی طرف اپنا منہ کر لیا کرو۔ جن لوگوں کو کتاب

دی گئی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں یہ تبدیلیٔ قبلہ بالکل بجا و درست ہے اور ان کے پروردگار کی طرف سے ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا اس سے بے خبر نہیں۔

ان آیات میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا کیوں ضروری ہوا جبکہ خدا کی ذات مکان و مکانیات سے مبرّہ و منزّہ ہے اور اپنی قدرت سے ہر جگہ موجود ہے پھر ایک سمتِ معین کی طرف نماز پڑھنا اور ایک خاص عمارت کو قبلہ قرار دے لینا کیا معنی رکھتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ نماز بہرحال کسی نہ کسی سمت تو رخ کر کے پڑھنا ہی ہوگی لہٰذا کیوں نہ اس عمارت کی طرف رخ کیا جائے جس کو بہت سی خصوصیات کے ساتھ قدوسیت حاصل ہے۔ کعبہ ہو یا بیت المقدس چونکہ ان کی تعمیر انبیاؑ نے کی ہے لہٰذا ان پر رحمت و برکتِ الٰہیہ ضرور نازل ہوتی ہے۔ پس اس طرف رخ کر کے نماز پڑھنے میں اس کی قدوسیت کا اثر ضرور قلب پر پڑتا ہے کعبہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے لہٰذا بنسبت بیت المقدس کے اُسے فوقیت و برتری ضرور حاصل ہے نیز یہ سب سے پہلی عبادت گاہ ہے جو روئے زمین پر بنی۔

دوسری وجہ قبلہ کے تعین کے ساتھ نماز پڑھنے کی یہ بھی ہے کہ یہ ایک جماعتی تنظیم کی بہترین صورت ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک قوم یا ایک دین کے لوگ مختلف سمتوں میں رخ کر کے پڑھیں۔ زیادہ بہتر صورت یہی ہے کہ سب کا رُخ ایک ہی طرف رہے۔

تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی مرکزیت کا بھی پتہ چلتا رہے کہ جس دین کے احکام کے تحت ہم نماز پڑھ رہے ہیں اس کا مرکز کہاں تھا۔

۲۔ حضرت رسولِ خدا جب تک مکہ میں رہے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ بعد ہجرت ۱۶ یا ۱۷ ماہ تک مدینہ میں بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ ۳ھ میں بعد غزوۂ بدر تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا۔ سوال یہ ہے کہ قیامِ مکہ کے زمانہ میں حضورؐ نے کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کی طرف رخ کیوں کیا؟ اس کے متعلق مفسرین نے دو وجہیں لکھی ہیں۔

(۱) چونکہ کعبہ میں اندر باہر بت رکھے ہوئے تھے اس لیے حضورؐ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں۔

(۲) کفارِ قریش جب حضرتؐ کو کعبہ کی طرف نماز پڑھتے دیکھتے تو طرح طرح سے ستاتے تھے اور کبھی کہتے تھے کہ محمدؐ کے دل میں تو ہمارے معبودوں کی محبت ہے لیکن ہماری ضد میں ان کو بُرا کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۔ جب حضورؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی شروع کی تو یہودیوں نے خوشی منائی کہ اب محمدؐ راہِ راست پر آ گئے ہمارے قبلہ کو تسلیم کر لینا گویا ہمارے دین کو آدھا مان لینا ہے۔ حضرتؐ کو ان کی طعن و طنز ناگوار ہوتی تھی اور بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بارگاہِ باری میں عرض کرتے تھے کہ یہودیوں کے ان طعنوں سے مجھے بچا لے۔ دوسرے خانہ کعبہ چونکہ ان کے دادا حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا بنایا ہوا تھا اس لیے فطرۃً اس سے آپؐ کو محبت تھی، چاہتے تھے کہ اس طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تڑپ پر رحم کھایا۔ ایک دن حضرت علیؑ آپ کے ساتھ کسی ضرورت سے مدینہ سے باہر گئے واپسی پر مدینہ سے چند میل دُور ایک جگہ دونوں نے نمازِ ظہر پڑھی وہیں تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا اور آپؐ نے کعبہ کی طرف اپنا رُخ کر لیا اس مقام پر ایک مسجد بنا دی گئی جسے مسجدِ ذوقبلتین کہتے ہیں اور اس فضیلت کی وجہ سے کہ حضرت علیؑ نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی آپؑ کو مصلی الی القبلتین یعنی دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے والا کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے مسجدِ قبا کو مسجد ذوالقبلتین بیان کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔

۴۔ جب یہودیوں کو معلوم ہوا کہ مسلمان اب بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے ہیں تو ان کو مذاق اڑانے کے لیے ایک اور موقع ہاتھ آیا کہنے لگے محمدؐ کا دین بھی کیا دین ہے جس میں آج تک قبلہ کا تعین نہیں ہوا کبھی مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں کبھی مغرب کی طرف۔ اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ ہم جدھر چاہیں رُخ پھیر دیں کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ دونوں گھر اسی کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ اس تحویل کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مومنوں اور منافقوں میں تمیز ہو جائے۔ صورت یہ ہوئی کہ یہودیوں نے مسلمانوں کو بہکانا شروع کیا کہ تمہارا دین ایک ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے کبھی بیت المقدس کو قبلہ بنا لیتے ہو کبھی پلٹ کر کعبہ کی طرف رُخ کر لیتے ہو۔ بہت سے مسلمانوں پر اس بہکانے کا اثر ہوا اور ان کے ایمان کی کمزوری ان کی باتوں سے ظاہر ہونے لگی لیکن جو مومن خالص تھے انھوں نے تحویلِ قبلہ سے کوئی گرانی محسوس نہ کی۔ اور یہودیوں کے جواب میں کہنے لگے قبلہ خدا کی طرف توجہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے خدا کو اختیار ہے کہ وہ جس سمت کو چاہے قبلہ بنا دے۔

۵۔ مسلمانوں کی سہولت کے لیے یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب تم سفر میں ہو اور کعبہ سے دُور ہو تو نماز کعبہ کی طرف رُخ کر کے پڑھ لیا کرو۔ خدا اس کو قبول کرے گا۔

۶۔ ان آیات میں سب سے اہم آیت یہ ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ یعنی ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا ہے تاکہ روزِ قیامت تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہوں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تحویلِ قبلہ کے ساتھ امت کی گواہی کو کیا ربط ہے تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازیؒ نے کئی توجیہات لکھی ہیں مگر کان کو ایک بھی نہیں لگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ آیت کہیں اور کی ہے بہرحال جہاں کہیں ہو ہمیں تو یہ بتانا ہے کہ امتِ وسط کون ہے۔

مفسرین عامہ نے لکھا ہے کہ اس سے مراد تمام امتِ رسول ہے جو روزِ قیامت اس کی گواہی دیں گے کہ حضورؐ نے احکامِ الٰہیہ کی ساری امت پر تبلیغ کی ہے اور رسولؐ یہ بیان فرمائیں گے کہ میں نے ساری امت پر پوری طرح تبلیغ کر دی ہے۔ یہ تاویل بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ ساری امت نے کب رسولؐ کو تبلیغ کرتے دیکھا ہے جس کی گواہی دے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہی لوگ گواہ ہو سکتے ہیں جنھوں نے حضورؐ کو تبلیغ کرتے دیکھا ہو وہ بھی سب نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ سب ہر جگہ رسولؐ کے ساتھ نہیں رہتے تھے۔

ہمارے ائمہ سے منقول ہے کہ امتِ وسط یعنی بیچ کی امت رسول اور لوگوں کے درمیان ہم ہیں۔ ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک امام ضرور رہے گا وہ شہیدِ اعمالِ امت ہوگا۔ جو جس نے زندگانیٔ دنیا میں کیا ہوگا وہ اس کی روزِ قیامت پیشِ خدا گواہی دے گا اور ہماری گواہی کی تصدیق رسولؐ کریں گے۔

عام مسلمانوں کو تو اپنے گھر کے رہنے والوں کے اعمال کا بھی پوری طرح پتہ نہیں چلتا اپنے زمانہ کے تمام لوگوں کے اعمال کا تو کیا پتہ چلائیں گے پھر ایسا قوی حافظہ کہاں سے لائیں گے کہ سب کے اعمال کو یاد رکھیں۔ پھر غیر معصوم ہونے کی بنا پر ان کی گواہی پر اعتماد کیسے ہوگا۔ ایک آیت بتاتی ہے کہ اللہ و رسولؐ کے سوا کچھ ایمان والے بھی لوگوں کے اعمال کو دیکھتے رہتے ہیں۔

پ۱۱ سورہ توبہ ع۱۳۔ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (جو چاہو عمل کرو مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے اور اس کا رسولؐ اور کچھ ایمان والے۔ تم عنقریب اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے جو غائب اور حاضر سب کا جاننے والا ہے پس

وہ تمہیں آگاہ کرے گا جو کچھ تم کرتے ہو)۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ و رسولؐ کے علاوہ کون سے ایمان والے ہیں جو اعمالِ خلق کو دیکھنے والے ہیں اور روزِ قیامت ہر ایک کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ اس لیے ہر زمانہ میں ایک حجّتِ خدا کا ہونا ضروری ہے۔ تفسیرِ صافی میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ امتِ وسط ہم ہیں ہم خلق اللہ پر اللہ کی طرف سے گواہ ہیں۔ ہم زمین و آسمان میں اللہ کی حجت ہیں۔ اسی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ انبیاء اور اوصیائے انبیاء چونکہ صادق اور معصوم ہیں اس لیے ان کی گواہی معتبر ہوگی۔ حضرات ائمہ اس کی گواہی دیں گے کہ کن لوگوں نے ان کی اطاعت کی اور کن لوگوں نے نہیں کی اور رسولؐ ہماری تصدیق کریں گے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ
فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١٤٧﴾
وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ
وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ
وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ
لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ
نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ
آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾

اے رسول اہلِ کتاب کے سامنے اگر تم دنیا کی ساری دلیلیں بھی پیش کرو گے تو بھی وہ تمہارے قبلہ کو نہ مانیں گے اور نہ تم ہی ان کے قبلہ کو ماننے والے ہو خود اہلِ کتاب بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتے اور جو علم قرآن تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد بھی اگر تم ان کی خواہش پر چلے تو البتہ نافرمان ہو جاؤ گے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب توریت دی ہے وہ جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اسی طرح وہ اس پیغمبر (رسولِ خدا) کو پہچانتے ہیں۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو دیدہ و دانستہ حق بات کو چھپاتے ہیں۔ اے رسول (تبدیلیٔ قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے پس تم کہیں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ اور ہر دین کے واسطے ایک سمت ہے اس کی طرف وہ (نماز میں) اپنا منہ کر لیتا ہے پس اے مسلمانو، تم اس جھگڑے کو چھوڑ دو اور نیکیوں میں ان سے آگے بڑھ جاؤ، تم جہاں کہیں ہو گے خدا تم کو اپنی طرف لے آئے گا اور بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اے رسول تم جہاں جاؤ اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کر لیا کرو بیشک (نیا قبلہ) تمہارے رب کی طرف سے حق ہے اور تمہارے کاموں سے خدا غافل نہیں ہے اور اے رسول تم جہاں سے بھی جاؤ (حتیٰ کہ مکہ سے بھی) تو بھی تم نماز میں اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف کر لیا کرو اور جہاں کہیں ہوا کرو تو اپنا منہ نماز میں اسی کعبہ کی طرف کر لیا کرو (بار بار حکم دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے) تاکہ لوگوں کا الزام تم پر نہ آئے مگر ان میں سے جو لوگ ناحق ہٹ دھرمی کرتے ہیں (وہ تو ضرور الزام دیں گے) تو تم لوگ ان سے ڈرو نہیں صرف مجھ سے ڈرو (دوسرا فائدہ یہ ہے) کہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں (اور تیسرا فائدہ یہ ہے) کہ تم ہدایت پاؤ (مسلمانو، یہ احسان بھی ویسا ہی ہے) جیسے ہم نے تم میں کا ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سنائے اور تمہارے نفسوں کو پاکیزہ کرے اور تمہیں کتاب (قرآن) عقل کی باتیں سکھائے جن کی تمہیں پہلے سے خبر نہ تھی۔

ان آیات میں چند باتوں پر غور کرنا ہے:

۱- مسجد الحرام، خانہ کعبہ ۲۱ ہاتھ لمبی اور ۹ ہاتھ چوڑی عمارت ہے اس کے گرد ایک خاص حد تک کا رقبہ مسجد الحرام کہلاتا ہے اس کی حرمت خانہ کعبہ کی وجہ سے ہے۔ اسے مسجد الحرام اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے اندر کسی کا قتل کرنا اور ایذا دینا اگرچہ واجب القتل ہو، درخت اکھاڑنا اور گرا پڑا مال اٹھانا حرام ہے۔

۲- يَعْرِفُونَهُ۔ تفسیرِ قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مرقوم ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارہ میں ہے کیونکہ وہ توریت و زبور و انجیل میں آنحضرتؐ، آپؐ کے سچے اصحابؓ اور ان کی مہاجرت وغیرہ کا ذکر آچکا ہے اس لیے وہ حضرتؐ کو اچھی طرح پہچانتے تھے لیکن جب حضورؐ کا ظہور ہوا تو سب نے انکار کر دیا کیونکہ وہ بجائے بنی اسحاق کے بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے۔ اور اس بنا پر ایسا شدید حسد ان میں پیدا ہوا کہ آنحضرتؐ کے جانی دشمن بن گئے۔

۳- أَيْنَمَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا۔ (تم کہیں ہو اللہ تم کو اپنی طرف لے آئے گا۔) اکمال الدین اور تفسیرِ عیاشی میں

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ یہ آیت قائم آلِ محمدؐ کے اصحاب کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو رات کو اپنے اپنے بستروں سے مفقود ہو جائیں گے اور صبح انہیں مکہ معظمہ میں ہوگی۔ تفسیر صافی میں بھی یہی مضمون ہے۔

۴۔ ان آیات میں بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم جہاں کہیں ہو نماز میں اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لیا کرو۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب باہر جاتے تو مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا ایک پتھر اٹھا کر لے جاتے اور اس کو ایک جگہ گاڑ کر اس کو قبلہ قرار دے لیتے۔ اللہ تعالیٰ بار بار فرما رہا ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں جہاں جاؤ مسجد الحرام کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ چونکہ یہ رسم عرب میں راسخ ہو گئی تھی لہٰذا ان کو روکنے کے لیے یہ مضمون دہرایا گیا۔

۵۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو)۔ بظاہر یہ خطاب رسولؐ سے ہے لیکن حقیقت میں ہدایت ہے امت کو کیونکہ شک کا تعلق رسولؐ سے ہو ہی نہیں سکتا۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

پس تم میری یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا تم میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔ اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ سے مدد مانگو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو لوگ راہِ خدا میں قتل کیے جائیں انہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ اور ہم ضرور تم کو تھوڑے سے خوف کچھ بھوک اور کچھ مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور اے رسول اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو جن پر جب کوئی مصیبت آپڑی تو کہنے لگے، بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اس کے حضور میں پلٹ کر جانے والے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوات و رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔

ان آیات میں چند امور پر روشنی ڈالی گئی ہے:

۱۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ۔ امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کا ذکر ہر جگہ کرو وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ موجود ہے۔ صافی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اے ابنِ آدم تو اپنے مجمع میں میرا ذکر کر میں فرشتوں کے مجمع میں تیرا ذکر کروں گا۔

۲۔ وَاشْكُرُوْا لِيْ۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا جو شخص حصولِ نعمت کے وقت الحمد للہ کہے اس نے خدا کی کُل نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ تفسیر صافی میں ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ہر نعمت کا شکریہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے اُن سے پرہیز کریں۔

خدا کی ہر نعمت کا شکر جداگانہ ہے۔ دولت کا شکر یہ ہے کہ غریبوں کی مدد کی جائے۔ علم کا شکر یہ ہے کہ جاہلوں کو تعلیم دی جائے۔ صحت کا شکر یہ ہے کہ بیماروں کی تیمارداری کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ صبر کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے صبر سے مراد روزہ لی ہے کیونکہ اس میں جسمانی اور رُوحانی سختی پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ صبر سے یہ مراد ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے تو اس میں اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور مخلوق سے خدا کی شکایت نہ کرے۔ اور خدا کی نازل کردہ بلا کو خوشی سے قبول کرے۔ سکون و قرار کو ہاتھ سے نہ دے اس کا شمار صابرینِ خاص میں ہوگا اور اس کا حصہ اس خوشخبری میں ہوگا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

۴۔ اَحْيَاۗءٌ۔ یعنی جو لوگ راہِ خدا میں قتل کیے جاتے ہیں وہ بظاہر مردہ سمجھے جاتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ زندہ ہیں ان کی زندگی کو سمجھنا ہماری عقل و فہم سے باہر ہے وہ ایک خاص قسم کی زندگی ہے۔ ایسے لوگ شہید کہلاتے ہیں۔ ان کے مدارج مختلف ہیں۔ خاص کر جو معصوم شہید ہوتے ہیں ان کے مراتب عام شہیدوں سے بالاتر ہوتے ہیں وہ اپنے اجسامِ مثالیہ میں جہاں چاہے جا سکتے ہیں اور جس کی چاہیں مدد کر سکتے ہیں ورنہ ان میں اور عام شہیدوں میں فرق کیا ہو۔ ہم ان سے اسی طرح مدد مانگ سکتے ہیں جس طرح بحالتِ زندگی ان سے طالبِ امداد ہوتے تھے۔ احمق ہیں وہ لوگ جو "یا علیؑ مدد" کہنے کو کفر کہتے ہیں جب خدا کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں تو پھر مدد مانگنا کیوں کفر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کے سوا کسی دوسرے سے مدد مانگنا کفر ہے تو اس کفر سے تو دنیا کا کوئی آدمی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کسی کا کام بغیر دوسرے کی مدد کے چل ہی نہیں سکتا۔ پس یا تو یہ مانو کہ شہیدانِ راہِ خدا زندہ نہیں مردہ ہیں تو یہ مفہوم آیت کے خلاف ہے۔ اور اگر زندہ ہیں تو زندہ سے مدد مانگنا کفر کیوں ہے۔ ہمارا ان حضراتِ معصومین سے مدد مانگنا درحقیقت اس ذاتِ قادر و قیوم سے مدد مانگنا ہے جس نے ان کو مرنے کے بعد زندہ رکھا ہے۔ جب صبر و صلوٰۃ جیسی بے جان چیزوں سے مدد مانگنے کا حکم موجود ہے تو پھر خدا کے ان مخصوص بندوں سے کیوں نہ مدد مانگی جائے جو صبر و صلوٰۃ کی تعلیم دینے کے لیے یہاں بھیجے گئے تھے۔

۵۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان امتحانات کا ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کا لیتا رہتا ہے۔ جو لوگ ان مصائب میں راضی برضائے خدا رہتے ہیں ان پر اللہ کی صلوات و رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ یہ پانچ امتحانات بیک وقت نہ کسی نبی کے لیے گئے اور نہ کسی ولی کے، کیونکہ بیک وقت ان سب پر صبر کرنا فطرتِ انسانی پر ناقابلِ برداشت ہے۔

بن جاتا ہے۔ اور انسان کو اس سخت وقت میں صبر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اوّلین و آخرین صرف ایک ذات امام حسین علیہ السلام کی ایسی پائی جاتی ہے جنہوں نے بیک وقت یہ پانچوں امتحان دیئے اور ان میں کامیابی حاصل کی۔ جب کوئی مصیبت ان پر آئی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کے سوا کوئی بے صبری کا کلمہ ان کی زبان سے نکلا ہی نہیں۔ یہ صبر نہ صرف ان کی ذات تک محدود رہا بلکہ ان کے تمام ساتھیوں نے کسی وقت صبر کی باگ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ خدا کی طرف سے صلوات و رحمت کا ایسا دوامی انعام ان کو ملا کہ آج تک ان کا نام سنتے ہی اہلِ ایمان ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

۶۔ خدا کو ہر بات کا علم ہے کسی کے آزمانے کی ضرورت نہیں پس جہاں کہیں خدائی آزمائش کا ذکر ہے وہاں یہ غرض ہے کہ دوسرے لوگوں کو امتحان دینے والوں کے صبر و استقلال کا حال معلوم ہو جائے اور ان کے مدارج و مراتب میں اضافہ کی صورت پیدا ہو۔ اس آیت میں کئی امتحانوں کا ذکر ہے سب سے پہلی اور بڑی چیز دشمن سے خائف ہونا ہے اور سب سے بڑا خوف ایک مومن کے لیے دین کی تباہی کا ہے۔ دوسرا امتحان بھوک کا ہے چونکہ الجوع پر الف لام تخصیص کا داخل ہے لہٰذا ایسی بھوک مراد ہے جس میں پیاس بھی شامل ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو چیزیں یکجا ہو جانے سے انسان پر کیا گزرتی ہے پھر اس کے ساتھ جانوں اور مالوں اور اولاد کے نقصان کا بھی امتحان ہو تو غور کیجئے یہ امتحان کیسا سخت ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہزارہا دشمن سیر و سیراب اسلحہ جنگ سے لیس چند خدا پرستوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہوں۔ مجاہدینِ راہِ خدا کی لاش پر لاش گر رہی ہو، اور ایسے نازک وقت میں کہ آفتاب کی حرارت اور زمین کی تپش اپنی پوری طاقت پر ہو وہ بھوکے پیاسے بھی ہوں۔ دشمن لوٹ کھسوٹ پر بھی آمادہ ہو، ناموس کی ہتک کا بھی خوف ہو۔ دیکھیں دنیا میں کتنے صبر کرنے والے ہیں کہ ان روح فرسا حوادث میں صبر و استقلال سے کام لیتے ہیں۔ یہ صرف کلیجہ تھا کربلا والوں کا جنہوں نے دینِ خدا کو ضلالت و بدعت سے بچانے کے لیے ہر قسم کی مصیبت کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا اور مذکورہ بالا کسی امتحان میں ناکامی کا منہ نہ دیکھا۔

انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنے اپنے وقت میں امتحان دیئے مگر ایک وقت میں صرف ایک امتحان ان کا لیا گیا وہ بھی اس شان سے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ اب صبر کی باگ ان کے ہاتھ سے چھوٹنے والی ہے اور وہ طالب امداد ہیں تو فوراً اس امتحان کو ان سے ہٹا لیا گیا۔ اس کی مثالیں قرآن کریم میں جا بجا موجود ہیں۔ یہ صرف کربلا والوں ہی کا دل گردہ تھا کہ انہوں نے کسی وقت کسی امتحان کے ہٹا لینے کی درخواست نہیں کی بلکہ جتنا مصائب کا ہجوم زیادہ ہوتا جاتا تھا، دشمن کی جتنی سختیاں ان پر بڑھتی جاتی تھیں اتنا ہی ان کے نورانی چہروں کا رنگ نکھرتا جاتا تھا۔ کون ہے مصائب میں یہ کہنے والا سوائے حسین علیہ السلام کے

تَرَكْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِيْ هَوَاكَ ‏ ‏ وَاَيْتَمْتُ الْعِيَالَ لِكَيْ اَرَاكَ

فَلَوْ قَطَّعْتَنِيْ بِالْحُبِّ اِرْبًا ‏ ‏ لَمَا حَنَّ الْفُؤَادُ اِلٰى سِوَاكَ

میرے معبود میں نے تیری محبت میں دنیا کو چھوڑ دیا۔ میں تیری محبت میں اپنے بچوں کو یتیم بنانے پر آمادہ ہوں اگر تو اپنی محبت میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر ڈالے تو بھی میرا دل سوائے تیرے کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

بے شک صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جس نے حج کیا یا عمرہ بجا لایا اسے لازم ہے کہ ان دونوں کا طواف بھی کرے اور جو نیکی کو بجا لایا تو خدا اس کا قدردان اور واقف کار ہے۔ جو لوگ ان واضح ارشادات و ہدایت کو جنہیں ہم نے اتارا ہے چھپاتے ہیں اس کے بعد بھی کہ ہم نے ان کو کتاب میں لوگوں کے لیے واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔ تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور جو چھپایا تھا اُسے بیان کر دیا تو میں اُن کی توبہ قبول کر لوں گا اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ اور سب فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ اُن کو مہلت دی گئی۔

مکہ میں بیت اللہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں ایک کا نام صفا تھا دوسری کا نام مروہ۔ اب ان کے صرف تھوڑے تھوڑے نشان باقی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان جو طواف کی جگہ ہے وہ مسقّف ہے اور زمین پر دونوں کے درمیان نہایت صاف سنگ مرمر کا فرش ہے۔ قدرت نے ان دونوں کو ایک خاص واقعہ کی بنا پر اپنی نشانیوں میں سے قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ جناب ہاجرہؑ کو جن کی گود میں حضرت اسمٰعیلؑ تھے سرزمینِ حجاز پر خانہ کعبہ کے قریب چھوڑ کر چلے گئے۔

اس وقت وہاں کوئی آبادی نہ تھی اور نہ پانی کا نام ونشان تھا۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ پیاس سے بے چین ہو گئے تو جناب ہاجرہؑ تلاش آب میں پہلے کوہِ صفا پر چڑھیں کہ اگر کہیں پرندے اُڑتے نظر آئیں تو سمجھوں کہ وہاں پانی ہے۔ جب کہیں کچھ نشان نہ ملا تو کوہِ مروہ پر گئیں۔ بار بار اس لیے دوڑ کر بچّہ کے پاس آتی تھیں کہ کسی جانور نے کوئی گزند تو نہیں پہنچائی۔ سات مرتبہ ان پہاڑیوں پر چڑھیں اور لوٹ آئیں۔ اسی لیے سات مرتبہ ان کا طواف اس واقعہ کی یادگار میں حاجیوں پر واجب ہُوا۔

زمانہ جاہلیت میں مشرکوں کے دو بڑے بُت تھے آساف و نائلہ۔ آساف صفا پر رکھا ہُوا تھا اور نائلہ مروہ پر۔ جب مکّہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہُوا تو ان دونوں بتوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا گیا۔ تو مسلمانوں نے ان پہاڑیوں کا طواف کرنا اس لیے مکروہ سمجھا کہ وہاں وُہ بُت رکھے ہُوئے تھے جن کی قبل از اسلام پرستش کرتے تھے۔ تب خدا نے ان کے طواف کو واجب قرار دیا اور بتایا کہ طواف نہ کرنا گناہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ۔ یعنی لوگ ہمارے نازل کیے ہوئے دلائل اور نجات کے طریقوں کو چھپاتے ہیں حالانکہ ہم ان باتوں کو اپنی کتاب توریت میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں تاکہ جب ہمارا رسولؐ مبعوث ہو اور اسلام کی دعوت دے تو اس کی بات کو کان لگا کر سُنیں اور دل سے ایمان لائیں اور جو قانون وہ بتائے اس پر عمل کریں۔ لیکن یہودیوں نے ان باتوں کو توریت میں بدل دیا اور آنحضرتؐ کی صفات کو چھپا دیا۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ پس ان پر اللہ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ ہاں جنہوں نے اپنے اس عمل سے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کے بعد جو چھپایا تھا اُسے ظاہر کر دیا، تو خدا ان کی توبہ کا قبول کرنے والا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی حق بات کو چھپائے گا خواہ یہودی ہو یا نصرانی یا مسلمان، اس کا بھی یہی حشر ہو گا ——

جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم سے روگردانی کرتا ہے وہ صاحبِ تقویٰ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ فرماتا ہے:
وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا تو یہ اس کے تقویٰ کا ثبوت ہو گا۔)

صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنا ان مناسکِ حج میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو تعلیم فرمائے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بدو سب برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی روک دیا۔ کیونکہ یہ شعائر اللہ کی تعظیم کے خلاف ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وُہ رحمٰن و رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور دریا میں کشتیوں کے چلنے میں جو لوگوں کے لیے نفع کی چیزیں (مالِ تجارت) لے کر چلتی ہیں اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا جس سے زمین کو مُردہ ہونے کے بعد جلا دی (شاداب کر دیا) اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادل میں جو آسمان و زمین کے درمیان حکمِ خدا سے کھڑا رہتا ہے، عقل والوں کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مذکورہ بالا تمام چیزوں میں جو قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں انسان کو دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے۔ انسان کا تمام نظامِ حیات انہی چیزوں سے قائم ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو زندگی دُوبھر ہو جائے۔ پھر یہ بھی غور کرو کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو انسان باختیارِ خود پیدا کر سکے۔ یہ سب قدرت کے عطیات ہیں جن کو منظّم طریقہ سے چلانے میں سوائے اس کے کسی کا ہاتھ نہیں۔ تعجّب ہے اُن لوگوں پر جو باوجود ان سب باتوں کے دیکھنے کے اس پر ایمان نہیں لاتے اور اس کے سوا اس کی ناکارہ مخلوق کو اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ کیا ان کو مذکورہ بالا باتوں میں سے کسی ایک بات پر بھی اختیار ہے؟ ہرگز نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا اوروں کو بھی خدا کا مثل و شریک بناتے ہیں اور ان سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی خدا سے رکھنی چاہیئے اور ان میں جو ایماندار ہیں وُہ اُن سے بڑھ کر کہیں خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ کاش ظالموں کو اس وقت وہ بات سوجھتی جو عذاب دیکھنے کے بعد سُوجھے گی کہ یقیناً ہر طرح کی قوت خدا ہی کو ہے۔ اور بے شک وُہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے اور کیا سخت وقت ہوگا جب پیشوا لوگ اپنے پیروؤں سے اپنا پیچھا چھڑائیں گے اور بچشمِ خود عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے ان کے پیرو کہنے لگیں گے کہ اگر ہمیں پھر دُنیا میں پلٹ جانا ملے تو ہم بھی ان سے اس طرح الگ ہو جائیں گے جس طرح عین وقت پر وُہ ہم سے الگ ہو گئے۔ جونہی اللہ ان کے اعمال کو دکھائے گا تو ان کو (سراپا) یاس ہی یاس دکھائی دے گی۔ اور وہ بھلا کہاں دوزخ سے نکل سکیں گے۔ لوگو جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور پاکیزہ چیز شوق سے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وُہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی اس محبت کا حال بیان کیا ہے جو شدّت کے ساتھ ان کو اپنے بتوں سے تھی۔ جتنی محبت ان کو خدا سے کرنی چاہیئے تھی وہ بتوں سے کرتے تھے۔ خدا سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی اطاعت کرے اور اس کے اوامر و نواہی کو بجا لائے۔ تفسیر صافی میں ہے کہ بندہ سے خدا کی محبت یہ ہے کہ اس کے نفس کا رُجحان ان چیزوں کی طرف ہو جو اس کو کمال

کی طرف لے جائے اور اس کے دل پر سے پردے ہٹا دے اور اس کو خدا کی خوشنودی کا احساس ہونے لگے اور یہ صورت نہیں ہو سکتی جب تک وہ رسولؐ کی اطاعت نہ کرے اور رسولؐ کی اطاعت ان کے اہلبیتؑ کی اطاعت پر موقوف ہے۔ چنانچہ حدیث رسولؐ ہے مَنْ اَحَبَّ عَلِيًّا فَقَدْ اَحَبَّنِيْ (جس نے علیؑ کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا)۔ جو لوگ دنیا میں ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جن کی اطاعت و پیروی کا خدا نے حکم نہیں دیا وہ روزِ قیامت ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ اور اُن کے مرید حسرت سے تکتے رہ جائیں گے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

وُہ (شیطان) تمہیں برائی اور بدکاری کا حکم دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تم بے جانے بُوجھے خدا پر بہتان باندھو جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا کی طرف سے نازل ہُوا ہے اسے مانو تو کہتے ہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ چاہے ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھے ہوں اور نہ راہِ راست پر چلتے رہے ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسے جانور کو پکار کر اپنا گلا پھاڑے جو آواز کے سوا سُننا سمجھنا خاک نہ ہو۔ یہ لوگ بہرے گونگے اور اندھے ہیں کہ سمجھتے بوجھتے کچھ نہیں۔ اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے صاف ستھری چیزیں شوق سے کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو اور بس اسی کی عبادت کرو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ ۔ ان آیات میں یہودیوں کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب حضرت رسولِؐ خدا نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو کہنے لگے ہم تو اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں وہ ہمارے رہنما تھے اور عقل و فہم میں ہم سے زیادہ تھے۔ ان کو جائز ناجائز اور حلال و حرام سب کا علم تھا۔ ایسی صورت میں بھلا ہم آپ کی بات کیسے مان لیں۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی ہے۔ اور

فرمایا ہے، یہ یہودی کیا ان لوگوں کی پیروی کرنے پر اڑے ہوئے ہیں جو امورِ دین۔(عدل، توحید اور قیامت) کے بارے میں کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ خدائی احکام کے مقابل اپنی عقل لڑاتے تھے۔ انھوں نے ذرا بھی دینی معاملات میں غور و تامّل سے کام نہیں لیا تھا۔ یہ سوچنے کی طرف انھوں نے رغبت ہی نہ کی کہ کون سا مذہب حق پر ہے اور کون سا باطل پر۔ ایسی صورت میں اگر یہ لوگ اپنے باپ دادا کی پیروی کریں تو کس قدر تعجب کی بات ہے۔ یہ خود کیوں نہیں تحقیق کرتے۔ ہر مذہب میں ایسے ہی لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو تقلیدی مذہب رکھتے ہیں یعنی جس مذہب پر باپ دادا کو پایا وہی اختیار کر لیا حالانکہ یہ طریقہ غلط ہے۔ اصولِ دین میں کسی کی تقلید نہیں ہوتی ہر شخص کو اپنی عقل و فہم سے کام لے کر ان کا اقرار کرنا چاہیئے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ج فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۷۳) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ج صلے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۷۴) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ج فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ع (۱۷۶)

ع ۲۱ ۵

تم پر مُردہ جانور اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر وقتِ ذبح خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو حرام کیا گیا ہے پس جو کوئی مجبور ہو سرکش اور نافرمانی کرنے والا نہ ہو اگر ان میں سے کوئی چیز کھالے تو اس پر گناہ نہیں بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ بیشک جو لوگ ان باتوں کو جو خدا نے کتاب میں نازل کی ہیں چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیوی فائدہ) لے لیتے ہیں ایسے لوگ انگاروں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ قیامت کے روز خدا نہ تو ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی اور بخششِ خدا کے بدلے عذاب خریدا۔ بس یہ لوگ دوزخ کی آگ کیسے برداشت کریں گے۔ یہ اس لیے ہوگا کہ خدا نے برحق کتاب نازل کی تو جن لوگوں نے اس کتاب میں ردّ و بدل کی تو وہ پرلے درجے کی مخالفت میں ہیں۔

پہلی آیت کی توضیح یہ ہے کہ مردہ جانور کا گوشت حرام ہے خواہ حلال جانور ہو یا حرام۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ مرجانے کے بعد خون جہندہ اس کے جسم میں رہ جاتا ہے جو انسانی صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ دوسرے خونِ جہندہ کے ذریعہ سے جو مہلک جراثیم اس کے جسم سے نکل جاتے وہ جسم میں باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رگوں میں خونِ جہندہ رہ جانے سے گوشت کی لذّت میں فرق آجاتا ہے۔ ایک قسم کی تلخی اس میں پیدا ہوجاتی ہے۔ نیز یہ کہ جانور کے مرجانے کے بعد فطرۃً طبعِ سلیم کو اس سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب عموماً مردہ جانور کا گوشت کھاتے تھے اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

دوسرے ہر جانور کا خون جو جہندہ یعنی اچھل کر نکلنے والا ہے حرام قرار دیا ہے خواہ وہ جانور حلال ہو یا حرام۔ البتہ خون جہندہ نکل جانے کے بعد گوشت کے اندر جو خون رہ جاتا ہے وہ حرام نہیں۔ جو جانور خونِ جہندہ نہیں رکھتے ان کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں جیسے مچھلی۔ اس کا پانی سے زندہ باہر آجانا ہی اس کا ذبح کرنا ہے۔ شریعت میں صرف وہی مچھلی حلال ہے جو فلس یعنی کھپڑے والی ہو۔ ایسی مچھلی کا گوشت مضرِ صحت نہیں ہوتا۔ ٹڈی کو بھی ذبح کرنا ضروری نہیں کیونکہ خونِ جہندہ اس کے اندر بھی نہیں ہوتا۔

تیسرے سؤر کا گوشت بھی حرام ہے۔ کیونکہ اس سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے۔ اس جانور کی ہر شے نجس العین ہے۔

چوتھے جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حرام ہے۔ وقتِ ذبح اس لیے اللہ کا نام لینا ضروری ہے کہ اس گوشت کا کھانا باعثِ خیر و برکت ہے۔ جس طرح کھانے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، کہنا بسم اللہ کہہ کر کھانا یا ذبح کرنا بہت سی بیماریوں کو روک دیتا ہے اور صحت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ سؤر کے علاوہ اور بھی بہت سے جانور حرام ہیں جن کا تفصیلی ذکر احادیث میں آپ کو ملے گا۔

یہ حرام چیزیں اس وقت کھائی جاسکتی ہیں جب انسان کو کوئی حلال چیز کھانے کو نہ ملے اور بھوک سے اس کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو بقدرِ قوتِ لایموت کھا سکتا ہے۔ باغی اور عادی سے مراد یہ ہے کہ یہ حرام اس لیے نہ کھائے کہ کسی پر ظلم کرے گا یا لوٹ مار کے لیے بدن میں طاقت بہم پہنچائے گا ان پر بقدرِ ضرورت بھی کھانا جائز نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ۔ یہ آیات یہودیوں سے متعلق ہیں۔ ان ظالموں نے توریت سے ان آیات کو قطعاً نکال دیا جو حضرت رسولِ خداؐ کی صفات کے بارہ میں تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ لوگوں سے پیسے لے کر احکامِ الٰہی کو بھی بدل دیتے تھے۔ کہیں سرے سے عبارت ہی بدل دیتے تھے اور کبھی الفاظ کے معنی اور آیتوں کی تاویل مجرموں کے بچانے کے لیے کچھ سے کچھ بیان کر دیتے تھے۔ غرض ان مکاروں اور دغابازوں نے توریت کا ایسا قیمہ کیا کہ وہ کتابِ خدا کہلانے کے قابل نہ رہی۔ انبیاء علیہم السلام کے قصّوں میں ایسی لایعنی باتیں بھر دیں جن کو پڑھنے سے شرم آتی ہے۔ ایک روز ایک صحابیؓ رسولؐ نے بنی قریظہ کے ایک یہودی سے کہا تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس نے کہا گھبراؤ مت، کچھ دنوں بعد تم کو بھی ایسا ہی کرنا پڑیگا۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی کچھ یہی تو نہیں کہ نماز میں اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی تو اس کے لیے ہے جو خدا اور روز قیامت اور فرشتوں اور خدا کی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور خدا کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسیوں اور مانگنے والوں اور لونڈی غلام کے آزاد کرنے میں صرف کرے اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے اور جب کوئی عہد کریں تو اپنے قول میں پورے ہوں اور فقر و فاقہ رنج و سختی اور کٹھن وقت میں ثابت قدم رہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دعوئ ایمان میں سچے ثابت ہوئے اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

یہودی مغرب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے اور نصاریٰ مشرق کی طرف رخ کر کے اور یہ دونوں گروہ اپنے اپنے قبلہ کی سمت پر ہمیشہ جھگڑا کرتے رہتے تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ ہم حق پر ہیں، نصاریٰ کہتے تھے ہم حق پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا یہ کوئی ایسی بڑی نیکی نہیں کہ تم اس پر اتنا جھگڑا کرو نیکی کی باتیں تو یہ ہیں کہ اللہ پر، روز قیامت پر، ملائکہ پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لاؤ۔ پھر وہ اعمال بجا لاؤ جس کا ذکر آیت میں ہے۔

ان آیات میں ایمان و عمل دونوں سے روشناس کیا گیا ہے پہلے ایمان کا ذکر پھر عمل صالح کا۔ آیت کے پہلے حصّہ میں صرف ۵ چیزوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جن پر ایمان لانا واجب ہے، جیسے غیب اور اس کے تمام متعلقات۔ عدل باری تعالیٰ، امامت وغیرہ۔ لیکن یہ سب باتیں ضمنی طور پر ان پانچوں کے اندر آ گئی ہیں اس لیے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مثلاً اللہ پر ایمان لانے کے تحت عدل پر بھی ایمان لانا ضروری ہوگا۔ قیامت کے تحت جنّت دوزخ پر ایمان کی نقاب کشائی ہوگی۔ نبوت کے تحت امامت پر ایمان کا ذکر ہوگا۔ ماجاء بہ النبی پر ایمان کا ذکر ہوگا۔ یہاں جو پانچ باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ وہ ہیں جن میں یہودیوں اور نصرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان بنیادی اختلاف ہے۔ خدا کا کہنا ان مخالفوں سے یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر تو آئے دن جھگڑتے رہتے ہو پہلے ان باتوں پر اپنا ایمان تو ثابت کرو۔ جب تم عزیر کو ابن اللہ کہتے ہو، عیسیٰ مسیح کو خدا کا

شریک اور اس کا بیٹا بتاتے ہو تو تمہارا ایمان باللہ کہاں ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح روز قیامت پر تمہارا ایمان ناقص ہے کہتے ہو وہاں ہم پر عذاب ہوگا ہی نہیں کیونکہ ہم اللہ کے رشتہ دار اور اس کی اولاد ہیں۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ۔ (آیت) حالانکہ تم ان میں سے ہو جو جبرئیل کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ انبیاء میں تم کسی کو مانتے ہو کسی کو نہیں۔ کتابوں میں یہودی صرف توریت کو مانتے ہیں انجیل و قرآن سے انکار کرتے ہیں۔ نصاریٰ قرآن کو نہیں مانتے۔ اس صورت میں تمہارا ایمان ہی صحیح نہیں پھر تمہاری نماز کیسے صحیح ہو گئی چاہے کسی طرف رخ کر کے پڑھے جاؤ۔

اب رہے اعمالِ صالحہ ان میں بھی تمہاری ریاکاری کو دخل ہے حالانکہ جو عمل بھی ہو وہ خالصتاً للہ ہونا چاہیئے۔ محبت خدا کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ اسی طرح دیگر اعمال میں بھی خلوص شرط ہے۔ یہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ مال کو خرچ کرنے والے اور صاحبان احتیاج کو دینے والے نماز روزہ کرنے والے مسلمان تو بہت ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نام و نمود اور اغراضِ ذاتی سے بچ کر صرف محبتِ الٰہی کے جذبہ کے تحت یہ اعمال کرنے والے کتنے ہیں؟ بہت کم۔ مسلمانوں میں صرف ایک گروہ اہلِ بیت کا ایسا ہے جن کے ہر عمل پُرخلوص اور محبتِ الٰہی کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ سورۂ دہر کو پڑھیے کہ وہ اپنے منہ کا لقمہ مسکین و یتیم و اسیر کو دے کر کہتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا۔ ہم تم کو خدا کی خوشنودی کے لیے دیتے ہیں نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ قرآن نے اس پُرخلوص سخاوت کی یوں تعریف کی ہے، وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ (وہ لوگوں کو محبتِ خدا میں کھانا کھلاتے ہیں)۔ رہی نماز تو اس میں بھی یہی محبتِ الٰہی جلوہ نمائی کر رہی ہے۔ جیسا کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے، اِلٰهِیْ عَبَدْتُكَ لَا طَمَعًا فِیْ جَنَّتِكَ وَلَا خَوْفًا مِنْ نَارِكَ بَلْ وَجَدْتُكَ مُسْتَحِقًّا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ (اے میرے معبود میں تیری عبادت نہ جنت کی طمع میں کرتا ہوں نہ خوفِ جہنم سے بلکہ میں نے تجھے مستحقِ عبادت سمجھ کر تیری عبادت کی ہے)۔ اسی طرح جہاد میں کبھی اپنی ذاتی غرض کو دخل نہیں کیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپؑ ایک دشمن کے سینہ پر جب سوار تھے اور قتل کرنا چاہتے تھے تو اس نے اپنا لعابِ دہن آپؑ کے چہرہ مبارک کی طرف پھینکا آپؑ فوراً اس کے سینہ پر سے اُٹھ بیٹھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا اگر اب میں اس کو قتل کرتا تو میر النفس شامل ہو جاتا یعنی وہ میرے جذبہ انتقامی کے تحت قتل ہوتا۔ اسی طرح ہر مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ ہیں اعمالِ صالحہ کی صحیح تصویریں۔ اب اس آیت کا دوسرا رخ لیجئے اور یہ دیکھئے کہ یہ اعمالِ صالحہ بجا لانے والوں کا اجر پیشِ خدا کیا ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مسافر اور یتیم کو صدقہ دینا باعثِ اجرِ جمیل ہے مگر اپنے رشتہ داروں کو دینا اس سے زیادہ اجر رکھتا ہے کیونکہ اس سے رشتہ داری کے تعلقات مضبوط رہتے ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے ابو حمزہ ثمالی سے فرمایا تھا اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری موت خوشحالی میں آئے اور تمہارے گناہ معاف کیے جائیں تو نیکی کیا کرو اور پوشیدہ طور سے کیا کرو۔ اپنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ یہ صفت عمر کو بڑھاتی ہے اور تنگدستی کو دور کرتی ہے اور ستر طرح کی بُری موت سے بچاتی ہے۔

حضرت رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے جو کوئی یتیم بچہ کی پرورش کرے اور کھانے پینے کی فکر سے اُسے آزاد کر دے تو خدا پر واجب ہے کہ بہشت کو اس پر واجب کر دے اور یہ بھی فرمایا کہ غریبوں سے دوستی کرو اور راہِ خدا میں انہیں کچھ دو اگرچہ بقدر نصف خرمہ کے ہو۔ ایک حدیث میں ہے جو کوئی کسی مسافر کی خاطر داری کرے گا اس کی دین و دنیا کی مرادیں پوری ہوں گی اور جو کوئی کسی لونڈی یا غلام کو آزاد کرے گا تو روز قیامت خدا اس کے سر پر اپنی رحمت کا سایہ کرے گا اور یہ بھی فرمایا کہ مصیبت پر صبر کرنے والوں کو روز قیامت بڑا اجر ملے گا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۤءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚۖ اۨلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؕ ﴿۱۸۰﴾

اے ایمان والو جو لوگ ناحق مار ڈالے جائیں ان کے بدلہ میں تم کو جان کے بدلہ میں جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ بس جس قاتل کو اس کے طالبِ قصاص کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے بھی اس کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے (خوں بہا) ادا کر دینا چاہیئے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اے عقلمندو، قصاص کے قواعد مقرر کر دیتے ہیں تمہاری زندگی اسی میں ہے تاکہ تم خونریزی سے پرہیز کرو مسلمانو تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑ جائے تو ماں باپ اور قرابت داروں کے لیے اچھی وصیت کرے جو خدا سے ڈرتے ہیں ان پر ایک حق ہے۔

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ اگر کسی قبیلہ کا ایک آدمی دوسرے قبیلہ کے آدمی سے قتل ہو جاتا تو صرف قاتل ہی کے قتل پر اکتفانہ کی جاتی بلکہ اس قبیلہ کے بہت سے آدمیوں کو جب تک قتل نہ کر دیا جاتا انتقام کی آگ نہ بجھتی یا اگر ایک قبیلہ کے معمولی آدمی کو دوسرے قبیلہ کا آدمی قتل کر دیتا، تو صرف قاتل ہی کے قتل پر اکتفانہ کی جاتی بلکہ قاتل کے قبیلہ کے کسی معزز آدمی سے اس کا بدلہ لیا جاتا۔ اس سلسلہ میں بے شمار بے قصور تہ تیغ ہو جاتے۔ اسی طرح معمولی انسان کا خون بہا اس کی حیثیت کے مطابق نہ طلب کیا جاتا۔ بلکہ کسی سردارِ قبیلہ کی جان کی قیمت مانگا جاتا اور ادا نہ کرنے کی صورت میں پھر وہی تلواریں تھیں اور لوگوں کی گردنیں یہ نوعِ انسانی پر کھلا ہوا ظلم تھا۔ دنیا میں آج بھی ایسا ہی دستور ہے اگر کسی سلطنت کا کوئی بڑا دشمن قتل کیا جاتا ہے تو قاتل کے پورے ملک پر دھاوا بول دیا جاتا ہے اور ایک کے بدلہ میں ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے اس جاہلانہ رسم کا انسداد کیا اور ایک ایسا قانون بنایا جو مبنی بر عدل و انصاف ہے۔

شریعت دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ ہے جس کے قوانین عدل پر مبنی ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ کی شریعت کہ جرم کے لحاظ سے اس کی سزا دی جاتی تھی۔ دوسری وہ جس کا نظم و نسق حُب پر مبنی ہو جیسے شریعت حضرت عیسیٰؑ۔ چنانچہ ان کے احکام میں سے یہ ہے کہ اگر کوئی ایک رخسارہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو اور اگر کوئی بیگار میں ایک کوس لے جائے تو تم دو کوس اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے شریعتِ حُب کو ترجیح دی ہے۔ اکثر حکما نے شریعتِ عدل ہی کو پسند کیا ہے اور دنیوی سلطنتوں میں بھی نظامِ سلطنت کا دارومدار اسی پر ہے۔ اگر مجرم کو سزا نہ دی جائے اور قاتل سے مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو جرائم پیشوں کی ہمت افزائی کا باعث ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامی نے اسی بناء پر قصاص کا حکم دیا ہے لیکن اگر قاتل و مقتول کے ورثا آپس میں صلح کر لیں تو دیت بھی دی جا سکتی ہے یعنی خون بہا تو اس صورت میں شریعتِ حُب پر بھی عمل ہو جائے گا۔

فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ کا مطلب یہ ہے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ اگر کسی کو مار ڈالیں گے تو اس کے بدلہ میں قاتل کی گردن بھی مار دی جائے گی تو اس خوف سے وہ قتل کے ارادہ سے باز رہیں گے قصاص میں یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آزاد کے عوض آزاد، مرد کے عوض مرد اور غلام کے عوض غلام ہی کو قتل کیا جائے اور انہی کے لحاظ سے خون بہا دیا جائے۔ اگر مقتول کے وارث خون بہا لینے کو تیار ہو جائیں تو قاتل کو چاہیئے کہ اس کے دینے میں ٹال مٹول نہ کرے۔ مقتول کے ورثا کو چاہیئے کہ ایسا خون بہا طلب کریں جو قاتل دے سکے۔ اگر قاتل تنگدست ہو تو اس کو کچھ مہلت دی جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاتل کی جان بچتی ہے اور مقتول کے وارثوں کو مالی فائدہ پہنچتا ہے لیکن قتلِ عمد کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا ہو گا۔

توریت میں قصاص لینا واجب تھا اور خون بہا لینا حرام تھا۔ انجیل میں قصاص لینا اور خون بہا لینا دونوں حرام۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کی امت پر رحم کھا کر نیا قانون قصاص نافذ کیا۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ الخ یعنی جب تم مرنے کو ہو یا بہت بوڑھے ہو گئے ہو اور تمہارے پاس کچھ مال ہے اور یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بعد یہ مال تمہاری منشا کے مطابق صَرف ہو تو تم کو چاہیئے کہ اپنے ماں باپ یا اولاد یا رشتہ داروں کو یہ وصیت کر دو کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ قواعدِ میراث کے مطابق صَرف کریں۔ اگر کوئی کسی کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق صَرف نہ کرے گا تو اس کا گناہ اس پر ہو گا۔

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع

جو (وصیت) سُن چکا اور اس کے بعد کچھ کا کچھ کر دے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہو گا جو اسے بدل ڈالیں گے۔ بے شک خدا سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے سے بیجا طرف داری یا بے انصافی کا خوف رکھتا ہو اور ان (وارثوں) میں صلح کرا دے تو اس پر بدلنے کا کچھ گناہ نہیں ہے بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اگر وصیت کرنے والے سے یہ خوف ہو کہ وہ بے جا وصیت کرے گا یا کسی گناہ کا مرتکب ہو گا یا کوئی ایسی وصیت کرے گا جس سے حقداروں کا حق پورا نہ ملے گا یا غیر مستحق کے متعلق وصیت کر دے گا، ایسی صورت میں وصی یا کوئی وارث اس طرح صلح کرا دے کہ کسی کا حق رائیگاں نہ ہو اور وصیت شرع کے مطابق ہو جائے تو یہ کوشش باعثِ گناہ نہ ہو گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

اے ایمان والو! روزہ رکھنا تم پر اس طرح واجب ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھا تاکہ تم اس کی وجہ سے

بہت سے گناہوں سے بچے رہو (وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ) گنتی کے چند روز، اس پر بھی اگر روزہ کے دنوں میں تم میں سے کوئی بیمار ہو جائے یا سفر میں ہو تو قضا کیے ہوئے روزے اور دنوں میں رکھ لو اور جنہیں بہ تکلف روزہ رکھنا پڑے ان پر ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے اور جو شخص اپنی خوشی سے (تکلیف برداشت کر کے) رکھ لے تو یہ اس کے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھدار ہو تو سمجھ لو کہ روزہ رکھنا تمہارے حق میں بہر حال بہتر ہے۔ رمضان وہ مبارک مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور اس میں لوگوں کو ہدایت کرنے اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی روشن نشانیاں ہیں مسلمانو، تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں اپنی جگہ پر ہو تو اس کو چاہیئے کہ روزہ رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کر دے۔

انسانی صحت اور تزکیہ نفس کے لیے روزہ ایسی ضروری چیز ہے کہ خدا نے ہر زمانہ میں ہر رسول کی امت پر اس کو واجب کیا ہے اور اس عبادت میں سختی کے پیشِ نظر بہت سی رعائتیں بھی دی ہیں مثلاً بیمار ہو یا بیمار ہونے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھے سفر میں ہو تو روزہ نہ رکھے۔ حاملہ عورت اگر وقتِ ولادت قریب ہو یا دودھ پلانے والی عورت کو دودھ خشک ہونے کا اندیشہ ہو تو نہ رکھے لیکن معاف نہیں کیا رمضان المبارک کے بعد جب عذر برطرف ہو جائے تو قضا بجا لائے۔ ماہ صیام کے روزوں کی اہمیت اور عظمت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اس کا کفارہ اتنا سخت ہے جو اور کسی فرض کا نہیں۔ مثلاً کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے تو دوسرے وقت صرف وہی نماز پڑھ لے۔ زکواۃ اگر بروقت نہ دے سکے تو دوسرے وقت اتنی ہی دے دے۔ حج نہیں کیا تو عذر برطرف ہونے پر پھر حج کر لے لیکن روزہ اگر بغیر کسی عذر شرعی کے نہیں رکھا تو ایک روزہ کا کفارہ دو ماہ متواتر روزہ رکھنا ہے اگر تواتر باقی نہ رہے تو پھر سے دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے۔ جب ایک روزہ کا کفارہ اتنا ہے تو اگر کوئی پورے رمضان کے نہ رکھے یا دس بیس نہ رکھے تو اس کا کفارہ کتنا زبردست ہو گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت چاہتی ہے کہ رمضان کا کوئی روزہ حتی الامکان قضا ہی نہ ہو لیکن مجبوری کی صورت دوسری ہے۔ اس کی یہ رحمت بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اگر بیمار ہو یا بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس نے کسی ڈاکٹر یا طبیب کا سرٹیفکیٹ طلب نہیں کیا بلکہ اس کا اندازہ کرنا کہ رکھ سکتا ہے یا نہیں خود اسی شخص پر چھوڑ دیا ہے۔

پھر جو لوگ زیادہ بوڑھے ہو گئے ہوں عورت ہو یا مرد اور انہیں روزہ رکھنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ان پر سے اس فرض کو اٹھا لیا گیا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے، تین چیزیں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ الاکرام للضّیف و الجہادُ بالسّیف والصّومُ فِی الصّیف یعنی مہمان کی خاطر تواضع کرنا۔ تلوار سے جہاد کرنا اور گرمی کے موسم میں روزہ رکھنا۔

روزہ صحت کے لیے اس لیے مفید ہے کہ گیارہ مہینے کھانے سے جو رطوباتِ فاسدہ انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں ایک مہینہ روزہ رکھنے سے روزہ کی گرمی ان کو جلا کر خاک دیتی ہے۔ افطار کے بعد اگر احتیاط سے کھایا جائے اور سحری کے وقت بھی خوب ڈٹ کر نہ کھایا جائے تو روزہ کی یہ غرض اچھی طرح پوری ہو جاتی ہے۔

شریعتِ حضرت موسیٰؑ کی رُو سے روزہ کے بعد کھا کر اگر کوئی سو جاتا تھا تو پھر اس کو رات بھر کوئی چیز کھانے کی اجازت نہ تھی رات کو اپنی عورت کے ساتھ جماع بھی نہ کر سکتا تھا۔ امتِ محمدیؐ پر یہ خدا کا فضل ہے کہ ان سختیوں کو مسلمانوں پر سے ہٹا لیا۔ وہ رات کے

ہر حصہ میں صبح ہونے سے پہلے ہر شے کھا پی سکتے ہیں اور جماع بھی کر سکتے ہیں۔ اسلام میں صوم اتّصال حرام ہے یعنی ایسا روزہ جو لگاتار بغیر افطار کیے ہوئے رکھا جاتا ہے جیسے ہندو قوم کے لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ ہر مہینہ کی آخری تاریخوں میں چاند غائب ہو جاتا ہے تو وہ روزہ رکھتے ہیں اور رات دن برابر رکھے چلے جاتے ہیں جب پہلی تاریخ کو چاند نمودار ہوتا ہے تو روزہ کھولتے ہیں۔ فطرتِ انسانی پر نظر رکھتے ہوئے خدا نے ایسا روزہ حرام کیا ہے۔ اسی لیے تو اسلام کو فطری دین کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں تکلیف مالا یطاق نہیں دی جاتی۔

اسلام میں صوم صمت یعنی چپ کا روزہ رکھنا بھی حرام ہے یعنی ایسا روزہ جس میں انسان دن بھر کسی سے کلام نہ کرے چونکہ ایسا کرنا فطرت پر بار ہوتا ہے لہٰذا قدرت نے اس کو جائز نہیں رکھا۔ ایسا روزہ حضرت مریمؑ نے ایک دن رکھا تھا اس کے بعد پھر کبھی نہیں رکھا۔ چونکہ وقتی مصلحت یہ تھی کہ وہ کسی سے کلام نہ کریں لہٰذا صرف ان کے لیے جائز قرار دیا تھا۔

روزہ صرف اس کا نام نہیں کہ آدمی دن بھر کھائے پیئے نہیں یہ تو روزہ کی سب سے ادنیٰ قسم ہے بلکہ صحیح روزہ یہ ہے کہ اپنے نفس میں پاکیزگی پیدا کی جائے۔ اعلیٰ صورت یہ ہے کہ زبان سے جھوٹ نہ بولے۔ آنکھ سے کسی نامحرم عورت کو بنظرِ بد نہ دیکھے۔ کان سے کسی کی غیبت نہ سنے۔ ہاتھوں سے چوری کا مال نہ پکڑے۔ پیروں سے بارادۂ بد کسی طرف نہ جائے۔ دل میں بدی کا ارادہ نہ کرے کسی پر ظلم نہ کرے۔ مکر و فریب سے کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ زیادہ وقت یادِ خدا میں بسر کرے۔ رمضان ہی وہ مقدس مہینہ ہے کہ جس میں پورا قرآن لوحِ محفوظ پر نازل کیا گیا اور وہاں سے تھوڑا تھوڑا حضرت رسولِ خدا پر ۲۳ سال کے اندر آتارہا۔ یہی وہ متبرک مہینہ ہے جس کی شب قدر ہے یعنی رمضان کی ۲۳ ویں شب۔ اس رات کو خدا نے ایک ہزار رات (یعنی بنو امیہ کے تمام عہدِ حکومت سے) بہتر بیان فرمایا ہے۔ یہی وہ رات ہے جس میں روح فرشتہ اور ملائکہ ولی عصر اور امامِ زمانہ پر صبح تک احکامِ الٰہی لے کر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ روزہ دار کو چاہیئے کہ یہ تمام رات عبادتِ الٰہی میں بسر کرے۔ اس شب کے بیشمار فضائل ہیں۔ جو لوگ امام غائب کو نہیں مانتے وہ بتائیں کہ ملائکہ اس رات کس پر نازل ہوتے ہیں۔ کیا کسی عالم کسی امامِ جماعت کسی امامِ فقہ کسی ولی کسی پیر نے آج تک یہ دعویٰ کیا ہے کہ فرشتے احکامِ الٰہی لے کر ہم پر آتے ہیں۔ کوئی یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ فرشتے غیر معصوم کے پاس آ ہی نہیں سکتے اور نہ غیر معصوم اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ خدا کے احکام اس پر نازل ہوں۔ سوائے امام منصوص من اللہ اور جانشین رسولؐ کے ملائکہ کا نزول کسی پر نہیں ہو سکتا۔ شب قدر ہر سال آتی ہے پس لامحالہ ہر زمانہ میں امام کا وجود ضروری ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ

خدا تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے سختی کرنی نہیں چاہتا اور شمار کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس لیے کہ خدا نے جس راہ پر تم کو لگا دیا ہے غنیمت سمجھ کر اس کی بڑائی کا اظہار کرو اور اس کے شکر گزار بندے بنو۔ اور اے رسول جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان کے پاس ہی ہوں اور جب مجھ سے کوئی دُعا مانگتا ہے تو میں ہر دُعا کرنے والے کی دُعا کو سُن لیتا ہوں اور (جو مناسب ہوتو) اس کو قبول کرتا ہوں پس انہیں چاہیئے کہ میرا ہی کہنا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر آجائیں — (مسلمانو) تمہارے واسطے روزوں کی راتوں میں اپنی بی بی کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ عورتیں گویا چولی ہیں اور تم ان کے لیے گویا دامن ہو۔ خدا نے دیکھا کہ تم گناہ کر کے اپنا نقصان کرتے تھے کہ آنکھ بچا کر اپنی بی بی کے پاس چلے جاتے تھے تو اُس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہاری خطا سے درگزر کی پس اب تم ہم بستری کرو اور (اولاد سے) جو کچھ خدا نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے مانگو اور کھاؤ پیئو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی کالی دھاری سے آسمان پر (پورب کی طرف) تمہیں صاف نظر آنے لگے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ۔ یعنی اللہ نہیں چاہتا کہ تم بیماری کی حالت میں بھی روزہ رکھو جس سے بیماری اور بڑھے۔ یا سفر میں جو زحمت اٹھانا پڑتی ہے اس میں اضافہ ہو مگر صحت کے بعد اور سفر سے لوٹنے پر اور بیماری سے اچھا ہونے پر جتنے روزے

قضا ہوئے ہیں ان کو پورا کرو اور میری بزرگی کے ساتھ مجھے یاد کرو اور جو سہولتیں میں نے تم کو دی ہیں اس پر میرا شکر ادا کرو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ۔ یعنی جب کوئی بندہ مجھ سے دعا کرے تو وہ مجھے اپنے سے دُور نہ جانے میں اس کے قریب ہوں یعنی میرا علم ہر شئے کو محیط ہے اور میں ہر ایک کی آواز کو اس طرح سنتا ہوں جیسے قریب سے سننے والا سنتا ہے اور میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں بشرطیکہ کوئی مصلحت مانع نہ ہو اور اس کی دعا شریعت کے خلاف نہ ہو۔ روزہ دار کی دعا سب سے جلد قبول ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کے دل میں اکثر یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے دُعا قبول کرنے کا وعدہ تو کیا ہے لیکن جب ہم دعا کرتے ہیں تو قبول نہیں کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا نے یہ شرط بھی تو لگا دی ہے کہ مجھ پر ایمان بھی لاؤ۔ یعنی مجھ پر پورا پورا اعتماد بھی رکھو مجھے اپنا معبود برحق بھی تو جانو۔ تاخیر قبولیت میں میری طرف سے بدظن بھی تو نہ ہو۔ تم تو اپنے مستقبل کو دیکھنے والے نہیں ہو میں تو دیکھنے والا ہوں میں اگر یہ جانوں کہ تمہاری دعا قبول کرنے سے تمہارے آئندہ حالات خراب ہو جائیں گے یا کوئی مصیبت تم پر نازل ہو جائے گی تو ایسی حالت میں میں تمہاری دعا کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو جب میری مصلحت ہو گی جلد یا بدیر تمہاری دُعا قبول کروں گا دوسرے ان شرائط کے تحت دعا کرو جو دعا کے لیے تم کو تمہارے رسولؐ نے بتا دیے ہیں۔ پہلے خدا کی حمد و ثنا کی جائے پھر اس کے احسانات کا ذکر ہو پھر اپنی بندگی اور مجبوری کا اقرار ہو پھر اس پر اعتمادِ کُلّی کا اظہار ہو تو دُعا ضرور قبول ہو گی۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ۔ جب تک رات کے وقت عورتوں کے ساتھ ماہِ رمضان میں مباشرت کا حکم نہ آیا لوگ چھپ چھپ کر اپنی بی بیوں کے پاس جاتے تھے اور جب یہ راز افشا ہو جاتا تھا تو اظہارِ ندامت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے رحم فرما کر یہ قید برطرف فرما دی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ الخ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے خدا کی مراد کیا ہے؟ ابن عباس سے مروی ہے کہ میاں بی بی ایک دوسرے کے آرام کا باعث ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وقتِ مباشرت ایک دوسرے سے لباس کی طرح چمٹا رہتا ہے اس لیے لباس کا لفظ فرمایا ہے۔ بعض نے کہا ہے عورتیں تمہارا فرش ہیں اور تم ان کا لحاف ہو۔ مجھے تو مولانا فرمان علی صاحب مرحوم کا ترجمہ پسند آیا "چولی دامن کا ساتھ"۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَى الَّیْلِ ج۔ یعنی جب تک شام کو شفق کی سرخی پر سیاہی نہ آجائے یا مشرق میں سیاہی پیدا نہ ہو اس وقت تک افطار نہ کرو۔ اس آیت میں الی اللیل کے معنی ہیں جہاں سے رات شروع ہو۔ اسی طرح آیہ وضو میں اِلَى الْمَرَافِقِ سے یہ مطلب ہے کہ جہاں سے کہنی شروع ہو وہاں سے دھوؤ۔ یہ نہیں کہ کہنیوں تک دھوؤ۔ یا رات داخل ہونے سے پہلے افطار کرلو مشرق کی سُرخی یہ بتاتی ہے کہ مغرب میں سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا اس کی ہلکی شعاعیں مشرق کے افق پر پڑ رہی ہیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ لا فِی الْمَسٰجِدِ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ط كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع
یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط

اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے بیٹھو تو اپنی بیبیوں سے رات کو بھی ہم بستری نہ کرو یہ خدا کی معیّن کی ہوئی حدیں ہیں تم ان کے پاس نہ جانا۔ خدا یوں کھُلم کھلا اپنے احکام لوگوں سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ نافرمانی سے بچیں اور تم ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھا جاؤ اور نہ مال کو (رشوت میں) حکام کے یہاں جھونک دو تاکہ لوگوں کے مال سے جو کچھ ہاتھ لگے بغیر استحقاق خورد بُرد کر جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ تم سے لوگ پوچھتے ہیں چاند کے بارہ میں کہ یہ کیوں گھٹتا بڑھتا ہے، تم کہہ دو اس سے لوگوں کو دنیوی امور اور حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔

ماہِ صیام کی آخری دس تاریخوں میں مساجد کے اندر اعتکاف کی عبادت بجالانے میں سوائے ضروری حاجتوں کے اور کسی کام کے لیے صاحبِ اعتکاف کو مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ رمضان کی راتوں میں روزہ دار کو وقتِ شب اپنی بی بی سے جماع کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن بحالت اعتکاف اس کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اعتکاف تو صرف دن رات عبادت کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔ اعتکاف تین دن سے کم نہیں ہوتا۔ اس آیت کے نزول سے پہلے لوگ مسجد سے گھر میں آجاتے تھے اور عورت سے مباشرت کر کے پھر مسجد میں جا پہنچتے تھے۔ لہٰذا اس آیت نے ان کو اس کام سے روک دیا۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ یعنی جو حدودِ الٰہی ہیں ان کے قریب بھی نہ جاؤ ورنہ احتمال ہے کہ اگر کسی وجہ سے ایک قدم آگے بڑھ گیا تو داخلِ معصیت ہو جاؤ گے۔ مثلاً ایک شخص باغ کی سیر کر رہا ہو اور اس کے کنارہ پر گہرا کھڈ ہو تو مقتضائے احتیاط یہ ہے کہ کنارہ کے پاس ہی نہ جائے ورنہ ممکن ہے پاؤں پھسل جائے اور کھڈ میں گر پڑے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ حدودِ الٰہیہ میں وہ کوئی جواز کی صورت پیدا کرنے کی دھن میں رہتے ہیں اور حرام کو اپنے لیے حلال کرنا چاہتے ہیں اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس کو وہ حلال سمجھ کر کرتے ہیں وہ حُرمت کی حد میں داخل ہوتا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ الخ۔ یعنی باطل طریقہ سے مال مت کھاؤ جیسے جُوا کھیلنا۔ خیانت کرنا۔ کسی سے زبردستی چھین لینا۔ سود لینا اور حاکموں کے پاس ایسے جھگڑے لے جانا جس میں حاکم کو رشوت دے کر مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کرا لیا جائے۔

یَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ۔ یہودی اکثر حضرت رسولِ خداؐ سے چاند کے متعلق سوال کیا کرتے تھے کہ کیا وجہ ہے کہ یہ چھوٹے

سے بڑا اور بڑے سے چھوٹا ہوتا رہتا ہے۔ خدا نے بتایا کہ یہ وقت کی نشانیاں ہیں۔ اس سے تاریخوں کا شمار ہوتا ہے اور اوقاتِ عبادت کا پتہ چلتا ہے۔ حج، صوم، عدت وغیرہ جیسی عبادتیں اسی چاند کے ذریعہ اپنا وقت بتاتی ہیں۔

اسلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اپنی جنتری سورج سے نہیں بنائی بلکہ چاند سے بنائی ہے اس میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ شمسی نظام کی رُو سے کئی مہینے ۳۱ دن کے ہوتے ہیں۔ قمری نظام میں کوئی مہینہ ۳۱ دن کا نہیں ہوتا۔ اس طرح مزدوروں کو ایک دن کی تنخواہ کا گھاٹا نہیں ہوتا۔ دوسرے رویت ہلال کے وقت ہر ماہ دعائیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ تیسرے مسلمانوں کا قبلہ مغرب میں ہے اور ہر مہینہ کا پہلا چاند مغرب ہی سے طلوع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس خصوصیت کو وہ نیک فال سمجھتے ہیں۔ چوتھے لوگوں کے ایمان کی جانچ ہوتی ہے جو رویت ہلال کی جھوٹی گواہی اپنے کسی مطلب کی وجہ سے دیتے ہیں۔ ان کے ایمان کا نقصان ظاہر ہو جاتا ہے اور عبادتوں کے غلط وقت پر پڑھنے کا تمام الزام ان پر عاید ہوتا ہے۔ حیض کی تاریخوں کا حساب بھی چاند سے لگایا جاتا ہے۔

آیت میں حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ کئی روز کی مسلسل عبادت ہے اس کے اوقات کا تعین رویت ہلال سے کیا جاتا ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ج وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ج وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ج فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ط كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیکی اس کے لیے ہے جو پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں آنا ہو تو اس کے دروازوں سے آؤ اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو اور جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو، خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا اور تم ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اور ان لوگوں کو جنہوں نے تمہیں (مکہ سے) شہر بدر کیا ہے تم بھی نکال باہر کرو اور فتنہ پردازی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے اور جب تک یہ لوگ (کفار) مسجد الحرام (کعبہ) کے پاس تم سے نہ لڑیں تم بھی ان سے اس جگہ نہ لڑو۔ ہاں اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان کو قتل کرو کیونکہ کافروں کی یہی سزا ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ الخ۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھتا تھا تو پھر گھر میں دروازہ سے نہیں آتا تھا بلکہ پشت کی طرف سے کسی سیڑھی یا کھڑکی سے آتا تھا یا دیوار توڑ کر۔ اور ایسا نہ کرنے والے کو فاجر سمجھتے تھے۔ یہ طریقہ تمام قبائلِ عرب کا تھا سوائے چند قبیلوں کے جیسے قریش، بنی عامر، ثقیف اور کنانہ۔ اتفاقاً احرام کے وقتوں میں ایک دفعہ حضرت رسولِ خدا دروازہ سے باہر نکلے، آپ کے پیچھے رفاعہ انصاری بھی نکلا۔ مہاجر و انصار نے اسے فاجر کہا۔ جب حضرت رسولِ خدا نے رفاعہ سے سبب پوچھا تو اس نے کہا میں نے آپ کی پیروی کی ہے۔ فرمایا مجھ کو حالتِ احرام میں دروازہ سے نکلنا جائز ہے کیونکہ میں قریشی ہوں اور تم قریشی نہیں ہو۔ اس نے کہا اگر آپ قریشی ہیں تو میں قریشی کا پیرو ہوں کیونکہ میں آپ کا دین رکھتا ہوں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اس کی باطنی تفسیر یہ ہے کہ علم کو ان لوگوں سے حاصل کرو جو علمِ دین کے دروازہ ہیں۔ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نے یہ بتایا ہے کہ جس بات کو حاصل کرنا ہو تو جو اس کا اہل ہو اس سے حاصل کرو نا اہل کے پاس نہ جاؤ۔ جس طرح مکان میں دروازہ سے جانا مناسب ہے اور عقلِ سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے اس طرح کسی چیز کا حاصل کرنا اس کے اہل سے چاہیئے۔ حضرت رسولِ خدا نے اس مضمون کو کئی طرح سے ادا کیا ہے۔ کبھی فرمایا اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ (میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں)، اور کبھی فرمایا، مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَاْتِ مِنَ الْبَابِ (جو علم حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ دروازہ سے آئے) اور یہ بھی فرمایا مَنْ يَاْتِ مِنْ غَيْرِ بَابِهَا سُمِّيَ سَارِقًا (جو دروازہ چھوڑ کر کسی اور دروازہ سے آئے گا وہ چور سمجھا جائے گا۔) اور یہ بھی فرمایا اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا (میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں)۔ لوگوں نے آیت کے ظاہری معنی تو لیے اور باطنی معنی چھوڑ دیئے۔

رسولِ خدا کا فرض تھا کہ اپنی امت کو بتا جائیں کہ علمِ دین میرے بعد کس سے حاصل کیا جائے گا۔ ورنہ ہر کس و ناکس سے تعلیم حاصل کرنا اپنے کو گمراہی میں ڈالنا ہے کیونکہ علومِ دینیہ کا پورا پورا علم علیؑ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو بعد رسولؐ اس کا تجربہ ہوا کہ جب کوئی اہم مسئلہ سامنے آتا تھا تو علیؑ ہی کی طرف دوڑتے تھے۔

ابنِ عباسؓ فرمایا کرتے تھے میرا اور تمام اصحابِ محمدؐ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے سات سمندروں کے مقابل ایک قطرہ۔

آگے آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کفار چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو اے مسلمانو تم بھی خاموش رہو اور اگر وہ قتل پر تُل بیٹھے ہوں تو پھر تم بھی اپنی تلواریں نیام سے نکال لو اور پھر چاہے حرم میں ہوں یا غیر حرم میں جہاں پاؤ اچھی طرح ان کو قتل کرو ورنہ یہ لوگ باز نہ آئیں گے۔ اور جس طرح انہوں نے تم کو مکہ سے نکالا تھا تم بھی ان کو شہر بدر کرو۔ مگر ہاں اس کا خیال رکھو کہ حرمِ خدا کے اندر قتل کا سلسلہ تمہاری طرف سے شروع نہ ہو اس کی حرمت تمہارے ہاتھوں نہ جائے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ یعنی اے مسلمانو تم حرم میں قتال کرنا تو بُرا جانتے ہو لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ حرم میں بت پرستی کرنا اور بتوں کو خدا کا شریک بنانا اور تم کو حج و عمرہ سے روکنا کیسی سرکشی ہے یہ تو قتل سے کہیں بڑی ہوتی ہے پھر تم سے یہی تو کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ تم سے حرم میں نہ لڑیں تو تم بھی نہ لڑو ورنہ بدرجہ مجبوری تو تمہیں ان سے لڑنا ہی ہوگا پھر چاہے جہاں کہیں بھی ہو۔ کیونکہ کافروں کی سزا تو یہی ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

پھر اگر وہ لوگ باز آجائیں تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور (نہ مانیں) تو اُن سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور صرف خدا ہی کا دین رہ جائے۔ (اس کے بعد) اگر وہ لوگ باز رہیں تو زیادتی نہ کرو کیونکہ ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی اچھی نہیں۔ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے برابر ہے اور صرف مہینوں ہی کی خصوصیت نہیں سب حرمت والی چیزیں ایک دوسرے کی برابر ہیں پس جو شخص تم پہ زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی ان پر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں کا ساتھی ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کیا کرو اور اپنے ہاتھوں اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ ۔ اسلام نے سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینوں کو صاحبِ حرمت قرار دیا ہے یعنی رجب، شوال، ذی قعد اور ذی الحجہ۔ ان میں جنگ اس مصلحت سے حرام قرار دی گئی ہے کہ مجاہدین کچھ دن آرام کر لیں اور سامانِ حرب بھی ٹھیک کر لیں حضرتؐ کی بعثت کے قبل بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب اسلام نے بھی ان مہینوں کو محرم رکھا اور مسلمان اس کے پابند ہو گئے تو کفار ان پر مختلف حیلوں سے حملہ کرتے اور مسلمان حرمت کے خیال سے چپ رہ جاتے۔ تب خدا نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ادب، ادب والوں کیساتھ ہوتا ہے جب وہ لوگ اس کا خیال نہیں کرتے اور تمہارے پیچھے پڑے ہیں تو تم بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دو۔ ہاں اگر باز آجائیں تو پھر ان پر زیادتی نہ کرو یعنی لڑو نہیں۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ الخ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ تمہاری جانوں کا مالک اللہ ہے تمہیں یہ حق نہیں کہ احتیاط سے کام لے کر بے موقع لڑائی جھگڑا کر کے اپنے کو خطرہ میں ڈال دو۔ جہاد کے سوا جو نبیؐ یا امامؑ کے حکم سے ہو تم پر اپنی جان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اسی طرح مال کے متعلق حکم ہے کہ اُسے مرضئِ الٰہی کے مطابق صرف کرو۔ اس کی محبت میں خرچ کرو خلوصِ نیت سے خرچ کرو۔ اسراف سے بچے رہو۔ جان و مال دونوں کے متعلق جو احکام الٰہی ہیں ان کا ہر حالت میں لحاظ رکھو۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَھْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

اور عمرہ اور حج کو خاص خدا کے لیے پورا کرو پس اگر تم محصور ہو جاؤ تو قربانی سے جو بھی میسّر آئے کر دو اور اپنے سروں کو نہ مُنڈاؤ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی قسم کی تکلیف ہو تو اس کا بدلہ روزے یا خیرات یا قربانی ہے پھر جب امن حاصل ہو جائے تو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھانا چاہے تو قربانی کے لیے جو بھی میسّر آئے کر دے اور جسے میسّر نہ ہو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور جب تم واپس آجاؤ تو سات دن اس کے بعد رکھ دو کہ یہ سب ملا کر دس دن ہو جائیں گے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مسجد الحرام (مکّہ) اور اس کے مضافات کے رہنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جان لو کہ وہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

حج کی تین قسمیں ہیں، حج تمتّع حج افراد اور حجِ قِران حج تمتّع ان لوگوں پر واجب ہے جو مکّہ معظّمہ سے ۱۲ میل یا اس سے زیادہ فاصلہ پر رہتے ہیں اور جو خاص مکہ یا بارہ میل کے اندر رہنے والے ہیں ان کے واسطے حج قِران یا افراد ہے۔

حج تمتّع کی یہ صورت ہے کہ جس کا جو میقات ہو وہاں سے عمرہ کا احرام باندھے پھر مکہ میں جائے اور خانہ کعبہ کا طواف کرے اور مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز بجا لائے پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور تقصیر کرے اور مُحل ہو جائے۔ اس کے بعد ۸ر ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے اور نویں ذی الحجہ کو عرفات میں جائے اور غروب تک وہاں ٹھہرے اور اعمال بجا لائے اس کے بعد مشعر الحرام میں آئے اور صبح تک وہاں رہے اور اعمال کرے دسویں کی صبح کو منیٰ میں آئے اور سر منڈوائے اور قربانی کرے اور جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکے اس کے بعد اگر چاہے تو اسی دن یا اس کی صبح کو مکّہ چلا آئے اور طواف حج کرے اور نماز طواف پڑھے

سعی کرے طوافِ صفا و مروہ کرے اسکے بعد پھر منیٰ میں آئے اور تین مقامات پر جو کنکریاں پھینکنی رہ گئی تھیں انہیں پھینک کر حج تمام کرے اگر چاہے تو گیارہویں بارہویں کو کوچ کرکے مکہ آئے اور طواف وغیرہ بجالا کر حج کو تمام کرے۔

عرفات ایک مقام کا نام ہے جو مکہ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر ہے وہاں نویں ذی الحجہ کو جاکر کچھ خاص اعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اور مشعر الحرام، مکہ اور عرفات کے درمیان ہے جہاں شب دہم ذی الحجہ قیام کرکے کچھ اعمال کرتے ہیں اور کنکریاں جمروں پر مارنے کے لیے چنتے ہیں۔ مشعر الحرام اور مکہ کے درمیان ایک مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے گئے تھے یہ مقام منیٰ میں ہے جہاں قربانی کی جاتی ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ (۱۹۷) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۚ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (۱۹۸) ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۹)

حج کے مہینے تو اب سب کو معلوم ہیں (رجب، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) پس جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج واجب کرلے تو احرام سے آخر حج تک نہ تو عورت کے پاس جائے نہ کوئی گناہ کرے اور نہ کسی سے جھگڑے اور نیکی کا کوئی سا بھی کام کرو خدا اس کو خوب جانتا ہے اور راستہ کے لیے زادِ راہ مہیا کرو اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے، اے عقلمندو مجھ سے ڈرو۔ اس میں کوئی الزام نہیں کہ حج کے ساتھ تم اپنے پروردگار کے فضل (نفع تجارت) کی خواہش کرو اور پھر جب تم عرفات سے چل کھڑے ہو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو اور اس طرح اس کی یاد کرو جس طرح تمہیں بتایا ہے اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے پھر جہاں سے لوگ چل کھڑے ہوں وہیں سے تم بھی چل کھڑے ہو اور خدا سے مغفرت کی دعا مانگو بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

عمرہ کو حج اصغر کہتے ہیں جو رجب، شوال، ذی قعدہ و ذی الحجہ میں بجالاسکتے ہیں۔ حج کے اعمال ۸ ر ذی الحجہ سے شروع ہوتے ہیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۲) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵) وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (۲۰۶)

جب تم ارکانِ حج بجالا چکو تو اسی طرح ذکر خدا کرو جس طرح تم اپنے باپ داداؤں کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پھر بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے میرے پروردگار ہم کو جو دینا ہے دُنیا ہی میں دیدے حالانکہ پھر آخرت میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہوگا اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ دُعا کرتے ہیں اے ہمارے پالنے والے مجھے دُنیا میں نعمت دے اور آخرت میں ثواب دے اور دوزخ کی آگ سے بچائے رکھنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اپنی کمائی کا حصّہ چَین ہے اور خدا بہت جلد حساب لینے والا ہے اور ان گنتی کے چند دنوں تک تو خدا کا ذکر کرو پھر جو کوئی جلدی کر بیٹھے اور منیٰ سے دو ہی دن میں چل کھڑا ہو تو اس پر بھی گناہ نہیں اور جو تیسرے دن تک ٹھہرا رہے تو اس پر بھی گناہ نہیں لیکن یہ رعایت اس کے لیے ہے جو پرہیز گار ہو اور خدا سے ڈرتے رہو اور یقین جانو کہ تم سب کے سب اسی کی طرف قبروں سے اُٹھائے جاؤ گے۔ اے رسول بعض لوگ منافقین میں ایسے بھی ہیں جن کی چکنی چپڑی باتیں اس دنیوی زندگی میں تمہیں بہت پسند ہیں اور وہ اپنی دِلی محبت پر خدا کو گواہ مقرر کرتا ہے حالانکہ وہ تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہے جہاں تمہاری طرف سے منہ پھیرا

اور اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ ملک میں فساد پھیلائے اور زراعت و مویشی کا ستیاناس کر دے اور خدا فساد کو اچھا نہیں سمجھتا اور جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو اسے غرور گناہ پر اُبھارتا ہے پس ایسے کمبخت کے لیے جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔

حج تو اسلام سے پہلے بھی ہوتا تھا مگر عرب کا قاعدہ تھا کہ اعمالِ حج سے فارغ ہو کر باہمی مفاخرت کے لیے چوڑے قصے چھیڑ دیتے تھے کوئی اپنے باپ دادا کی شجاعت بیان کرتا کوئی سخاوت کوئی محتاجوں سے ہمدردی اور رشتہ داروں سے حسن سلوک اور اس پر فخر کرتے اور قصیدے پڑھتے۔ خدا نے ان کو بہ نرمی اس سے روکا اور فرمایا کہ اگر تمہیں بات ہی کرنی ہے تو خدا کی یاد کرو۔ پدرم سلطان بود کہنے سے کیا فائدہ۔ تمہارے لیے تو فخر کی بات یہ ہے کہ خدا سے لَو لگاؤ اور اس کی یاد میں اپنا وقت گزارو۔

فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً سے یہ مراد ہے کہ دنیا میں مجھے علم کی نعمت دے اور آخرت کے ثواب سے مراد بہشت ہے۔ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو شکر گزار دل اور ذکرِ خدا کرنے والی زبان اور ایماندار بی بی ملی جو اس کو دین و دنیا کے کاموں میں مدد دے تو اُسے دنیا و آخرت دونوں قسم کی نیکی مل گئی۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص منیٰ میں ہو وہ دسویں کی نماز ظہر سے تیرھویں کی نماز صبح تک پندرہ نمازوں کے بعد اور جو دوسری جگہ ہو تو وہ دسویں کی ظہر سے بارھویں کی صبح تک دس نمازوں کے بعد یہ تکبیریں پڑھے اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا رَزَقَنَا مِنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَا اَوْلَانَا۔ چند دنوں سے مراد ۱۱، ۱۲، ۱۳۔ ذی الحجہ ہے اور ان کو ایامِ تشریق کہتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع

۲۵ ع ۹

اور لوگوں میں خدا کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور خدا ایسے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے اے ایمان والو اسلام میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے

قدم بقدم نہ چلو وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔ پھر جب تمہارے پاس روشن دلیلیں آچکیں تو سمجھ لو کہ خدا ہر طرح غالب اور تدبیر والا ہے۔ کیا وہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ سفید ابر کے سائبانوں کی آڑ میں عذابِ خدا اور عذاب کے فرشتے ان پر آ ہی جائیں اور سب جھگڑے ایک بار ہی چُک جائیں آخر کُل اُمور خدا ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جب کفارِ مکہ نے حضرت رسولِ خدا کے قتل پر کمر باندھی اور یہ طے کیا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نمائندہ اس قتل میں شریک ہو تاکہ بنی ہاشم ان سب سے قصاص طلبی پر قادر نہ ہوں۔ ایک رات اپنے اس منصوبہ کی بنا پر حضورؐ کے گھر کو آ گھیرا اور برہنہ تلواریں لے کر اس کے منتظر ہوئے کہ جونہی صبح کو حضرتؐ اپنے گھر سے نکلیں گے ان کو تلواروں کی باڑوں میں رکھ لیا جائے گا۔ ان کے اس ارادۂ بد سے اللہ تعالیٰ نے اوّل شب ہی میں آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہ حکم دے دیا تھا کہ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سُلا کر آپ غارِ ثور کی طرف چلے جائیں اور وہاں سے مدینہ کا رُخ کریں۔ جب گھر سے نکلیں تو مٹھی بھر خاک شَاهَتِ الْوُجُوْهُ کہہ کر ان کی طرف پھینکنا۔ وہ وقتی طور پر اندھے ہو جائیں گے تم اُن کے درمیان سے نکلے چلے جانا۔ جب وحی نے یہ اطلاع دی تو آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، کفارِ مکہ نے میرے قتل کا ارادہ کیا ہے تم میرے بستر پر میری عبا اُوڑھ کر سو رہو وہ لوگ سمجھیں گے میں سو رہا ہوں اور میں غارِ ثور کی طرف جاتا ہوں۔ تم میرے جانے کے تین دن بعد زنانِ بنی ہاشم کو ساتھ لے کر اور جن لوگوں کی امانتیں میرے پاس ہیں ان کو اُن کے مالکوں تک پہنچا کر مدینہ کی طرف کوچ کرنا میں وہاں تمہارا منتظر رہوں گا۔ حضرت علیؑ نے عرض کی اگر میرے یہاں رہنے سے آپ کی جان بچ جائے گی تو میری جان جائے یا رہے میں یہ خدمت ضرور انجام دوں گا۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ الخ حضرت علیؑ کی تعریف میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ و میکائیلؑ سے فرمایا میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ (اخوت) قرار دیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی تم میں کون ایسا ہے کہ اپنی زیادہ عمر کا حصہ اپنے بھائی کو دے دے، مگر دونوں نے اس سے انکار کیا۔ تب خدا نے ان دونوں سے فرمایا کہ میں نے نبی اور علی میں بھائی چارہ قرار دیا ہے۔ دیکھو علی نے اپنی جان نبیؐ پر کیونکر نثار کی ہے اور بسترِ نبی پر کیسا بے خوف سو رہا ہے۔ لہٰذا تم دونوں زمین پر جاؤ اور علی کی حفاظت اس کے دشمنوں سے کرو۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں زمین پر آئے اور جبریلؑ، علیؑ کے سرہانے اور میکائیلؑ پائنتی ان کی حفاظت کرنے لگے اور کہتے جاتے تھے مبارک ہو اے علیؑ مبارک ہو اے علیؑ تمہارا مثل کون ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس ہمدردی پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ اس واقعہ کو تفسیرِ ثعلبی احیاء العلوم امام غزالی میں آپ ملاحظہ فرماویں۔

واقعہ کی تاریخی حیثیت ختم ہو گئی اب اس کے مضمرات پر روشنی ڈالنا باقی ہے:

۱۔ علیؑ کے ایمان کا اندازہ کیجئے کہ رسولؐ کی صداقت پر کس پایہ کا یقین تھا کہ ہلکا سا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا ایسے موقعوں پر فطرۃً انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جان بچی تو جہان بھلا۔ رسولؐ اپنی جان تو بچانا چاہتے ہیں اور مجھے خون آشام تلواروں کی دھاروں پر رکھ رہے ہیں ایسے خونخواروں کے نرغہ میں ہلاکت سے کیسے بچ سکتا ہوں۔ لیکن ایسے واہی خیالات علیؑ جیسے کامل الایمان انسان کے دل میں کیسے گزر سکتے تھے۔ انھوں نے ایمان کی بھرپور قوت کے اعتبار سے جواب دیا کہ میں ہزار جان سے یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔

۲۔ اس کے ساتھ دوسرے خطرہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ حضورؐ اپنی امانتوں کو سپرد کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں جس کی جو امانت ہو اُسے دے کر آنا۔ علی علیہ السلام کے لیے یہ کیسا نازک موقع تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ مکہ کا چپہ چپہ ذرہ ذرہ اس بنا پر ان کے خون کا خواہاں تھا کہ وہ حضرت رسولِ خدا کے معتمد خاص اور چچازاد بھائی تھے گھر گھر جاکر امانت سپرد کرنا جہاں کوئی اپنا ہمدرد اور مددگار نہ ہو۔ علیؑ کی انتہائی شجاعت کی دلیل ہے کتنا اعتماد تھا ان کو خدا کی مدد پہ کہ ذرا نہ گھبرائے اور بخوشی اس خدمت کو منظور کر لیا۔

۳۔ تیسرا مرحلہ اور زیادہ سخت تھا یعنی زنانِ بنی ہاشم کو اپنے ساتھ مدینہ لے جانا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات تھی۔ اوّل تو سواری کا مہیا کرنا۔ پھر گرمی کے موسم میں، ریگستان کا سفر۔ پہاڑوں سے گزر۔ کئی عورتوں کی حفاظت اور تن تنہا کے سپرد۔ ہر قدم پر دشمن کے پیچھا کرنے اور قتل و غارت کرنے کا خوف بہادر سے بہادر آدمی کے دل کو لرزانے کے لیے کافی تھا۔ مگر حضرت علی علیہ السلام کے پاس خوف کہاں۔

۴۔ یہ سفر کس مصیبت سے طے کیا۔ بعض نے لکھا ہے دو اُونٹ بمشکل کرایہ پر لیے۔ خود پیدل چلے۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ مدینہ پہنچے تو اس حال میں کہ پائے مبارک اور پنڈلیاں لہولہان تھیں۔ قدم اُٹھانا دوبھر تھا۔ کیا یہ خدمات ایسی معمولی تھیں کہ مسلمانوں نے اس طرح نظر انداز کیں کہ آپؑ کے متعلق اتنا لکھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ یہ آیت علیؑ کی شان میں ہے۔ اس کا مفہوم عام لوگ کے سر تھوپ کر رہ گئے۔

۵۔ اس پُرخوف رات میں دوسرا ہوتا تو نہ معلوم فرطِ اضطراب سے اپنا کیا حال بنالیتا۔ مگر دیکھیے علی علیہ السلام کس اطمینان سے سو رہے ہیں۔ کسی نے آپؑ سے پوچھا کہ آپؑ تمام رات عبادت کرتے ہیں کیا کسی رات آپ پیر پھیلا کر سوئے بھی ہیں؟ فرمایا، ہاں! ایک رات میں بڑے چین سے عمر بھر میں سویا ہوں اور وہ شبِ ہجرت تھی۔ اللہ رے نفسِ مطمئنہ، جتنا خوف زیادہ اتنا ہی قلب کو اطمینان زیادہ۔

۶۔ علیؑ نے اس رات اپنے نفس کو اللہ کی مرضی کے بدلے بیچا تو اس رات کے بعد سے علیؑ کا نفس، نفسُ اللہ کہلایا گیا اور خدا کی مرضی علیؑ کی مرضی بنی۔ اب نفس اللہ ہونے کی حیثیت سے اللہ کو اختیار ہے جہاں وہ چاہے استعمال کرے۔ جس میدان میں چاہے لڑائے۔ اسی طرح اللہ کی مرضی کو بحیثیت اپنے نفس کی قیمت ہونے کے علیؑ جہاں چاہیں صرف کریں۔ جسے چاہیں جنّت میں داخل کریں۔

۷۔ علیؑ نے بسترِ رسولؐ پر سو کر کتنے فضائل حاصل کیے۔ رسولؐ کے جانشین بنے۔ اللہ کا نفس بنے۔ جانِ رسولؐ کے محافظ بنے۔ اسلام کے جان نثار بنے۔ اسلام کے سب سے بڑے محسن بنے۔

۸۔ اس پر بھی غور کر لیجیے کہ جب مشرکین تلواروں کو تانے خانہ رسالت میں داخل ہوئے تو ان کے شور و غل نے علیؑ کو جگایا۔ فوراً بستر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ بتاؤ محمدؐ کہاں ہیں؟ دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا اور پتہ بتا دیتا۔ مگر امیرالمومنینؑ کے پاس گھبراہٹ کہاں۔ بھر پور استقلال سے جواب دیا کہ کیا مجھے

سونپ گئے تھے جو پُوچھنے آئے ہو جہاں ہو پتہ لگالو۔

شاہِ مرداں شیرِ یزداں قوتِ پروردگار لافتیٰ اِلاّ علی لاسیف اِلاّ ذوالفقار

اگر اس واقعہ سے انکار کیا جائے تو یہ بتانا پڑے گا کہ شبِ ہجرت فرشِ رسولؐ پر کون سویا تھا۔ امانتیں کس نے لوٹائی تھیں۔ زنانِ بنی ہاشم کو لے کر کون گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سب کام علیؑ نے کیے تھے۔

اب اس کے بعد دوسری آیات پر غور کیجیے۔

خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں لیکن شیطان جو لوگوں کے پیچھے لگا ہُوا ہے وہ نہیں چاہتا کہ لوگ خدا اور رسولؐ پر ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ کو اسی لیے بھیجا اور انھوں نے مختلف قسم کے معجزے بھی دکھائے عذابِ خدا سے ڈرایا بھی مگر جو جہنم کا ایندھن بننے والے تھے وہ ایمان نہیں لائے اور انھوں نے قطعاً اس بات پر غور نہ کیا کہ ایک دن انہیں پلٹ کر خدا کے یہاں جانا ہے۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾

بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے انہیں کتنی کھُلی نشانیاں دیں پس جو کوئی اللہ کی نعمتوں کو اس کے بعد بھی کہ اس کے پاس آچکی ہوں بدل ڈالے تو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے کافروں کے لیے دنیا کی زندگانی سجائی گئی ہے وہ ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں ہنسی مخول کرتے ہیں حالانکہ جو لوگ متقی و پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن

ان پر فوقیت رکھتے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ ابتدا میں سب لوگ ایک ہی امت تھے پس اللہ نے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ کردیں لیکن اس میں اختلاف کرنے والے وہی لوگ تھے جنہیں کتاب دی گئی تھی اور ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں بھی آچکی تھیں اس کی وجہ ان لوگوں کی آپس میں شرارت تھی پس اللہ نے ان لوگوں کو جو ایمان لاچکے تھے اپنے حکم سے وہ راہِ راست دکھادی جس میں اختلاف رکھتے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔

بنی اسرائیل سے سوال کو اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ نعماتِ الٰہی کا کفران انھوں نے ہی کیا تھا۔ باوجودیکہ بہت سی اللہ کی نشانیاں ان کے پاس آئیں مگر وہ بدستور اپنے کفر پر اڑے رہے انھوں نے کتاب خدا (توریت) کی عبارتوں میں تحریف کی اس کے الفاظ بدلے اس کے مفاہیم بدلے اور حضرت رسولِ خدا کی جو صفات اس میں مذکور تھیں ان کو نکال ڈالا اور ان کی بجائے آنحضرتؐ کی مذموم صفات اس میں اپنے قلم سے لکھ دیں۔

اس کے بعد عہدِ رسالت کے کافروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے نزدیک زندگانیٔ دنیا بڑی سجی بنی تھی یہ لوگ ان لوگوں کا جو ایمان لاچکے تھے مذاق اڑاتے تھے۔ مثلاً عمار یاسرؓ۔ بلالؓ اور صہیبؓ کو جو غریب اور مسکین مسلمان تھے، جب ابوجہل وغیرہ دیکھتے تھے تو طرح طرح کی پھبتیاں ان پر چُست کرتے تھے اور طرح طرح سے ان کو ستاتے تھے اور کہا کرتے تھے ایسے کنگالوں اور رذیلوں کا ایمان لانا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً - امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ ذکر طوفانِ نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ اُس وقت سب لوگ گمراہی کی حالت میں تھے۔ ہر خطۂ زمین پر بُت پرستی ہو رہی تھی اور اوصیائے آدم ان کے خوف سے خاموش تھے اور اظہارِ دین کی جرأت نہ کرسکتے تھے کیونکہ قابیل کی طرف سے ان کو قتل کی دھمکی دی جاتی تھی یہاں تک کہ حضرت نوحؑ سے پہلے بروسی تھے، وہ عبادت کرنے کے لیے ایک جزیرہ میں چلے گئے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ - اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ کفر و شرک بڑھتا ہی جارہا ہے اپنے انبیاء کو آگے پیچھے بھیجنا شروع کردیا اور ان پر کتابیں بھی نازل کیں تاکہ جو اختلاف ان کے درمیان خدا پرستی اور بت پرستی میں پیدا ہوگیا ہے اسے دُور کردیں اور ان کے باہمی تنازعات میں جو فیصلہ حق ہو وہ ان کو سُنادیں لیکن چونکہ بغاوت اور سرکشی پر وہ لوگ اُدھار کھائے بیٹھے تھے اس لیے انبیاء کی ہدایت کو انھوں نے کان لگاکر نہ سُنا اور ان سے اختلاف رائے کرنے لگے۔ جو لوگ عقل و فہم رکھتے تھے انھوں نے ایمان قبول کرلیا۔ اور جو تابعین شیطان تھے وہ بدستور جہنم کے کندے بنے رہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ اختلافات کی خلیج کو پاٹ دیا جائے اور پوری امت ایک ہی عقیدہ پر قائم رہے لیکن مسلمان کیوں اس عقیدے پر جمے ہوئے ہیں کہ اختلافِ امت رحمتِ خداوندی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمارے رسولؐ نے فرمایا ہے: اختلاف امتی رحمۃ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے)۔ اوپر والی آیت اس کی تردید کرتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ

نے ایسا نہیں فرمایا۔ حضورؐ نے جو کتابِ خدا کے ساتھ اپنے اہلبیت کو کیا تھا وہ صرف اس لیے کہ امت کے درمیان مطالب قرآن سمجھنے میں جو اختلاف ہو، اہلبیت اس کو مٹادیں اور آیات کا جو حقیقی مفہوم ہو ان کو سمجھادیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ بہشت میں پہنچ ہی جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں پہلے زمانہ والوں کے سے حالات پیش نہیں آئے۔ انہیں طرح طرح کی تکلیفوں (محتاجی و فاقہ کشی) نے گھیر لیا تھا اور ایسے سخت جھنجوڑے گئے تھے کہ آخر عاجز ہوکر پیغمبر اور ایمان والے جو اُن کے ساتھ تھے کہنے لگے کہ دیکھئے خدا کی مدد کب آتی ہے۔ دیکھو، گھبراؤ نہیں خدا کی مدد یقیناً بہت قریب ہے۔ اے رسولؐ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ خدا کی راہ میں کیا خرچ کریں تو تم اُن سے کہو کہ تم اپنی نیک کمائی سے جو کچھ خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ، قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسیوں کا حق ہے اور تم جو نیک کام کروگے خدا اسے ضرور جانتا ہے۔

حضرت رسولِ خدا کے زمانہ میں بھی سب مسلمان تو یکساں نہ تھے جہاں ایسے لوگ تھے کہ ہر مصیبت کو صبر سے برداشت کرلیتے تھے وہاں ایسے بھی تھے جو کفار کے ستانے اور اپنی مختلف قسم کی تکلیفوں کا خیال کرکے گھبرا جاتے تھے اور مایوسی کے عالم میں کہتے تھے ہم تو انتظار کرتے کرتے تھکے جاتے ہیں، دیکھئے خدا کی مدد کب آتی ہے اور ان پریشانیوں سے کب نجات ملتی ہے۔ ان کی تسلّی کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں کہ گھبراؤ نہیں صبر سے کام لو۔ خدا کی مدد عنقریب تم تک پہنچنے والی ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ تم تو بہت امن سے ہو تم سے پہلے جو لوگ دینِ حق پر ہوتے تھے اُن کے تو ہاتھ پاؤں کاٹے جاتے تھے۔ ان کو صلیب پر چڑھایا جاتا تھا۔ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان کے واقعات پر نظر رکھتے ہوئے صبر سے کام لو۔

مَاذَا يُنْفِقُوْنَ - یہ جواب ہے ان لوگوں کے لیے جو حضرت رسولِ خدا سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا چیز راہِ خدا میں دینی چاہیے

اور اس کے مستحق کون کون ہیں۔ ان سے کہا گیا سب سے پہلے ماں باپ ہیں ان کی خدمت کیے بعد کچھ بچے تو قریبی رشتہ داروں کو دیا جائے اس کے بعد یتیم مسکین اور مسافر درجہ بدرجہ مستحق ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کوئی چیز مستحق کی بجائے غیر مستحق کو دے دیں۔ اس صورت میں دینے سے فائدہ نہ ہوگا اور جو دیا ہے وہ سب ضائع جائے گا۔ لہٰذا سمجھا دیا گیا کہ جو کچھ دو ہمارے حکم کے مطابق دو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾

مسلمانو، جہاد تم پر واجب کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم بُرا سمجھو اور حقیقتاً وہ تمہارے لیے مفید ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم اچھا سمجھو اور حقیقتاً وہ تمہارے لیے ضرر رساں ہو۔ اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ لوگ تم سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کو پوچھتے ہیں تم کہہ دو ان میں جنگ کرنا سخت گناہ ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ خدا کی راہ میں چلنے سے روکنا۔ خدا سے کفر کرنا مسجد الحرام میں جانے سے روکنا۔ اس کے اہل کو وہاں سے نکال باہر کرنا یہ سب خدا کے نزدیک اس سے بڑھ کر گناہ ہے اور فتنہ پردازی تو کشت و خون سے بھی بڑھ کر بُری ہے (یہ کفار و مشرکین تو) اے رسولؐ ہمیشہ لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور یہ یاد رہے کہ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرا تو اس کے تمام اعمال دُنیا و آخرت میں اکارت ہو جائیں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ جب جہاد کا حکم نازل ہُوا تو بعض مسلمانوں کو بہت بُرا معلوم ہُوا۔ اور اسلام لانے کو

و بالِ جان سمجھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے چونکہ آئندہ واقعات کا تمہیں صحیح علم نہیں اس لیے تم ایسی بہت سی باتوں کو ناپسند کرنے لگتے ہو جو آئندہ تمہارے لیے مفید ہونے والی ہیں اور بہت سی ایسی باتوں کو تم پسند کرنے لگتے ہو جو آگے چل کر تمہارے حق میں نقصان دہ ہوتی ہیں مثلاً شرعی تکلیفیں تمہیں شاق گزرتی ہیں مگر وہ روزِ قیامت تمہارے لیے مفید ہوں گی یا جہاد کا حکم تم پر شاق گزرا ہے حالانکہ اس کا فائدہ دنیا میں تو یہ ہے کہ ملک فتح ہوں گے، مالِ غنیمت ہاتھ لگے گا تمہارے دشمن زیر ہوں گے اور آخرت میں یہ فائدہ ہے کہ جنت میں رہو گے یا مثلاً میدانِ جنگ سے بھاگ جانا تم اچھا جانتے ہو لیکن وہ تمہارے حق میں اچھا نہیں۔ دنیا میں تو یہ نقصان ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوگے اور آخرت کا یہ نقصان ہے کہ شہادت کے مرتبہ سے محروم ہو جاؤ گے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے جنگِ بدر سے دو ماہ پہلے عبداللہؓ بن جحش اپنے پھوپھی زاد بھائی کو آٹھ اصحاب کے ساتھ جمادی الآخر کے مہینہ میں یہ کہہ کر روانہ کیا کہ قریش کا ایک قافلہ طائف سے آرہا ہے تم جا کر ان سے قتال کرو۔ عبداللہؓ نے قریش کا مقابلہ کیا عمرو حضرمی قافلۂ قریش کا سردار مارا گیا۔ جس سے شام تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا وہ رجب کی پہلی تھی مسلمانوں نے اُسے چاند رات سمجھتے ہوئے لڑائی جاری رکھی اس پر قریش نے طعنہ دیا کہ محمدؐ نے ماہِ حرام کو حلال کر دیا حضرتؐ نے عبداللہؓ بن جحش کو بُلا کر پوچھا کہ کیا ماجرا ہے، تم نے ایسا کیوں کیا؟ انھوں نے کہا دھوکا ہو گیا ہمیں قوی گمان تھا کہ آج چاند رات ہے۔ قتال کے بعد معلوم ہُوا کہ رجب کی پہلی تاریخ ہے۔ قریش نے چونکہ ماہِ حرام میں جنگ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا لہٰذا اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ماہِ حرام میں جنگ کرنا بڑی بُری بات ہے لیکن اس پر اعتراض ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا تھا جنہوں نے ۱۳ سال مسلسل اپنے سینکڑوں بھائیوں پر نہ صرف اس لیے بے پناہ مظالم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے بلکہ یہاں تک کیا کہ وہ جلا وطنی پر مجبور ہو گئے اس پر بھی بس نہ کی ان کا مسجد الحرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا حالانکہ مسجد الحرام کسی کی جائداد نہ تھی دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہ ہُوا تھا کہ کسی نے اس کا راستہ روکا ہو پس جن کا نامۂ اعمال اتنا سیاہ ہے انہیں کیا حق ہے مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا۔ قریش آنحضرتؐ کے مدینہ میں آنے کے بعد سے اس خیال سے مضطرب تھے کہ حضرتؐ ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ لہٰذا وہ حضرتؐ کے خلاف برابر غلط پروپیگنڈے میں لگے رہتے تھے، چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو توڑ کر پھر اپنے گروہ میں لے لیں چنانچہ اس غلط پروپیگنڈے کا منافقوں پر بڑا اثر ہُوا۔ اور وہ آپس میں چرچے کرنے لگے کہ ایسا کرنا ہرگز روا نہ تھا۔ خدا نے ان کو بتایا کہ اگر اس خیال پر قائم رہتے ہوئے مرو گے تو کفر کی موت مرو گے اور جتنے نیک عمل تم نے کیے ہوں گے وہ سب اکارت ہو جائیں گے کوئی اجر ان کا نہ ملے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ

الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور خدا کی راہ میں ہجرت کی اور راہِ خدا میں جہاد کیا تو ایسے ہی لوگ رحمتِ خدا کے امیدوار ہیں اور خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اے رسولؐ تم سے لوگ شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لیکن فائدہ سے ان کا گناہ زیادہ ہے۔ اور تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں تم ان سے کہہ دو کہ جو تمہاری ضرورت سے بچے اس میں سے راہِ خدا میں دو اور خدا تم سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا و آخرت کے معاملات میں غور کرو۔

اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مرتبہ ان لوگوں کا ہے جو ایمان والے ہیں اور جنہوں نے انتہائی تکالیف برداشت کر کے اپنے عزیز وطن کو چھوڑا اور ہجرت اختیار کی پھر راہِ خدا میں جہاد کیا۔ قتال و جہاد میں یہ فرق ہے کہ قتال لڑنے کو کہتے ہیں اور جہاد ہر اس قسم کی کوشش کا نام ہے جو دامے درمے قدمے سخنے حفاظتِ اسلام کے لیے کی جائے۔

جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد ہجرت سے محروم رہے یا جہاد میں شریک نہ ہوئے وہ برائے نام ہی مسلمان سمجھے گئے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ - اس آیت میں شراب جوئے کے صرف نقصان کو بتایا گیا ہے اس کے بعد پھر حرمت کا حکم بھی آگیا۔ خمر کے تحت میں ہر وہ چیز داخل ہے جو نشہ آور ہو اور جس سے انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہو۔ حضرت رسولِ خدا سے جب لوگوں نے پوچھا کہ شراب کو خدا نے کیوں حرام کیا ہے تو ان کے جواب میں خدا نے یہ آیت نازل کی اور اپنے رسولؐ سے کہا تم ان سے کہو اس میں فائدے کم ہیں اور نقصان زیادہ ہیں۔ شراب سے انسان کو سُرور ضرور ہوتا ہے حرارتِ غریزی بھی بڑھتی ہے، کھانا بھی جلد ہضم ہوتا ہے لیکن جب پینے کے بعد عقل پر پردہ پڑتا ہے تو ایسے ایسے ناشائستہ عمل کرتا ہے جو اس کو دائرۂ انسانیت سے خارج کر دیتے ہیں پھر جس کو اس کا چسکا لگ جاتا ہے عمر بھر نہیں چھوٹتا۔ بلکہ اس کی مقدار یوماً فیوماً بڑھتی ہی جاتی ہے پھر اس کی قیمت پر جو خرچ ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ شرابی کو مفلوک الحال بنا دیتا ہے بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ اس کی ایک ایک بوتل سو سو دو دو سو روپیہ میں ملتی ہے۔ شراب کا نشہ جب اُترنے پر ہوتا ہے تو شرابی کی رگ رگ ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ اس وقت کسی مصرف کا نہیں رہتا جب تک پھر نہ پی لے۔ اس طرح شراب خوری کا سلسلہ اس کی جان کے لیے وبال ہو جاتا ہے۔ شراب خور انسان اگر دنیوی معاملات میں کوئی اچھی کارگزاری دکھائے بھی تو کیا دینی معاملات سے تو وہ بالکل بے خبر ہو جاتا ہے بلکہ احکامِ شریعت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس طرح اس کی دنیا سنور جائے تو سنور جائے لیکن آخرت تو برباد ہو ہی جاتی ہے۔

حدیث میں ہے جو کوئی شراب کا ایک گھونٹ پی لے تو چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ البتہ اگر توبہ کر لے تو قبول ہو جائے گی اور یہ بھی فرمایا کہ میری امت میں دس آدمی بوئے جنت نہ سونگھیں گے۔ تارک الصلوٰۃ۔ مانع زکوٰۃ۔ سود خوار زانی۔ شراب خور۔ چغلخور۔ فتنہ پرداز۔ غیبت کرنے والا۔ ہمسایہ کو ستانے والا۔ ظالموں کا دوست اس لیے بننے والا کہ لوگوں کو کسی مصیبت میں ڈالے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، ہر گناہ کی سردار اور ہر بدی کے قفل کی کنجی شراب ہے اور یہ کہ شراب پینے والے سے زیادہ خدا کا نافرمان بندہ اور کوئی نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہ حالت بیخودی میں نماز واجب کو ترک کر دے اور اپنی ماں بیٹی کی آبرو ریزی کرے اور یہ کہ شراب پینے والا بے نمازی سے بھی بدتر ہے۔

علم الاجسام کے ماہرین۔ اطبا اور ڈاکٹروں نے تجربات سے بتایا ہے کہ شراب خوار کا جگر خراب ہو جاتا ہے اس پر چربی چھا جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ صحیح کام نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شراب خوار کو کبابوں کی طرف زیادہ توجہ رہتی ہے کیونکہ گوشت جگر والی چربی کو پگھلاتا ہے اس طرح معدہ کے خلیے شراب کی گرمی سے جل جاتے ہیں اور معدہ صحیح کام نہیں کرتا۔

اب رہا جُوا، اس کے بھی بے شمار نقصانات ہیں۔ جواری بغیر محنت و مشقت کے مال حاصل کرنا چاہتا ہے اور پرائے مال پر اس کی نگاہ رہتی ہے۔ جواریوں میں چونکہ غیرت و حمیت باقی نہیں رہتی اس لیے مکر و حیلہ سے وہ مالِ غیر پر تصرف کرنا چاہتے ہیں اور ان میں بے رحمی اور سنگدلی آجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ جوا اس کی عادات پر اتنا خراب اثر کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کے گناہ کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ بہت سے لوگ اس لت کی بنا پر مفلس بھی بن جاتے ہیں گرفتار ہو کر جیل میں بھی جاتے ہیں۔ ذلیل بھی ہوتے ہیں۔ خدا ہر بندہ مسلم کو ان دونوں گناہوں سے بچائے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

اے رسول تم سے لوگ یتیموں کے بارہ میں پوچھتے ہیں تم ان سے کہہ دو کہ ان کی اصلاح و درستی بہتر ہے اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو کچھ حرج نہیں وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ فسادی آدمی کو خیر خواہ سے الگ رکھنا خوب جانتا ہے اگر خدا چاہتا تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتا بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور مسلمانوں تم مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو اور مشرک عورت چاہے (حسن و جمال میں) کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو پھر بھی ایماندار

لونڈی اس سے ضرور اچھی ہے اور (اسی طرح) مشرکین جب تک ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں ان کے نکاح میں نہ دو۔ مشرک چاہے تمہیں کیسا ہی اچھا کیوں نہ معلوم ہو پھر بھی بندۂ مومن اس سے ضرور اچھا ہے۔ یہ مشرک مرد یا عورت لوگوں کو دوزخ کی طرف بُلاتے ہیں اور خدا اپنی عنایت سے بہشت اور بخشش کی طرف بُلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں سے صاف صاف بیان کرتا ہے۔

مشرک صرف اس کو نہیں کہتے جو خدا کا شریک کسی کو قرار دے بلکہ اس کو بھی کہتے ہیں جو خدا کی صفتوں میں یا عبادت میں دوسروں کو شریک بنائے۔ انبیاء یا ائمہ کو وسیلہ و ذریعہ قرار دینا ان تین قسموں میں سے کسی ایک میں بھی داخل نہیں، کیونکہ وہ خدا کا شریک سمجھ کر ان سے کچھ نہیں مانگتے بلکہ خدا کا مقرب اور برگزیدہ سمجھ کر ان سے سفارش چاہتے ہیں یا یہ سمجھ کر کہ خدا نے ان حضرات کو کائنات پر حقِ تصرف دیا ہے کچھ ان سے مانگتے ہیں۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی۔ اس آیت کے نزول سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آچکے تھے یہاں تک کہا گیا تھا، یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو۔ اور جو لوگ ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ ان شدید احکام کی بنا پر جو یتیم بچے جن مسلمانوں کی تربیت میں تھے وہ اس قدر خائف ہو گئے تھے کہ ان کا کھانا پینا تک الگ کر دیا تھا اور اس احتیاط پر بھی ڈر تھا کہیں مالِ یتیم سے کچھ ہمارے حصہ میں نہ آجائے۔ اس لیے خدا فرماتا ہے اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو یہ بہت بہتر ہے ہاں یہ خیال رہے کہ ان کا مال تلف نہ ہو نہ تو خود کھاؤ اور نہ کوئی اپنی ذاتی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کو کھلاؤ۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ۔ اس آیت میں دو حکم دیئے گئے ہیں اوّل مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرنا دوسرا اپنی بیٹیاں مشرکوں کے نکاح میں نہ دینا۔ یہ قانون مسلمان اور رسولِ اسلام دونوں کے لیے ہے۔ فرق یہ ہے کہ مسلمانوں پر بعد ظہورِ اسلام یہ پابندی عاید ہوتی ہے اور حضرت رسولِ خدا قبل بعثت بھی اس کے پابند تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے جبکہ قبل خلقتِ آدم آپ نبی تھے اور اور تمام دنیا کے لیے نمونۂ عمل تھے، جیسا کہ شفائے قاضی عیاض میں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آپ نے اپنی شریعت کے محرمات کا ارتکاب نہیں کیا یعنی نہ کبھی آپ نے مشرک عورتوں سے نکاح کیا اور نہ مشرکوں کے نکاح میں کوئی لڑکی دی لہٰذا جناب خدیجہؓ کو مشرک کہنا غلط ہے بلکہ وہ ملتِ ابراہیمؑ پر تھیں اس طرح یہ بھی غلط ہے کہ حضرت فاطمہؑ کے علاوہ حضور صلعم کے تین لڑکیاں اور تھیں۔ جو عتبہ و عتیبہ پسران ابولہب اور ابوالعاص مشرک سے بیاہی گئیں اس سلسلہ میں ان روایتوں پر غور کرنا چاہیئے جو کتب اسلام میں وارد ہوئی ہیں پہلی روایت یہ ہے کہ یہ لڑکیاں جناب خدیجہؓ کی تھیں شوہر اوّل سے۔ لیکن اس روایت کی تردید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں جناب خدیجہؓ کو وقتِ عقد باکرہ لکھا ہے (مناقب شہر آشوب)۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ لڑکیاں حضرت رسولِ خدا کی تھیں۔ لہٰذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرتؐ اپنی صلبی بیٹیاں مشرکوں سے بیاہتے ان میں ایک ہی روایت درست ہو سکتی ہے۔ اور روایت کے صحیح ہونے کا طریقہ کتب فریقین میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو روایت کتابِ خدا کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جب یہ ثابت ہے کہ ان لڑکیوں کا نکاح مشرکوں سے ہوا تو یقیناً یہ حضرت رسولِ خدا کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ پروردہ تھیں اور اس پروردگی کے رشتہ کی بنا پر حضرت عثمانؓ کو دامادِ رسولؐ

کہا گیا۔ جیسی لڑکیاں ویسی رشتہ داری۔ نہ حقیقی لڑکیاں نہ حقیقی داماد۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آیہ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ میں لفظ بنات جمع ہے لہٰذا ایک لڑکی ماننے کی صورت میں یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بنات سے مراد بناتِ علیؑ و فاطمہؑ ہیں جو درحقیقت بناتِ رسولؐ ہیں کیونکہ قرآن میں نواسیوں کو بنات کہا گیا ہے جب کہ آیہ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ میں نواسیاں اور پوتیاں داخل ہیں۔ اسی لیے جناب امّ کلثومؑ نے بازار کوفہ میں کہا تھا نَحْنُ بَنَاتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ہم رسولؐ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔)

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ۔ اس کے سلسلہ میں مفسرین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ عبداللہؓ بن رواحہ نے کسی قصور پر اپنی کنیز کے طمانچہ مارا۔ اس نے حضرت رسولِ خدا سے فریاد کی۔ آپؐ نے عبداللہ کو بُلا کر ماجرا پوچھا۔ انہوں نے کہا یہ کنیز با ایمان ضرور ہے نماز روزہ بھی کرتی رہتی ہے لیکن جھگڑالو بہت ہے میری فرمانبردار نہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا چونکہ مومنہ ہے لہٰذا اس کے ساتھ کوئی نیکی کرو عبداللہؓ نے اس کو آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا۔ عبداللہؓ کے ہمسایہ میں ایک خوبصورت مشرکہ عورت رہتی تھی، وہ بھی عبداللہؓ سے نکاح چاہتی تھی مگر عبداللہؓ نے منظور نہ کیا۔ اس پر لوگوں نے کہا عبداللہ بڑا بیوقوف ہے ایک بدصورت لونڈی سے تو نکاح کر لیا اور خوبصورت عورت کو چھوڑ دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ الخ یعنی ایک مومن بندہ مشرک سے بہتر ہے چاہے وہ مشرک از روئے مال و جمال و کمال کتنا ہی بہتر ہو ہرگز اپنی لڑکی کو اس کے عقد میں نہ دو۔ قوی اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ مشرک جہنمی ہے زور دے کر اپنی بی بی کو بھی اپنا ہی جیسا بنا لے ورنہ دونوں کے درمیان نزاعی صورت پیدا ہو جائے گی۔

اس زمانہ میں چونکہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بسلسلہ ملازمت ممالک یورپ امریکہ میں جاتا ہے لہٰذا اکثر نے وہاں نصرانی عورتوں سے شادی کر لی ہے اور مسلمان عورتوں پر ان کو ترجیح دی ہے چنانچہ ایسے بہت سے واقعات ہمارے پیش نظر ہیں کہ ان عورتوں نے اگر پورا نہیں تو آدھا عیسائی ضرور بنا لیا ہے اب وہ نہ نماز کے ہیں نہ روزہ کے۔ مزہ سے شراب پیتے ہیں اور سؤر کا گوشت کھاتے ہیں حلال و حرام کی طرف ان کی کوئی توجہ ہی نہیں۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر مشرکوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی ہے۔ ان مشرکہ عورتوں کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر مسلمان اپنا اسلام کو اُن کے عشق میں تج دیتے ہیں اور پھر ہر قسم کے اخلاقی و مذہبی گناہ ان سے سرزد ہونے لگتے ہیں۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

اے رسول لوگ تم سے حیض کے بارہ میں پوچھتے ہیں تم ان سے کہہ دو کہ یہ گندگی اور گھن کی بیماری ہے۔ ایامِ حیض میں تم عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے پاس نہ جاؤ پس جب وہ پاک ہو جائیں تو جدھر سے تمہیں خدا نے حکم دیا ہے ان کے پاس جاؤ بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

ایامِ جاہلیت میں یہود و مجوس میں یہ دستور تھا کہ جب عورتوں کو حیض آتا تو مرد عورتوں سے بات کرنا۔ منہ دیکھنا اور ان کے ساتھ کھانا کھانا گناہ سمجھتے تھے۔ عورتیں حیض کے زمانہ میں منہ چھپائے ایک کونہ میں بیٹھی رہتی تھیں۔ برخلاف اس کے نصاریٰ کے یہاں کھانا پینا ملنا جلنا سب درست تھا یہاں تک کہ وہ مجامعت بھی کرتے تھے۔ اسلام کے زمانہ میں ایک روز ابو دحداح چند لوگوں کے ساتھ خدمت رسولؐ میں حاضر ہوئے اور پوچھنے لگے کہ ہمیں ایامِ حیض میں عورتوں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ وہ ایک گھن والی نجاست سے بھری بیماری ہے۔ اس زمانہ میں عورت سے جماع کرنا صحت کے لیے سخت مضر ہوتا ہے عورت کے اندامِ نہانی میں اس زمانہ میں زیادہ گرمی ہوتی ہے اور خون آتا رہتا ہے جو بعض اوقات وقت مجامعت مرد کے سوراخِ ذکر میں داخل ہو جاتا ہے جس سے مختلف پریشان کن بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نفسِ انسانی اس حالت میں جماع کو پسند نہیں کرتا۔

حیض سے پاک ہونے کے بعد جس طرح خدا نے حکم دیا ہے عورت سے مجامعت کر سکتے ہو قبل غسل ایسا کرنا مکروہ ہے حالتِ حیض میں جماع کرنے والا گنہگار ہوگا اور اس کو کفارہ دینا ہوگا۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

تمہاری بیبیاں تمہارے لیے کھیتی ہیں پس تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہے آؤ اور اپنی جانوں کے لیے اچھے اعمال آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم ضرور اس کے حضور میں پیش ہونے والے ہو اور مومنین کو خوشخبری دو اور اے مسلمانو تم اللہ کے نام کو ایسی قسموں کے کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جس سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ خدا تم سے ان قسموں کے بارہ میں مواخذہ نہیں کرے گا جو لغو ہوں گی مگر ان قسموں کے لیے ضرور پکڑے گا جو تم نے ارادۃً دل سے کھائی ہوں اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ جو لوگ اپنی بیبیوں کے پاس جانے کی قسم کھالیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے پس اگر وہ باز آگئے تو اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے اور اگر انھوں نے طلاق کا پکّا ارادہ کر لیا ہے تو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ عورتوں کے پاس اس طرح جاؤ جیسا کہ خدا نے بتا دیا ہے یعنی جو فطری طریقہ ہے اور جہاں سے حیض خارج ہوتا ہے اس سے پاک ہونے کے بعد وہیں سے جماع کرو۔ لہٰذا جماع فی الدبر کا جس کی مسلمان فقہا نے اجازت دے رکھی ہے کوئی جواز ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ نے یہ فرما کر کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں ایسی واضح مثال سے جماع فی الفرج کو بتا دیا ہے کہ ہر ذی عقل انسان اس کو قبول کرلے گا۔ مرد کی مثال کاشتکار کی ہے اور عورت کی مثال کھیت کی اور کھیت میں بیج ڈالنے سے یہ غرض ہوتی ہے کہ فصل پیدا ہو غلہ اُگے۔ یہ بات عورت کی فرج ہی میں جماع سے پیدا

ہو سکتی ہے کتنا بیوقوف ہے وہ کسان جو اپنا بیج ایسی جگہ ڈالتا ہے جہاں سے کچھ پیدا ہونے کی امید ہی نہ ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جماع فی الدبر عقلاً و نقلاً صحیح نہیں۔

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ۔ ایلا کا مطلب یہ ہے کہ مرد اپنی زوجہ سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالے۔ عرب کا دستور تھا کہ جو شخص اپنی بی بی سے ناراض ہو کر قسم کھالیتا کہ اب میں اس سے ہم بستر نہ ہوں گا۔ ایسی صورت میں عورت کسی دوسرے سے عقد بھی نہیں کر سکتی تھی اور یوں ہی اُدھر میں لٹکی رہتی تھی۔ شریعت نے اس کی حد مقرر کر دی کہ عورت اگر چاہے تو حاکمِ شرع کی طرف رجوع کرے۔ حاکمِ شرع اُسے چار ماہ کی مہلت دے گا اور مرد کو مجبور کرے گا کہ یا تو کفارہ ادا کرکے اپنی بی بی سے میل کرے یا طلاق دیدے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً ۔ ایک بار عبداللہ بن رواحہ نے اپنے بہنوئی بشیر بن نعمان سے ناراض ہو کر اسمِ اعظمِ الٰہی کی قسم کھائی کہ میں بہن اور بہنوئی سے بات نہ کروں گا اور میاں بی بی کے درمیان صلح نہ کراؤں گا نہ اس کے ساتھ نیکی کروں گا اور نہ اس کے دشمنوں سے میل کروں گا۔ جب کوئی کہتا اے عبداللہ اپنے بہنوئی کا اس کے دشمنوں سے میل کرا دو تو وہ کہتے کہ میں قسم کھا چکا ہوں اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی اور یہ بتایا کہ ایسے موقع پر خدا کی قسم نہ کھایا کرو کہ ہم اپنے رشتہ داروں اور برادرانِ ایمانی کے ساتھ نیکی نہ کریں گے یا مروّت و احسان نہ کریں گے ایسی نامناسب بات پر قسم کھانا ہی نامناسب ہے یہ حکم سُن کر عبداللہؓ نادم ہوئے۔

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ ۔ اس آیت میں خدا نے حلف کے جواز و عدمِ جواز کو بتایا ہے کہ اگر کوئی بلا ارادہ حلفاً کوئی بات کہہ گزرتا ہے تو ایسے شخص پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں نہ اس کے اوپر کفّارہ ہے۔ البتہ اگر بالارادہ قسم کھائے گا تو کفّارہ دینا ہوگا۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌ ۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ ۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا

افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے وہ اپنے کو طلاق کے بعد تین حیض کے ختم ہو جانے تک (نکاح ثانی سے) روکیں اور اگر وہ عورتیں خدا و رسول پر ایمان لائی ہیں تو ان کے لیے تو یہ جائز نہیں جو کچھ بھی خدا نے ان کے رحم یعنی پیٹ میں (بچّہ) پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں اور اگر ان کے شوہر میل جول کرنا چاہیں تو وہ مدّتِ مذکورہ میں ان کے واپس بُلانے کے زیادہ حقدار ہیں اور شریعت میں عورتوں کا مردوں پر وہی حق ہے جو مردوں کا عورتوں پر ہے۔ ہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ضرور ہے اور خدا زبردست حکمت والا ہے۔ طلاق (رجعی جس کے بعد رجوع ہو سکتی ہے) دو ہی مرتبہ ہے اس کے بعد یا تو شریعت کے مطابق روک لو یا تیسری دفعہ باحسنِ سلوک بالکل رخصت کر دو اور تم کو یہ جائز نہیں کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے پھر کچھ واپس لے لو جب دونوں کو اس کا خوف ہو کہ خدا نے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کو دونوں میاں بی بی قائم نہ رکھ سکیں گے پھر اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں پہ قائم نہ رہیں گے تو اگر عورت مرد کو کچھ دے کر اپنا پیچھا چھڑائے (خُلع کرالے) تو اس میں ان دونوں پہ کچھ گناہ نہیں یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو ان حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ ۔ یعنی جو عورتیں مطلّقہ ہوں ان کو چاہیئے کہ تین مرتبہ حیض آنے تک انتظار کریں اور جب تک تین بار پاک نہ ہو جائیں دوسرا عقد نہ کریں۔ اس صورت میں حمل کا شبہ جاتا رہے گا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا حمل چھپائیں۔

جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہے اور وہ ابھی عدہ کی مدّت ختم نہیں کر پائی ہیں تو ان کے شوہر سب سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو پھر اپنی زوجہ بنالیں بشرطیکہ ان کا ارادہ عورتوں سے اچھا سلوک کرنے کا ہو اور ایسا نہ ہو کہ ان کو دوبارہ مصیبت میں لاڈالیں۔ ابتدائے اسلام میں جب مرد عورتوں کو ستانا چاہتے تھے تو طلاق دے دیتے تھے اور عدہ ختم ہونے سے پہلے پھر نکاح کر لیتے تھے خدا نے ان کو اس حکم سے روکا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۔ ایامِ جاہلیت میں طلاق کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ ایک شخص جب چاہتا طلاق دے دیتا اور جب چاہتا رجوع کر لیتا۔ اسلام نے اس سے روکا ہے۔ طلاق رجعی کی صورت یہ ہے کہ پہلی بار طلاق شرعی دے کر مرد عدہ کے اندر پھر اُسے اپنی بی بی بنا سکتا ہے بغیر نکاح کے۔ دوسری بار بھی یہی صورت ہوتی ہے البتہ تیسری بار طلاق دینے سے طلاق بائن ہو جاتی ہے اور پھر اس وقت تک اس سے نکاح جائز نہ ہوگا جب تک وہ بعد ختم عدہ دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور وہ پھر اسے طلاق دے۔

طلاق کو رسول اللہ نے اَبْغَضُ الْاَشْیَاءِ فرمایا ہے یعنی میرے نزدیک سب سے بُری چیز طلاق ہے۔ پہلی طلاق کے بعد عدت تک دوسرا نکاح کرنے کی اجازت اس لیے نہیں دی گئی کہ اوّل تو یہ پتہ چل جائے کہ حمل تو نہیں ہے دوسرے اس عدت میں مرد و عورت اپنی تنہائی محسوس کر کے اپنی اپنی غلطی پر آگاہ ہوں اور پھر دوبارہ یکجا ہو جائیں اور حسنِ سلوک روا رکھیں۔ اسی طرح دوسری بار دونوں کو سوچنے کا موقع دیا گیا ہے لیکن تیسری بار پھر رجوع کرنے کا اس لیے سوال پیدا نہیں ہوتا کہ دو بار کے تجربے نے بتا دیا کہ ان کے درمیان خوش معاملگی نہیں ہو سکتی اور ان کے خیالات میں اصلاح کی گنجائش نہیں رہی۔

اہلسنت کی فقہ میں تین بار صیغہ طلاق پڑھ دینے سے طلاق بائن ہو جاتی ہے اس صورت میں زن و مرد کو اپنی غلطیوں پر نظرثانی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔

دوسری صورت مرد و عورت میں جدائی کی خُلع ہے یعنی اگر عورت یہ سمجھتی ہے کہ اس کا نباہ شوہر کے ساتھ نہیں ہو سکتا تو وہ زرِ مہر معاف کر کے یا کچھ زرِ نقد دے کر اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

پس اگر عورت کو طلاق بائن دے دے تو اس کے بعد جب تک دوسرے سے نکاح نہ کر لے اس کے لیے حلال نہ ہوگی اور دوسرا شخص نکاح کے بعد اُسے طلاق دے دے تب میاں بی بی کے باہم میل کر لینے میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ ان دونوں کو یقین ہو کہ خدا کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں جو سمجھ دار لوگوں کے لیے وہ صاف صاف بیان کرتا ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آئے تو یا تو اچھے عنوان سے انہیں روک لو یا حسنِ سلوک سے بالکل ہی رخصت کر دو اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لیے نہ روکو کہ پھر اُن پر زیادتی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا وہ یقیناً اپنے اُوپر ہی ظلم کرے گا اور خدا کے حکم کو ہنسی ٹھٹھا نہ سمجھو اور خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں انہیں یاد کرو اور اس نے جو کتاب اور عقل کی باتیں تم پر نازل کی ہیں ان سے تم کو نصیحت کرتا ہے خُدا سے ڈرتے رہو اور سمجھ رکھو کہ وہ ہر شے کا جاننے والا ہے اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وُہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ دونوں میاں بی بی شریعت کے موافق اچھی طرح مل جائیں یہ اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے خدا اور آخرت پر ایمان لائے گا۔ یہی تمہارے حق میں بڑی صفائی اور پاکیزگی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ تین طلاقوں کے بعد پھر عورت کے لیے طلاق بائن ہے وہ اس وقت تک پھر اپنے شوہر پر حلال نہیں ہو سکتی جب تک ایک دوسرا شخص اس سے نکاح کر کے طلاق نہ دے۔ یہ صورت اس لیے رکھی گئی ہے کہ تین بار طلاق حاصل کر کے جب عورت دُوسرے شوہر کے پاس جائے گی تب اُسے اندازہ ہوگا کہ پہلے شوہر اور اس شوہر کے مزاج میں کیا فرق ہے اور شوہروں کے ساتھ برتاؤ کس طرح کرنا چاہیئے۔ اس تجربہ کے بعد اُسے عقل آئے گی اور چوتھی بار جب وہ پہلے شوہر کے یہاں جائے گی تو نہایت فرمانبردار بن کر جائے گی۔ تین طلاقوں اور چوتھی بار نئے شخص کے ساتھ نکاح کرنے اور اس کے ساتھ رہنے میں جن پریشانیوں کا اُسے سامنا ہوگا وہ اس کو صحیح طریقہ سے بی بی بن کر رہنے میں مدد دے گی۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ کسی مرد کے صرف یہ کہہ دینے سے کہ میں نے تجھے طلاق دی شرعی طلاق نہیں ہوتی جب تک ایک عالم عادل باقاعدہ صیغۂ طلاق نہ پڑھے اور دو عادل اس کو نہ سنیں اور اس کے گواہ نہ بنیں کہ ان کے سامنے صیغۂ طلاق جاری کیا گیا تھا۔

مرد کو چاہیئے کہ جب کسی عورت سے نباہ کی صورت نہ دیکھے تو اسے طلاق دے دے تاکہ وہ دوسرے سے نکاح کر لے۔ بدبخت ہے وہ شخص جو عورت کو ستائے اور خواہ مخواہ پریشان کرنے کے لیے طلاق نہیں دیتا یہ عورت پر کھلا ظلم ہے اس کی سزا پیشِ خدا بھگتنی ہوگی۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر عورت ایّامِ حیض میں ہو تو اس وقت اس کو طلاق دینا صحیح نہ ہوگا۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

(طلاق دینے کے بعد) جو شخص اپنی اولاد کو پوری مدت تک دُودھ پلوانا چاہے تو اس کی خاطر سے مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دُودھ پلائیں اور جس کا وہ لڑکا ہے یعنی باپ اس پہ ماؤں کا کھانا کپڑا دستور کے مطابق دینا لازم ہے کسی شخص کو زحمت نہیں دی جاتی مگر اس کی گنجائش بھر۔ نہ ماں کا اس بچہ کی وجہ سے نقصان ہو اور نہ جس کا لڑکا ہے (بچہ کا باپ) اس کا، بلکہ دستور کے مطابق خرچ دیا جائے اور اگر باپ نہ ہو تو دُودھ پلانے کا حق اسی طرح وارث پہ لازم ہے۔ پھر دو برس سے پہلے ماں باپ دونوں اپنی مرضی سے دودھ بڑھائی کرنا چاہیں تو ان دونوں پہ کوئی گناہ نہیں اور تم اپنی اولاد کو کسی انا سے دُودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ جو تم نے دستور کے مطابق مقرر کیا ہے اس کے حوالے کر دو اور خدا سے ڈرتے رہو اور تم جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو ضرور دیکھتا ہے۔

مطلب ان آیات کا یہ ہے کہ اگر کسی بچہ والی عورت کو شوہر طلاق دیدے تو عورت کو واجب ہے کہ پورے دو برس بچہ کو دُودھ پلائے اور شوہر پہ واجب ہے کہ وہ دودھ پلانے تک عورت کے کھانے کپڑے کے لیے دیتا رہے، جیسا رسم و رواج ہو اس کے مطابق دے اس میں کمی کرنا عورت کا حق تلف کرنا ہے۔

عورت کو نہیں چاہیئے کہ اگر کسی بات پر شوہر سے لڑ پڑے تو بچہ کو دُودھ پلانا بند کر دے بالخصوص جبکہ وہ اس سے بے حد مانوس ہو یا شوہر سے دودھ پلانے کی اس قدر اجرت مانگے جو دستور کے خلاف ہو اور اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا بچہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جس سے باپ کے دل کو صدمہ پہنچے اسی طرح باپ کے لیے بھی جائز نہیں کہ بچہ کی ماں کو تکلیف پہنچائے اور ایسی حالت میں

بچہ کو اس سے چھین لے جبکہ وہ دُودھ پلانا چاہتی ہو اور اس کے نان نفقہ میں کوئی چیز کم کرے نہ روکے۔ اگر انا دائی سے دُودھ پلوانا طے پائے تو وہ غیر مسلم نہ ہو مسلمان عورت ہو اگر کسی شریف خاندان کی خوش اخلاق عورت مل جائے تو اس کا دُودھ پلوا لے چاہے اسے اجرت کچھ زیادہ دینا پڑے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ

تم میں سے جو لوگ اپنی بیبیاں چھوڑ کر مر جائیں تو یہ عورتیں چار مہینے دس روز اپنے کو دوسرا نکاح کرنے سے روکیں جب عدہ کی مدت پوری کر لیں تو شریعت کے مطابق اپنے بارہ میں جو کچھ کریں تم پر کوئی الزام نہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے اور اگر تم اس خوف سے کہ شاید کوئی دوسرا نکاح کر لے ان عورتوں سے اشارۃً قبل عدہ نکاح کی خواہش ظاہر کرو یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو تو اس میں بھی تم پر کوئی الزام نہیں کیونکہ خدا کو معلوم ہے کہ تم سے صبر نہ ہو سکے گا اور ان عورتوں سے نکاح کا خیال آئے گا لیکن چوری چھپے سے نکاح کا وعدہ نہ کر لینا بلکہ ان سے کوئی اچھی بات کہہ گزرو تو حرج نہیں۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی خواہش نکاح ثانی کی ہو اور وہ اپنا بناؤ سنگار کریں تو تم پر اس کا کوئی الزام نہیں کہ تم نے زیادہ دن تک سوگ پر کیوں نہ مجبور کیا جیسا کہ عرب میں دستور تھا اور ہندوستان میں بھی ہے کہ بیوہ ہونا دنیا و ما فیہا سے بے تعلق ہو جانا ہے نہ وہ خوشی سے کسی رسم میں شریک کی جاتی ہے نہ اس کے ہاتھ پاؤں مبارک سمجھے جاتے ہیں گویا اُس نے اپنے شوہر کو مار ڈالا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ ۔ یعنی جو عورتیں اپنے خاوند کے مرنے کے بعد عدہ میں ہوں اگر کوئی شخص ان سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو اپنے نکاح کا پیغام صاف صاف لفظوں میں نہ دے بلکہ گول گول لفظوں میں اشارۃً کنایۃً اپنی خواہش کا اظہار کرے اور کھلم کھلا اس لیے نہ کہا جائے کہ وہ اپنے شوہر کے سوگ میں ہے اگر اسے نکاح منظور نہ ہو گا تو شوہر کی یاد اُسے بے چین کر دیگی

اور اگر راضی ہوگی تو اشارۃً وہ بھی ظاہر کر دے گی۔ تم کو چاہیئے کہ مخفی وعدہ نہ کرو۔ اور اگر یہ سمجھو کہ عدہ کا انتظار کیا جائے گا تو یہ خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسرے سے عقد پر راضی نہ ہو جائے گی تو ایسے الفاظ میں ظاہر کرو جیسے تم خوبصورت ہو بڑی نیک بخت بی بی ہو تم کو لوگ پسند کرتے ہیں اس سے وہ سمجھ لے گی کہ یہ مجھ سے نکاح چاہتا ہے اور علانیہ طور پر نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٣٦﴾

اور جب تک میعاد مقررہ نہ گزر جائے نکاح کا قصد بھی نہ کرنا اور سمجھ رکھو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اس کو ضرور جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور یہ بھی جان لو کہ خدا بڑا بخشنے والا بردبار ہے اور اگر تم نے اپنی بی بیوں کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو اور نہ مہر ہی معین کیا ہو اس سے قبل ہی تم ان کو طلاق دے دو تو اس میں بھی تم پر کچھ الزام نہیں ہاں ان عورتوں کے ساتھ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ سلوک کرنا لازم ہے۔ نیکی کرنے والوں پر یہ بھی ایک حق ہے۔

یعنی اگر ایسی حالت میں تم عورتوں کو طلاق دے دو کہ تم نے ان کو چھوا چھیڑا نہیں اور مہر بھی مقرر نہیں کیا تو اس صورت میں ان کے ساتھ کچھ سلوک کرنا چاہیئے مثلاً مالدار آدمی گھر یا زمین دے دے غریب کپڑے بنا دے یا کچھ نقد دے دے کیونکہ وہ تمہارے بھروسہ پر کسی دوسرے سے نکاح تجویز نہ کر سکیں۔ حدیث کے مطابق بعد تعین مہر اور قبل از مجامعت طلاق دینے پر نصف مہر دینا چاہیئے لیکن اگر مہر قرار نہیں پایا تو طلاق دینے پر مہر دینا واجب نہیں بلکہ حسن سلوک سے نوازا جائے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾

اگر تم ان عورتوں کا مہر تو مقرر کر چکے ہو مگر ہاتھ لگانے یعنی مجامعت کرنے سے پہلے ہی طلاق دیدو تو ان عورتوں کے مہر معین کا آدھا دیدو مگر یہ کہ یہ عورتیں خود معاف کر دیں یا ان کا ولی جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہو معاف کر دے تب کچھ نہیں اور اگر تم ہی عورت کو سارا مہر بخش دو تو پرہیزگاری سے بہت ہی قریب ہے اور آپس کی بزرگی کو مت بھولو اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو ضرور دیکھ رہا ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾

مسلمانو تم تمام نمازوں کی خصوصاً بیچ والی نماز (ظہر و عصر) کی پابندی کرو اور خاص خدا ہی کے لیے نماز میں قنوت پڑھنے والے ہو کر کھڑے ہو۔ پھر اگر تم خوف کی حالت میں ہو اور پوری نماز نہ پڑھ سکو تو سواری پر یا پیدل جیسے بن پڑے

پڑھ لو پھر جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو جس طرح خدا نے تمہیں ان باتوں کو سکھایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے اس طرح خدا کو یاد کرو تم میں سے جو لوگ اپنی بیبیاں چھوڑ کر مر جائیں ان پر اپنی بیبیوں کے حق میں سال بھر تک کے نان ونفقہ اور گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کرنا لازم ہے پس اگر عورتیں خود نکل کھڑی ہوں اور یہ جائز باتوں (نکاح وغیرہ) سے کچھ اپنے حق میں کریں تو اس کا تم پر کچھ الزام نہیں ہے اور اللہ ہر شے پر غالب اور حکمت والا ہے اور جن عورتوں کو تعین مہر اور ہاتھ لگائے بغیر طلاق دے دی جائے تو ان سے کچھ سلوک کرنا لازم ہے یہ بھی پرہیزگاروں پر ایک حق ہے خدا تم لوگوں کو ہدایت کے واسطے اپنے احکام صاف صاف بیان فرماتا ہے۔

ان آیات کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ الخ۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟ کسی نے کہا ہے نماز ظہر مراد ہے کسی نے نماز عصر مراد لی ہے کسی نے نماز مغرب۔ لیکن اکثر کا اتفاق اس پر ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہے جو صبح اور نماز عصر کے درمیان ہے۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ اس سے مراد بحالت نماز قنوت پڑھنا ہے جس کے شیعہ پابند ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ الخ۔ عرب میں یہ رسم تھی کہ جب شوہر مر جاتا تو عورت ایک سال تک عدہ میں رہا کرتی تھی اور پرانے کپڑے پہنتی اور بناؤ سنگھار ترک کر دیتی تھی اور اگر وہ شہر کی رہنے والی ہوتی تو اسی گھر میں رہتی جہاں شوہر مرا ہے اور اگر صحرا نشین ہوتی تو اس کے لیے ایک علٰحدہ گھر بنوا دیا جاتا وہ اس گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ کھانے پینے کی کفالت مرنے والے کے ورثا پر واجب ہوتی تھی اور اگر گھر سے باہر قدم نکالتی تو کھانے کپڑے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی۔

واضح رہے کہ یہ ایک سال کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا لیکن جب چار مہینے دس دن والا حکم آیا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جامع قرآن نے جو ناسخ حکم ہے اُسے پہلے جگہ دی ہے اور جو منسوخ ہے اُسے بعد میں۔ حالانکہ منسوخ حکم پہلے ہونا چاہیے تھا اور ناسخ بعد میں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اے رسول کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو موت سے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور وہ ہزاروں آدمی تھے تو خدا نے ان سے فرمایا کہ سب کے سب مر جاؤ (اور وہ مر گئے) پھر خدا نے انہیں زندہ کیا بیشک خدا لوگوں پر بڑا مہربان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ اور مسلمانو تم راہِ خدا میں جہاد کرو اور جان لو کہ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ ہے کوئی جو خدا کو قرضِ حسنہ دے تاکہ خدا اس کے مال کو اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے خدا ہی تنگدست کرتا ہے اور وہی کشائش دیتا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ان لوگوں کے مرنے کے متعلق مولانا فرمان علی صاحب نے اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر لکھا ہے:

"باختلاف روایات چار یا آٹھ یا دس یا بیس یا چالیس یا ستر ہزار آدمی تھے جو طاعون کی وبا کے خوف سے بھاگے تھے آخر موت کے پنجے سے نہ چھوٹے۔ سب مر کر ڈھیر ہو گئے ایک عرصہ بعد حضرت حزقیل کا ادھر سے گذر ہوا آپؑ نے دعا کی خدا کا حکم ہوا چلو میں پانی لے کر ان پر چھڑکو۔ آپؑ چھڑکتے جاتے تھے اور لوگ زندہ ہوتے جاتے تھے۔ چونکہ یہ واقعہ نوروز کے دن کا ہے خدا نے اس دن ایک دوسرے پر پانی چھڑکنا یا گلاب چھڑکنا سنت قرار دیا ہے مگر افسوس ہمارے بھائیوں نے اس کو ہولی سے بدتر بنا دیا خدا ہدایت کرے"

مولانا مرحوم نے اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ ان کے مرنے کا اصلی سبب کیا تھا۔ طاعون سے بچ کر بھاگنا اور اپنی جان کی حفاظت کرنا کوئی گناہ نہ تھا جس کی سزا میں خدا ان کو مار ڈالتا اور پھر زندہ بھی کرتا۔

ائمہ علیہم السلام کی تفسیر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جس بستی میں طاعون کی وبا پھیلی تھی وہاں کے امرا یا متوسط حال لوگ جن کے پاس سواریاں تھیں اپنا سامان لاد کر جب چلنے لگے تو غریبوں نے فریاد کی کہ ہمیں بھی ساتھ لے لیجئے مگر امیروں نے ان بے بسوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور چلتے بنے۔ اس بنا پر ان کو قدرت کی طرف سے یہ سزا دی گئی کہ سب کو موت کی نیند سلا دیا اور بستی کے غریب لوگ اس وبا سے محفوظ رہے۔ ان سنگدلوں کی سختی کی یہی سزا تھی۔ دوسرے جب آیت میں اُلُوْفٌ (ہزاروں) کا لفظ موجود ہے تو پھر مولانا نے چار یا آٹھ یا دس یا بیس والی روایت کو جو سراسر غلط ہے کیوں نقل کیا۔ تیسرے اس کا جوڑ نوروز سے کیوں ملایا۔ نوروز تو ایک ایرانی تہوار ہے جو آتش پرستوں کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اسلام کا اس سے کیا تعلق۔ عربی زبان میں تو اس کے لیے کوئی لفظ بھی نہیں۔ نوروز کا مُعَرّب نیروز بنا لیا ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ کے متعلق جو سرسید احمد خاں صاحب نے لکھا ہے وہ بھی سُن لیجئے:

اس آیت میں حیات وموت کے اصلی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی ہیں۔ یعنی موت سے مراد ہے ان کا بزدل ہونا اور حیات سے مراد ہے بہادر بن کر دشمن کا مقابلہ کرنا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مدیانیوں کے ہاتھ سے بنی اسرائیل نے سخت شکست کھائی تھی۔ اور اپنا گھر چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے تھے۔ سات برس تک ان پر یہ مصیبت رہی پھر جدعون نبی ان پر مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو لڑائی کی ترغیب دی اور ان کا دل مضبوط کیا اور مدیانیوں پر انہوں نے فتح پائی۔ پس اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے رسول تم نے ان لوگوں کے حال پر بھی غور کیا جو لڑائی کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ بھاگے تھے حالانکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ پس اللہ نے ان سے کہا جاؤ مرو اور مصیبتیں اور ذلتیں اٹھاؤ پھر خدا نے ان کے دل کو قوی کیا۔ یہ کلام اس طرح کا

ہے جیسے قرآن میں ہے مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ یعنی اپنے غصہ میں مرو۔

ہمارے نزدیک تو پہلی تفسیر صحیح ہے مجازی معنی مراد لینا اس وقت صحیح ہوتا ہے جب حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی خرابی لازم آتی ہو۔ پہلی تفسیر میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی۔ جب انھوں نے اپنے غریب بھائیوں کو بچانے میں مدد نہ دی اور اپنی جانوں کی خیر منائی تو اس سنگدلی بے مروّتی اور بداخلاقی کی جو سزا قدرت نے عبرتِ خلق کے لیے دی وہ حق بجانب تھی۔ پھر ایک نبی کی سفارش پر انہیں زندہ بھی کر دیا تا کہ لوگ ان کے واقعہ سے سبق لیں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا ۔ قرضِ حسنہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے تنگدست مسلمان بھائی کو خدا کی خوشنودی کے لیے یہ کہہ کر قرض دے کہ جب تمہارے پاس ہو دے دینا بغیر کسی سُود کے۔ اور اگر عمر بھر تم یہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو میں نے بخش دیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو کئی گنا زیادہ ثواب دے گا۔ لینے والے کا فرض ہے کہ مکر و حیلہ سے کام نہ لے اور جس وقت اس کے پاس رقم آ جائے فوراً اسے چاہیئے کہ اپنا قرضہ ادا کرے۔ اگر یہ طریقہ مسلمانوں میں جاری رہتا تو ناداری اور تنگدستی اور سُود کی مصیبت سے محفوظ رہتے۔ روزی گھٹانا بڑھانا سب خدا کے اختیار میں ہے اگر قرض لینے والے کے دل میں پاپ نہ ہو تو ضرور اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور جلد اُسے قرضہ ادا کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

اے رسول کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کی حالت پر نظر نہیں کی جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے واسطے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تاکہ ہم راہِ خدا میں جہاد کریں پیغمبر نے فرمایا کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ جب تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جب ہم اپنے گھروں اور اپنے بال بچّوں سے نکالے جا چکے تو پھر ہمیں کونسا عذر باقی ہے کہ راہِ خدا میں جہاد نہ کریں لیکن جب ان پر جہاد واجب کیا گیا تو ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب نے لڑنے سے منہ پھیرا اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل چند روز تک تو چین سے رہے فتوحات کرتے رہے لیکن ان کی شریر طبعیں خاموش کیسے

رہ سکتی تھیں پھر شرارتیں شروع کر دیں خدا نے جالوت بادشاہ کو ان پر مسلط کر دیا۔ اس نے انہیں خوب رگیدا تب ان لوگوں نے شموئیلؑ نبی کی طرف رجوع کیا۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے انتقال کیا تو بنی اسرائیل احکامِ شریعت کا مذاق اڑانے لگے۔ اس وقت کے نبی نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی نامعقول حرکتوں سے باز نہ آئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس زمانہ میں کون نبی تھے کسی نے ارمیا لکھا ہے کسی نے شموئیل۔ زیادہ اتفاق اس پر ہے کہ ان کا نام شموئیل تھا۔ اس سرکشی کی سزا میں خدا نے ان پر قوم عمالقہ کے بادشاہ جالوت کو مسلط کیا۔ اُس نے بُری طرح بنی اسرائیل کو قتل کیا شہر سے باہر نکال دیا، ان کا مال لُوٹ لیا، ان کی عورتیں لونڈی اور لڑکوں کو غلام بنا لیا۔ جب یہ بلا سر پر آئی تو نبی سے کہنے لگے آپ دُعا کیجئے کہ خدا ہم پر رحم کھا کر ایک ایسا بادشاہ ہم کو دے کہ اس کے ساتھ ہو کر ہم اپنے دشمن سے لڑیں۔ نبی نے کہا اگر تم پھر بھاگ گئے تو کیا ہوگا۔ انھوں نے عہد و پیمان کیے کہ اب ہم نہیں بھاگیں گے۔ لیکن جب بازارِ قتال گرم ہُوا تو وہ جالوت کے لشکر کو دیکھ کر ڈر گئے اور تین سو تیرہ آدمیوں کے سوا سب بھاگ کھڑے ہوئے آخر پھر خدا نے ان پر طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰی یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ خدا نے تمہارے لیے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے اس کی حکومت ہم پر کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ سلطنت کے حقدار اس سے زیادہ ہم ہیں کیونکہ مال کے اعتبار سے بھی وہ فارغ البال آدمی نہیں۔ نبی نے کہا خدا نے تم پر اس کو فضیلت دی ہے اور مال میں نہ سہی علم اور جسم میں تو خدا نے اس کو زیادہ بنایا ہے اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے اور اللہ بڑی گنجائش والا واقف کار ہے۔

اس آیت میں چند باتیں غور طلب ہیں:

۱۔ طالوت ایک منصوص من اللہ بادشاہ تھا یعنی خدا کا بنایا ہُوا۔ بنی اسرائیل نے اس سے پہلے جس کو بطورِ خود بادشاہ بنا لیا تھا اس کو فتح حاصل نہ ہوتی کیونکہ فنِ حرب سے واقف نہ تھا اور بہادر آدمی بھی نہ تھا۔ لیکن جب خدا کا بھیجا ہُوا آیا تو پھر شکست کا سوال ہی نہ رہا۔

۲۔ خدا کا انتخابی نقطہ نظر مال و دولت اور کسی جتھے کی سرداری نہ تھا بلکہ طالوت کا انتخاب اس بنا پر عمل میں آیا کہ وہ

بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ عالم تھا اور مردِ شجاع تھا۔ پس معلوم ہوا جس میں یہ دو صفتیں نہ ہوں وہ کسی قوم کی سرداری یا کسی ملک کی بادشاہت کا اہل قرار نہیں پاتا۔

۳ - یہ کہنا کہ طالوت مردِ مفلس تھا اور خاندانِ انبیاءؑ میں سے بھی نہ تھا خدائی انتخاب میں آگیا لہٰذا حضرات شیعہ کا یہ کہنا کہ امام ذریتِ رسولؐ میں سے ہونا چاہیئے غلط ہے۔ جواب یہ ہے کہ طالوت صرف بادشاہ تھا مردِ کارزار تھا۔ لہٰذا اس کی قیادت کا تعلق صرف حرب و ضرب اور ملکی سلطنت سے تھا لیکن اسلام میں اس کی نوعیت بدلی ہوئی تھی وہاں دنیوی اور دینی دونو قسم کی حکومتیں اس شخص کے حوالے ہوتی تھیں جو فنِ حرب و ضرب سے بھی واقف ہو اور سیاستِ الٰہیہ اور ریاستِ نبویہؐ کے اصول و قواعد سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو اور پوری طرح خود ان احکام پر عامل ہو۔ بے شک وہ جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے لیکن غیر مستحق کو نہیں۔ حاکم کے لیے صاحبِ علم و شجاعت ہونا لازم ہے اگر کسی میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو وہ ہرگز انتخابِ الٰہی میں نہیں آسکتا۔ کسی ملک پر قبضہ کر لینا اور چیز ہے اور انتخابِ الٰہی میں آنا کچھ اور ہے۔

خدائی انتخاب میں آنے والا خدا کی طرف سے کچھ ایسی نشانیاں لے کر آتا ہے جو منتخب من اللہ ہونے کی دلیل ہوتی ہیں چنانچہ طالوت کے لیے بھی ایسا ہی ہوا۔ یعنی روغن سے بھرا ہوا ایک برتن اور عصا بھیجا گیا اور کہا گیا جس کے آنے سے روغن جوش میں آجائے اور عصا اس کے قد کے برابر ہو جائے اسی کو خدا کا نمائندہ سمجھا جائے۔ بہت سے لوگ بن سنور کر اونچی بنے ہوئے آئے لیکن نہ روغن جوش میں آیا اور نہ عصا بڑھا گھٹا۔ ہاں جب طالوت آیا تو یہ سب کچھ ہو گیا اگرچہ وہ سقائی کرتا تھا مگر اپنے ایمان میں راسخ تھا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کے بادشاہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین دہ چیزیں اور ان تبرکات سے بچا کھچا ہوگا جو موسیٰ و ہارون کی اولاد یادگار چھوڑ گئی ہے اور اس صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے اگر تم ایمان رکھتے ہو تو بے شک اس میں تمہارے واسطے پوری نشانی ہے۔ جب طالوت لشکر سمیت (شہر ایلیا سے) روانہ ہوا تو اپنے ساتھیوں سے کہا، دیکھو

آگے ایک نہر ملے گی اس سے خدا تمہارے صبر کی آزمائش کرے گا پس جو کوئی اس کا پانی پئے گا وہ مجھ سے نہیں یعنی مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور جو اس کو نہ چکھے گا بے شک وہ مجھ سے ہوگا مگر ہاں جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو پی لے تو کچھ حرج نہیں۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے مترجمہ قرآن میں لکھا ہے کہ تابوت سکینہ وہ صندوق تھا جس میں موسیٰؑ کی والدہ نے آپ کو بند کرکے دریا میں ڈال دیا تھا۔ اس میں بہت سی چیزیں تبرکات سے تھیں۔ جیسے انبیاء کی تصویریں، ان کے گھروں کی نقلیں، موسیٰؑ کا عصا، توریت کی دو تختیاں اور آسمانی ترنجبین۔ حضرت رسول خدا کی تصویر، حضرت ہارونؑ کا عمامہ اور جوتیاں تھیں۔ جب جالوت کو غلبہ ہوا تو وہ اس صندوق کو بھی چھین لے گیا۔ جب طالوت کے ساتھ بنی اسرائیل لڑنے لگے تو جالوت کے آدمیوں نے اس صندوق کو چھکڑے پہ لاد کر ان کی طرف ہانک دیا کہ فساد کی جڑ یہی ہے۔ فرشتے اس کو گھسیٹ کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے انھوں نے اس کو فال نیک سمجھا اور جم کر لڑنے لگے۔

مولانا مرحوم کی اس تحریر میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں :

۱ - تابوت سکینہ وہ صندوق تھا جس میں موسیٰؑ کی ماں نے موسیٰؑ کو لٹا کر دریائے نیل میں چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ صندوق اتنا ہی چھوٹا ہوگا جتنا بچپن میں حضرت موسیٰؑ کا قد تھا۔

۲ - وہ جلدی میں معمولی لکڑی کا بنوایا گیا ہوگا۔ وہ اتنا پائدار کیسے ہو گیا کہ طالوت کے زمانہ تک باقی رہا۔

۳ - اس چھوٹے سے صندوق میں تمام تبرکاتِ انبیاء مع عصائے موسیٰؑ کیسے سما گئے۔

۴ - آلِ موسیٰؑ کا ترجمہ اولادِ موسیٰ کیا ہے اور اس پر کوئی نوٹ نہیں دیا کہ جب موسیٰؑ صاحبِ اولاد نہ تھے تو پھر قرآن میں آلِ موسیٰ کیوں ہے۔ یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ اولادِ حضرت ہارونؑ اولادِ موسیٰؑ اسی طرح کہلاتی تھی جیسے اولادِ علیؑ اولادِ رسولؐ کہلاتی تھی۔

۵ - فرشتے تابوتِ سکینہ کو گھسیٹ کر لائے حالانکہ آیت میں تحملہٗ ہے یعنی اسے اٹھائے ہوئے تھے۔ گھسیٹ کر لاتا وہ ہے جس سے وہ بوجھ سنبھل نہ سکے یا اتنا چوڑا ہو کہ کندھوں پہ رکھا نہ جاسکے۔ فرشتوں کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اللہ اللہ انبیاؑ کے جوتوں کی عند اللہ یہ قدر ہے کہ فرشتے اس صندوق کو اٹھا کر لاتے ہیں جس میں موسیٰؑ و ہارونؑ کے جوتے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ - جب طالوت اپنا لشکر لے کر چلے تو گرمی کا موسم تھا۔ اثنائے راہ میں سب کو شدت سے پیاس لگی اور پانی کے متلاشی ہوئے طالوت نے کہا آگے ایک نہر آنے والی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تمہارے صبر کا امتحان لے گا۔ خبردار اس کا پانی نہ پینا، ورنہ میرا پینے والوں سے کوئی تعلق نہ رہے گا ہاں تھوڑا سا چکھ لینے یا چلو بھر پی لینے میں مضائقہ نہیں۔ چنانچہ باوجود اس ممانعت کے سوائے تین سو تیرہ صاحبانِ ایمان کے سب ہی نے تو ڈگ ڈگ کرکے پی لیا پس پھر کیا تھا اپھر گئے، چلنے کے قابل ہی نہ رہے وہیں لمبے لمبے لیٹ گئے۔ طالوت نے اسی لیے منع کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے ہونٹ بھی سیاہ ہو گئے تھے۔

ذرا غور کیجئے کتنا فرق ہے طالوت کی اور امام حسین علیہ السلام کی فوج میں۔ یہاں سختی سے منع کیا جارہا ہے مگر ایک دو نہیں

بلکہ ستّر ہزار آدمیوں نے اپنے بادشاہ کے حکم کی ذرا تعمیل نہ کی اور امام حسین علیہ السلام کی مختصر فوج باوجودیکہ تین دن کی پیاسی
تھی اور باوجودیکہ امامؑ نے منع بھی نہ کیا تھا بلکہ اجازت دے دی تھی لیکن کسی نے پانی کی خواہش نہ کی اور جو نہر تک پہنچے یا پانی لائے
یا نہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے پانی کے چند قطروں سے اپنے لب آشنا نہ کیے۔ اللہ اللہ یہ پیاس اور یہ صبر۔

بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا
اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾
وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ ؕ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ قف وَقَتَلَ دَاوٗدُ
جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

بس چند آدمیوں کے سوا سب نے پانی پی لیا۔ غرض جب طالوت اور جو آدمی ان کے ساتھ تھے نہر سے پار ہوگئے
تو خالص مومنوں کے سوا سب نے کہا آج جالوت اور اُس کی فوج سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں لیکن جن لوگوں
کو یقین تھا کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے وہ کہنے لگے کہ ایسا بہت ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر
اللہ کے حکم سے غالب آگئی اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ پس جب یہ لوگ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کو
نکلے تو دُعا کرنے لگے اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافی صبر عطا فرما اور میدانِ جنگ میں ہمارے قدم جمائے رکھ اور
کافر لوگوں پر ہمیں فتح عنایت کر۔ غرضکہ ان لوگوں نے خدا کے حکم سے دشمنوں کو شکست دی اور داؤد نے جالوت
کو قتل کیا اور خدا نے ان کو سلطنت اور حکمت عطا کی اور علم و ہُنر سے جو چاہا اُن کو سکھا دیا۔

پس اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کا شر دفع نہ کرتا تو تمام روئے زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن
خدا تو سارے جہان کے لوگوں پر فضل (رحم و کرم) کرتا ہے۔ یہ اللہ کی سچی آیتیں ہیں جو ہم تم کو ٹھیک ٹھیک
پڑھ کر سناتے ہیں اور بے شک تم ضرور رسُولوں میں سے ہو۔

جب طالوت و جالوت دونوں کے لشکر میدان میں نکلے اور جالوت نے اپنا مقابل طلب کیا تو طالوت نے اپنے
لشکر والوں سے کہا جو تم میں جالوت کو قتل کرے گا میں اپنا آدھا ملک اُسے دے دوں گا اور اپنی بیٹی بھی بیاہ دوں گا
مگر کسی کی ہمت نہ پڑی۔ تب حضرت شموئیل نے فرمایا کہ اشیا جو اولادِ یعقوبؑ میں سے ہے اس کے بیٹوں میں سے جس میں
فلاں فلاں صفتیں پائی جائیں وہی جالوت کا قاتل ہوگا۔ چنانچہ اشیا نے اپنے سب بیٹوں کو پیش کیا مگر سوائے حضرت داؤدؑ
کے کسی میں وہ علامات نہ پائے گئے۔ غرض حضرت داؤدؑ مقابلہ کو چلے۔ ان کے تھیلے میں تین پتھر تھے۔ ایک پتھر کو جو
اپنی گوپھن میں رکھ کر جالوت کی طرف پھینکا تو وہ اس کی پیشانی پر لگا اور سر کو توڑتا ہوا پیچھے کی طرف سے نکل گیا اور
کئی آدمی اور زخمی ہوئے۔ جالوت کے مرتے ہی اس کی فوج کے قدم اُکھڑ گئے۔
اس صلہ میں حضرت داؤدؑ کو سلطنت ملی اور طالوت کے داماد بنے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

یہ سب رسول جو ہم نے بھیجے ہیں ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن سے خود خدا نے بات کی اور بعض کے درجات بلند کیے اور ہم نے عیسٰی بن مریم کو روشن معجزات عطا کیے اور رُوح القدس یعنی جبرئیل کے ذریعہ سے ان کی مدد کی اگر خدا چاہتا تو جو لوگ اُن پیغمبروں کے بعد ہوئے وہ اپنے پاس روشن معجزات آنے کے بعد آپس میں نہ لڑ مرتے مگر ان میں پھُوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے اور اگر خدا چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سعی سفارش سے کام چلے گا اور کفر کرنے والے تو ظلم ڈھاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے جو رسول بھیجے وہ سب ایک ہی مرتبہ کے نہ تھے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت تھی لیکن اس فضیلت کا معیار کیا تھا کوئی شخص اس کو نہیں بتا سکتا اس کو تو بس خدا ہی جانتا ہے ہم تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جس رسول کی امت جن حالات میں بسر کر رہی تھی اور ان کی معاشرتی، اخلاقی اور تمدّنی زندگی کا جو تقاضا تھا ان کے رسول کو اتنا ہی علم دیا گیا تھا کہ وہ اسی کے مطابق ان کی اصلاح میں مشغول ہوں۔ ان سب کے دائرۂ ہدایت بھی یکساں نہ تھے بعض کو صرف ایک گاؤں کی ہدایت کا کام سپرد تھا۔ بعض کو ہزار دو ہزار کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بعض کو کسی بڑے شہر کی طرف۔ بعض کو تمام عالموں کی ہدایت کا ذمہ دار بنایا گیا۔ جو معجزات عطا کیے گئے وہ بھی وقتی لحاظ سے تھے مثلاً حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں ساحروں کا زور تھا لہٰذا عصا کا معجزہ دیا گیا۔ حضرت عیسٰیؑ کے زمانہ میں اطبا نے بڑا کمال حاصل کیا تھا ان کو اسی کے لحاظ سے معجزات دیئے گئے۔ حضرت رسولؐ خدا کی رسالت و ہدایت کا تعلق چونکہ روزِ قیامت تک تھا لہٰذا آپؐ کو بے شمار معجزات عطا کیے گئے۔

ان آیات میں حضرت موسیٰؑ سے کلام کرنے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ خدا کا کسی بندہ سے کلام کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی اس نے جناب موسیٰؑ کا مرتبہ بہت بلند کر دیا۔ خدا کے کلام کرنے کی یہ صورت نہ تھی جو ہمارے کلام کرنے کی ہے کہ زبان ولب کو حرکت ہوتی ہے حلق سے آواز پیدا ہوتی ہے اگر خدا بھی ایسا ہی کلام کرے تو پھر خدا و بندہ میں فرق کیا ہے۔ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ اس کے متکلم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر دے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے درخت سے آواز آتی تھی۔

دوسرے جس رسول کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ ہیں جو خدا کی طرف سے بہت سے معجزات لے کر آئے تھے۔ جیسے مُردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھی اور جذامی کا اچھا کرنا۔ مٹی کا پرندہ بنا کر اڑا دینا۔ لوگ اپنے گھروں میں جو ذخیرہ کرتے تھے اس کو بتا دینا۔ جبرئیل کے ذریعہ ان کی مدد کرنا جس سے یہودی ان کو ہلاک کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

تیسری بات جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے بندہ کو فاعل مختار بنایا ہے وہ کسی کی گردن دبا کر یا گلا گھونٹ کر اپنے کسی حکم کی تعمیل کرانا نہیں چاہتا۔ ہر انسان کو اس نے عقل دی ہے وہ اچھے بُرے کام کو خود سوچے۔ انبیاء و مرسلین کے معجزات دیکھنے کے بعد جو اختلاف لوگوں میں پیدا ہوئے خدا چاہتا تو دم بھر میں ان سب جھگڑوں کو چکا دیتا۔ کس کی طاقت تھی کہ اس کے حکم کے خلاف ورزی کر سکتا۔ مگر وہ جبر کر کے کسی کو مومن بنانا چاہتا ہی نہیں۔ اس ڈھیل دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ مومن بن گئے، کچھ کافر ہو گئے۔ اس نے کافروں کو صاف صاف بتا دیا کہ ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ نہ وہاں کوئی خرید فروخت ہوگی کہ بد اعمال نیک اعمال سے کچھ نیکیاں خرید لے نہ کوئی دوست وہاں کسی کے کام آئے گا نہ کسی کی سعی سفارش کام دے گی۔ کسی کی طاقت نہ ہوگی کہ جہنم کی طرف کشاں کشاں جانے والوں کو کسی تدبیر سے بچا لے وہاں تو کفر کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۬ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾ لَاۤ اِكۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔهُمُ

الطَّاغُوۡتُ ۙ یُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵۷﴾ ع

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور تمام کائنات کا مدبر و منتظم ہے اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب اسی کا ہے کون ہے جو بدوں اس کی اجازت کے اس کی بارگاہ میں کسی کی سفارش کرے جو کچھ ان کے سامنے موجود ہے اور جو کچھ اُن سے پہلے ہو چکا اللہ ان سب باتوں کو جانتا ہے لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ مگر وہ جسے چاہے سکھا دے اس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور ان دونوں (زمین و آسمان) کی نگہداشت اس پہ ذرا بھی گراں نہیں۔ وہ عالیشان والا بزرگ مرتبہ والا ہے۔ دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی سے الگ ظاہر ہو چکی تو جس نے طاغوت (جھوٹے خداؤں یعنی بتوں) سے انکار کیا اور خدا ہی پر ایمان لایا تو اُس نے وہ مضبوط رسّی پکڑ لی جو ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔ اور خدا سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے ہیں وہ انہیں گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا تو ان کے سرپرست شیاطین ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں ڈال دیتے ہیں یہی لوگ تو جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

کرسی کے معنی بیٹھنے والی کرسی نہیں ہے۔ اس کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے کسی نے تو اس سے آسمان مراد لیا ہے کسی نے عرش اور کسی نے علم الٰہی اور یہی معنی سب سے زیادہ بہتر ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے مذاہب باطلہ کی تردید مختصر لفظوں میں فرمائی ہے۔

هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔ یہ بتانے کے بعد کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس نے اپنی صفت ہمیشہ زندہ رہنے والا اور تمام کائنات پر حکومت کرنے والا بیان کی ہے۔ یہ ابطال ہے بت پرستوں کے مذہب کا۔ جب ان کے بُت زندہ ہی نہیں اور کسی چیز پر تصرف ہی نہیں کر سکتے تو ان سے نظام عالم میں تصرف کرنے کا کیا تعلق۔ ان سے بہتر تو ان کے پجاری ہیں۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۔ یہ بھی تردید بت پرستوں کے مذہب کی ہے۔ اونگھ ہو یا نیند انسانی حواس پر غلبہ حاصل کرنے والی اور معاملات دنیا سے بے خبر کر دینے والی ہوتی ہے۔ پس اگر کائنات کا مدبر بھی اونگھنے لگے یا سو جائے تو پھر اس تمام نظام کو سنبھال کون سکتا ہے۔ بت سوتے ہیں مندروں کے پجاری گھنٹی بجا کر اور ان پہ پانی ڈال کر جگاتے ہیں مگر وہ اس پر بھی نہیں جاگتے۔ پھر ایسوں کو خدا ماننا کیسی سخت حماقت ہے۔

ایک بار حضرت موسیٰؑ سے کچھ لوگوں نے کہا آپ اپنے خدا سے یہ معلوم کیجیے وہ سوتا بھی ہے یا نہیں۔ موسیٰؑ نے یہ سوال بارگاہ الٰہی

ہیں پیش کیا۔ خدا نے دو بوتلیں دے کر ان کے پاس فرشتہ بھیجا اور کہا یہ دونوں بوتلیں دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے دو رات برابر جاگتے رہو یہ بوتلیں آپس میں ٹکرائیں نہیں۔ چنانچہ موسیٰؑ نے یہی کیا پہلی ہی رات کے آخری حصہ میں بوتلیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ وحی ہوئی، اے موسیٰؑ اگر میں سوتا تو اس تمام کائنات کا انتظام کون سنبھالتا۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ ۔ یعنی کوئی چیز اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہر شے خدا کی مخلوق ہے اور اس کا علم اس کو گھیرے ہوئے ہے جب جو چیز خود گھری ہوئی ہو وہ اپنے گھیرنے والے کو کیسے گھیر سکتی ہے

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ دین میں کوئی جبر نہیں یعنی اسلام میں جو اعتقادی، اخلاقی اور تمدنی اصول و فروع ہیں ان کو زبردستی کسی پر ٹھونسا نہیں جا سکتا اور نہ ایسا اسلام مفیدِ نجات ہو سکتا ہے بلکہ ان کی حقانیت کو عقل سے سمجھا جائے۔ جبراً کسی کو مسلمان بنانا اسلام کی کوئی خدمت نہیں۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ ۔ یعنی جو شخص خدا کا نافرمان بندہ ہوتا ہے وہ شیطان کا بندہ بن جاتا ہے وہ اس نافرمانی کی بنا پر صرف ایک شیطان کا بندہ نہیں بنتا بلکہ بہت سے شیاطین جو اس کی خواہشات ہوتی ہیں اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور پھر وہ عقل و فہم کی روشنی سے نکال کر جہالت کی تاریکیوں میں لا ڈالتی ہیں لیکن اگر اللہ کا بندہ بن کر رہتا ہے تو وہ اسے ان تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے آتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۵۸)

اے رسول تم نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جو صرف اس برتے پر کہ خدا نے اس کو سلطنت دی تھی ابراہیم سے ان کے رب کے بارہ میں جھگڑا کرنے لگا جب ابراہیم نے کہا میرا ربّ تو وہ ہے جو لوگوں کو جلاتا اور مارتا ہے تو وہ بھی کہنے لگا یہ کام تو میں کر سکتا ہوں (تمہارے ربّ میں کیا خصوصیت ہے) تب ابراہیم نے کہا میرا رب تو آفتاب کو پورب سے نکالتا ہے تو پچھم سے نکال کر دکھا دے، یہ سُن کر وہ کافر ہکّا بکّا ہو کر رہ گیا اور خدا ظالموں کو منزلِ مقصود تک پہنچایا ہی نہیں

حضرت ابراہیمؑ کو تین محاذوں پر دشمنوں کو نیچا دکھانا تھا۔ اوّل ستارہ پرستوں کو جن کا عقیدہ تھا کہ وہ ان کے معبود ہیں کائنات کا تمام نظام انہی سے وابستہ ہے دوسرے بت پرستوں کو جن کا سردار ان کا چچا آذر بت تراش تھا۔ تیسرے نمرود اور اس کے تابعین کو

جو اس کو اپنا رب مانتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا جب اس سے مناظرہ ہوا تو اس نے کہا تمہارے رب میں وہ کیا خصوصیات ہیں جو مجھ میں نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میرا رب لوگوں کو جلاتا اور مارتا ہے اس نے کہا واہ یہ کون سی بڑی بات ہے یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایک قیدی کو جو واجب القتل تھا بلایا اور حضرت ابراہیمؑ سے کہا اس کی موت میرے ہاتھ میں ہے مگر میں اسے چھوڑے دیتا ہوں۔ گویا میں نے مردہ کو جلا دیا۔ دوسرے قیدی کو بلا کر اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ کہا لیجئے میرا زندہ کو مار ڈالنا بھی ثابت ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ آدمی کوڑھ مغز ہے بات کی تہہ کو نہیں پہنچا۔ فرمایا میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اگر اس کا مدمقابل ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا دے۔ رات کو دن بنا دے۔

یہ سنتے ہی وہ سٹ پٹا گیا، اب کہے تو کیا کہے۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۵۹)

اے رسول تم نے اس بندہ کے حال پر بھی غور کیا جو ایک گاؤں کی طرف سے گزرا اور وہ ایسا اجڑا تھا کہ اپنی چھتوں پر ڈھے کے گر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بندہ کہنے لگا اللہ اس گاؤں کو ایسی ویرانی کے بعد کیسے آباد کرے گا۔ پس خدا نے اس کو مار ڈالا اور سو برس تک مردہ رکھا پھر اس کو زندہ کر کے اٹھایا۔ اور اس سے پوچھا تم کتنی دیر پڑے رہے اس نے کہا ایک دن یا ایک دن سے بھی کم۔ خدا نے فرمایا نہیں تم اس حالت میں سو برس پڑے رہے ہو۔ تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ بُسی تک نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو اس کی ساری ہڈیاں ڈھیر پڑی ہیں اور یہ سب اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگوں کے لیے تمہیں قدرت کا نمونہ بنائیں۔ اچھا اب گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ ہم کس طرح انہیں جوڑ جاڑ کر ڈھانچہ بناتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں جب ان پر یہ ظاہر ہوا تو بے ساختہ بول اُٹھے کہ اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

ان آیات میں چند باتیں قابلِ غور ہیں :

۱ - اس میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ آرمیائی نبی کا ہے یا عزیرؑ نبی کا - اس میں بھی اختلاف ہے کہ بخت النصر بادشاہ کے زمانہ کا ہے جس نے بیت المقدس میں قتلِ عام کیا تھا یا کسی اور بادشاہ کا۔

۲ - یہ تو طے شدہ بات ہے کہ یہ واقعہ ایک نبی سے متعلق ہے - قابلِ غور یہ امر ہے کہ ایک نبی حیات بعد الموت کا قائل کیوں نہ تھا بات یہ ہے کہ کوئی نبی اس کا منکر نہیں ہو سکتا اور نہ اُسے حیات بعد الموت میں شبہ ہو سکتا ہے لیکن انبیاؑ کے لیے ایک دقت یہ بھی کہ ان کی امت یہ بھی سوال کرتی تھی کہ آپ نے بچشمِ خود دیکھا ہے اگر وہ اس کا جواب یہ دیتے کہ آنکھ سے تو نہیں دیکھا تو ضرور یہ کہتے کہ سُنی سنائی بات کا ہمیں یقین نہیں لہٰذا یہ حضرات چاہتے تھے کہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں تاکہ پورے پورے وثوق سے لوگوں کو سمجھا سکیں - جب تک آدمی کسی چیز کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا اس کے بہت سے دبے ہوئے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہوتا یہی وجہ تھی کہ آدم علیہ السلام کو جنت کی ایک جھلک دکھا دی تاکہ وہاں کی نعمات اور وہاں کی رہائش وغیرہ پر وہ پوری طرح روشنی ڈال سکیں - یہی ضرورت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخواست کی تھی کہ میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے - خدا نے کہا، کیا تم ایمان نہیں لائے - عرض کی ایمان کیوں نہیں لایا لیکن اطمینانِ قلب چاہتا ہوں - اعتقاد میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور قلب کو پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جبکہ کوئی چیز آنکھ سے دیکھ لی جائے - ایسے امر کے متعلق پھر لوگ کتنے ہی سوال کریں نبی پورے اطمینان سے ہر بات کا جواب دے سکتا ہے -

۳ - یہ روایت محلِ تامل ہے کہ جب حضرت عزیرؑ اپنے گھر پہنچے تو کسی نے ان کو نہیں پہچانا - آپ کی تصدیق آپ کے اُس لڑکے نے کی جو اس وقت بطنِ مادر میں تھا - جب آپ نے اپنے خد و خال اس کے سامنے بیان کیے تب اس بچہ نے آپ کو پہچان لیا - سوال یہ ہے کہ آپ کی زبان سے آپ کی خصوصیات سُن کر اس نے کیسے تصدیق کی - وہ تو پیدا بھی نہ ہُوا تھا -

۴ - اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ طاہر پر زمین و مخلوقاتِ زمین میں سے کوئی چیز اپنا تصرف نہیں دکھا سکتی - سو برس تک زمین پر پڑے رہے اور اُن کا ایک بال بیکا نہ ہُوا - انبیاءؑ ہی پر موقوف نہیں شہدائے راہِ خدا اور خاصانِ خدا کے اجسام بھی مرنے کے بعد زیرِ زمین محفوظ رہتے ہیں - جیسے جناب حمزہؑ کی قبر کو جب معاویہ کے زمانہ میں ایک نہر نکالنے کے سلسلہ میں کھودا گیا تو آپ کو اسی حالت میں دیکھا گیا جس حالت میں وہ دفن کیے گئے تھے - اسی طرح جناب جابر بن عبداللہ اور جناب حذیفہ رضی اللہ عنہما کی قبروں کو کھول کر ۱۹۳۲ء میں جب ان کی میتیں دوسری جگہ منتقل کی گئیں تو کوئی تغیر ان میں نہ پایا گیا بلکہ جسموں کا کیا ذکر کفن تک بدستور محفوظ رہے -

۵ - یہ تو ظاہر ہے کہ جناب عزیرؑ کی میت سو برس تک رہی تو زمین کے اوپر تھی مگر قدرت نے اس کو نظرِ خلائق سے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ کسی کو پتہ نہ چلا - پس لوگوں کو کیوں تعجب ہے اس بات پر کہ امام مہدیؑ آخر الزماں لوگوں کو باوجود اس زمین پر ہونے کے دکھائی نہیں دیتے -

۶ - کھانے پینے کی چیزوں کا سو برس بدستور رہنا اور اُن میں بُو پیدا نہ ہونا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا اس کا ثبوت ہے کہ جن چیزوں کو انبیاء کا ہاتھ لگ جائے یا اُن سے منسوب ہوں، عناصرِ زمین و آسمان میں سے کوئی چیز اُن پر اپنا تصرف نہیں دکھا سکتی

یہی صورت گدھے کی ہڈیوں کا پنجر سو برس تک باقی رہنے کی ہے -

۷ - گدھے کی ہڈیوں کے ڈھانچہ پہ از سرِ نو گوشت چڑھانا اور اس کو زندہ کرکے اُٹھا کھڑا کرنا اس کا ثبوت ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ہر ایک کو یوں ہی زندہ کرکے میدانِ حشر میں لے آئے گا -

---

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾

جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب مجھے یہ دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے خدا نے کہا کیا تم (حیات بعد الموت پر) ایمان نہیں لائے - انھوں نے کہا ضرور ایمان رکھتا ہوں لیکن اس معاملہ میں اطمینانِ قلب چاہتا ہوں - فرمایا اچھا تو چار چڑیاں لو اور اپنے پاس رکھو پھر (ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے قیمہ بنا لو) اس کو ہر پہاڑ پر تھوڑا تھوڑا سا رکھ دو پھر ان کو بلاؤ تو تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے اور یہ جان لو کہ بے شک اللہ بڑی قوت اور حکمت والا ہے -

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے حیات بعد الموت پر ایمان لانے کو کہا تو وہ کہنے لگے اے ابراہیمؑ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اجزا بہت سے اجسام میں متفرق ہو جائیں وہ پھر زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں - حضرت ابراہیمؑ نے سمجھایا مگر وہ نہ مانے - اتفاقاً ایک روز دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے کہ ایک لاش کو دیکھا کہ آدھی پانی میں ہے اور آدھی خشکی میں - جو حصہ پانی میں ہے اُسے پانی کے جانور کھا رہے ہیں اور جو خشکی میں ہے اُسے خشکی کے جانور کھا رہے ہیں دل میں خیال آیا جب ایک جسم کے اجزا بہت سے اجسام میں چلے گئے تو پھر یہ قیامت میں کیسے جمع ہوں گے - خدا سے دعا کی کہ مجھے یہ دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا - حکم ہُوا چار پرندے ذبح کرکے ان کے گوشت کا قیمہ کرو اور چاروں کے گوشت ملا کر گڈمڈ کر دو پھر یہ قیمہ تھوڑا تھوڑا مختلف پہاڑوں پر رکھ دو اور ان کی چونچیں ہاتھ میں لے کر انھیں پکارو - اُن کے اجزا جہاں جہاں ہوں گے دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے اور اپنی اپنی منقار سے لپٹ کر پورا جسم بنا لیں گے اور جب تم چھوڑ دو گے تو اُڑتے چلے جائیں گے -

جناب ابراہیمؑ سے جو یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا تم ایمان نہیں لائے - یہ سوال ایمان باللہ اور اس کے متعلقات کے متعلق نہ تھا بلکہ صرف حیات بعد الموت کے متعلق تھا - یعنی اس معاملہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اعتقاد تو تھا لیکن اطمینان چاہتے تھے کہ اپنی آنکھ سے زندہ ہونے کی جو صورت ہو گی وہ دیکھ لیں تاکہ دوسروں کو اچھی طرح سمجھا سکیں - تاکہ پھر انہیں چون و چرا کی گنجائش نہ رہے -

---

اس مسئلہ کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ ہر جسم حیوانی دو قسم کے اجزا سے مرکب ہے۔ اجزائے اصلیہ اور اجزائے زائدہ یا فاضلہ۔ اجزائے اصلیہ کبھی نہیں بدلتے، اجزائے زائدہ آئے دن بدلتے رہتے ہیں کبھی انسان موٹا ہوتا ہے کبھی لاغر۔ اجزائے اصلیہ نہایت لطیف ہوتے ہیں جو ہمیں آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ انہی کا نام حقیقتِ انسانیہ ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ یہی وہ اجزا ہیں جن سے عالمِ ذرّ میں اللہ نے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا۔ انسان کے اندر سے جو "میں" کی آواز نکلتی ہے وہ نہ بدن کی ہے نہ نفس کی نہ رُوح کی بلکہ ان ہی اجزائے اصلیہ کی ہے جو بدن و نفس و روح سے علیحدہ ایک چیز ہیں۔ یہی کسی جسم میں اوّل سے آخر تک اس کی خصوصیات کے باقی رکھنے کے ضامن ہوتے ہیں اور اس کے کسی حصّہ کو بدلنے نہیں دیتے۔ ایک برگد کے بیج کو دیکھو کتنا چھوٹا سا ہوتا ہے اس کے اندر اس کے اجزائے اصلیہ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس درخت کے آخری پتے تک چاہے کتنا ہی اونچا ہو ان اجزائے اصلیہ کا وجود پایا جاتا ہے جو اس درخت کی کسی شاخ یا کسی پتہ کو اصلیت سے بدلنے نہیں دیتا۔ جب یہ اجزائے اصلیہ بدن انسان سے نکل جاتے ہیں تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پس قیامت میں جب یہ اجزائے اصلیہ انسانیہ میدانِ حشر میں رکھے جائیں گے تو جہاں جہاں ان کے اجزائے زائدہ ہوں گے وہ اسی طرح اس سے آملیں گے جیسے حضرت ابراہیمؑ کے پرندوں کے اجزا منقاروں سے آملے تھے۔ سوال وہاں اجزائے فاضلہ یا زائدہ سے نہ ہوگا بلکہ ان اجزائے اصلیہ سے ہوگا ——— جو عالمِ ذر میں معاہدہ کرنے والے اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بلیٰ کہنے والے تھے۔ چونکہ انہی اجزائے اصلیہ کے تحت نفس انسانی نے جسمِ انسان میں اپنے تصرفات کیے ہوں گے لہٰذا اس سے بھی جواب طلب کیا جائے گا کیونکہ جسم پر کنٹرول کرنے والا تو وہی تھا اجزائے اصلیہ تو بقائے جسم کے ضامن ہوتے ہیں نہ کہ افعال انسانی کے۔ اس کی مکمل بحث ہم نے اپنی کتاب سیرت الرسولؐ میں بطور ایک ضمیمہ کے حقیقتِ انسانیہ کے عنوان کے تحت لکھی ہے اور رسالہ نور میں جو ۱۹۶۸ء میں بند ہوا ہے کئی سال اس موضوع پر لکھتے رہے تھے۔ یہ ایک دقیق بحث ہے یہاں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں۔

جناب ابراھیمؑ کے اعتقاد میں کوئی نقص نہ تھا وہ اس پر پورا پورا عقیدہ رکھتے تھے کہ مرنے کے بعد مُردوں کو زندہ کیا جائے گا وہ صرف اس کی عملی صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ اس سے پہلے جناب عزیرؑ کا واقعہ گزر چکا۔

ایک روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخواست اس وجہ سے کی تھی کہ حضرت جبریلؑ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ خدا آپ کو اپنی دوستی کے مرتبہ پر فائز کرے گا اور اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ آپ کی خاطر سے مردہ کو جلائے گا۔ اس اشتیاق میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخواست کی تھی اور یہ اس وقت درخواست کی جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو زمین و آسمان کی سیر کرائی۔ اس کے بعد اس کا وہ واقعہ بیان کیا گیا جس کا ذکر اوپر ہوا۔

ایک روایت ہے کہ وہ چار پرندے گدھ۔ بط۔ مور اور مرغ تھے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۙ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى ۗ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ﴿٢٦٣﴾

جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثل اس دانہ کی سی ہے جس سے (زمین میں بونے کے بعد) سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہتا ہے دُونا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی گنجائش والا ہر چیز سے واقف ہے جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد کسی پر احسان نہیں جتاتے اور نہ جس پر احسان کیا ہے اُسے ستاتے ہیں تو ان کا اجر و ثواب اللہ کے پاس ہے۔ آخرت میں نہ اُن کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ سائل کو نرمی سے جواب دے دینا اور اُسے اصرار پر نہ جھڑکنا اس سے درگزر کرنا اس خیرات سے کہیں بہتر ہے جس سے سائل کو ایذا پہنچے اور خدا ہر شے سے بے پروا اور بردبار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے ساتھ احسان کیا جائے تو اس سے یہ نہ کہو کہ ہم نے تمہارے ساتھ ایسا ایسا کیا تھا تم بڑے احسان فراموش ہو کہ اس کا کوئی اچھا بدلہ ہیں نہ دیا یا ہمارے شکرگزار نہ ہوئے۔ یا تم کیسے بڑھ بڑھ کر بولتے ہو حالانکہ تمہارا ہاتھ ہمارے سامنے پھیلا ہوا رہتا تھا۔ ایسی باتیں کسی غریب کے دل پر خنجر کا کام کرتی ہیں اور احسان کرنے والے کا اجر و ثواب سب خاک میں مل جاتا ہے۔ احسان کر کے نہ جتانا دشمن کو دوست بنا دیتا ہے اور جتانا دوست کو دشمن۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور سائل کو اذیت دے کر ضائع نہ کرو جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے واسطے خرچ کرتا ہے اور خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی خیرات کی مثال اس چکنی چٹان کی سی ہے جس پر کچھ خاک پڑی ہو پھر اس پر بڑے زور شور سے بڑے قطروں والا مینہ برسے اور مٹی بہا کے اُسے چکنا چھوڑ جائے۔ اسی طرح ریا کار اپنی خیرات یا اس کے ثواب میں سے جو حاصل کیا ہے کچھ بھی نہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا یعنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا اور ان لوگوں کی مثل جو خوشنودیٔ خدا کے لیے اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں اُس ہرے بھرے باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلے پر لگا ہو اور اس پر زور شور سے پانی برسے تو دو گنے پھل لائے اور اگر اس پر زور کا پانی نہ بھی برسے تو اس کے لیے ہلکی پھوار ہی کافی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جوانمرد چار ہیں:
دولت کے ساتھ انکسار کرنے والا۔ قابو پاکر عوض سے درگزر کرنے والا۔ باوجود دشمنی کے دشمن کو نصیحت کرنے والا۔ بغیر احسان جتائے کچھ دینے والا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اس کے نیچے نہریں جاری ہوں اور اس باغ میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں اور اس شخص کو بڑھاپا آ پہنچے اس حالت میں کہ اس کے بچے کمزور ہوں پھر اس باغ میں (اچانک) ایک بگولا آ جائے جس میں آگ ہو جس سے اس کا باغ جل جائے (تو اس کے دل پر کیا گزرے گی) اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ اے ایمان والو اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جنہیں تم نے کمایا ہے اور اُن میں سے بھی جنہیں ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے کچھ خرچ کرو اور اس میں سے خراب چیز کے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو جبکہ تم خود بھی اس کے لینے کے روادار نہیں ہو سوائے اس کے کہ تم اس کے متعلق چشم پوشی کرو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور حمد کے لائق ہے شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے معافی دینے اور مہربانی کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا سب سے زیادہ جاننے والا ہے وہ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی بے شک اُسے بہت زیادہ خیر و برکت دی گئی۔

تفسیر صافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایّام جاہلیت میں کچھ لوگوں نے بُرے پیشوں سے روپیہ کمایا تھا۔ اسلام لانے کے بعد اس مال میں سے صدقہ نکالنا چاہا لیکن اللہ نے منع کر دیا اور حکم دیا کہ صدقہ اسی مال میں سے نکالو جسے تم نے جائز پیشوں سے کمایا ہو۔ اس طریقہ سے اللہ نے روک تھام کی ہے بُرے پیشوں سے روزی کمانے کی۔

شیطان لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر ہم اپنے مال سے محتاجوں کو دے دیں گے تو رفتہ رفتہ ہم خود محتاج ہو جائیں گے اس لیے وہ شیطان کے بہکانے میں آکر محتاجوں کی مدد سے دست کش ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو بتایا کہ شیطانی وسوسوں میں نہ پڑو۔ جو تم راہِ خدا میں دوگے ہم اس سے دس گنا زیادہ کسی نہ کسی طریق سے تم تک پہنچا دیں گے۔ ہمارے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔

مَنْ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا حکمت سے مراد معرفت تَفَقُّہ فِی الدِّین ہے پس جس نے تم میں سے علمِ فقہ حاصل کیا وہ حکیم ہے۔ حکمت کے تحت دونوں چیزیں آجاتی ہیں حکمتِ نظری یعنی علم اور حکمتِ عملی پس جس کے پاس علم و عمل دونوں ہوں اس کے پاس خیرِ کثیر نہ ہوگی تو کس کے پاس ہوگی اس لیے حضرت رسولِ خداؐ نے علیؑ کے متعلق دونوں چیزیں بیان کر دیں۔ ایک جگہ فرمایا، اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ دوسری جگہ فرمایا، اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک جگہ شہرِ علم کا دروازہ بیان فرمایا دوسری جگہ گھر کا دروازہ۔ راز اس میں یہ ہے کہ علم کی وسعت عمل سے بہت زیادہ ہے عملی صورت محدود ہوتی ہے اور علم غیر محدود ہے روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے یہاں تک کہ کوئی اس کی حد نہیں پا سکتا فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ ہر علم والے سے اوپر ایک اور زیادہ جاننے والا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک سے دوسرا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے برخلاف اس کے عمل کی صورت محدود ہے۔ عملِ صحیح کی ایک ہی صورت ہمیشہ رہتی ہے اور اس کی تعداد ایک دائرہ کے اندر محصور و محدود ہوتی ہے۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾

تم جو کچھ بھی خرچ کروگے یا کوئی مِنّت مانوگے خدا اس کو ضرور جانتا ہے۔ اُن ظالموں کا جو لوگوں کا حق مار کر

دوسروں کی نذر کرتے ہیں قیامت کے دن کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ اگر خیرات کو ظاہری طور پر دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے وہ دینے کو تمہارے گناہوں کا کفارہ قرار دے گا اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے اے رسولؐ منزلِ مقصود تک پہنچانا تمہارا فرض نہیں صرف راستہ دکھانا تمہارا فرض ہے۔ لیکن خدا جسے چاہتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ تم جو کچھ نیک کام میں خرچ کروگے تو اپنے لیے کروگے اور تم تو خدا کی خوشنودی کے سوا اور کام میں خرچ کرتے ہی نہیں ہو۔ بس تم جو کچھ نیک کام میں خرچ کروگے قیامت میں اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں مل جائے گا۔

ہدایت کے دو معنی ہیں: اِیْصَالٌ اِلَی الْمَطْلُوْب یعنی کسی کو اس کے مقصود و مطلوب تک پہنچا دینا دوسرے اِرَاءَةُ الطَّرِيْق یعنی راستہ دکھانا۔ رسولؐ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دے اس کے بعد اس کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا صراطِ مستقیم پر قائم رہنا یہ اللہ کا اختیار ہے۔ یعنی وہ اپنی توفیقات نازل کر کے اسے صاحبِ ایمان و عرفان بنا دے یا اس کی حالت پر چھوڑ دے۔ راہِ خدا میں دینے والوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو کچھ دیں کم ہو یا زیادہ محض خوشنودیٔ خدا کے لیے دیں نہ کسی کے ڈر سے نہ کسی کی خوشامد میں۔ نہ اپنی کسی غرض سے۔ یہ خیرات بارگاہِ باری میں قبول نہ ہوگی اور رد کر دی جائے گی۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢٧٣﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾

خاص اُن حاجتمندوں کے لیے جو خدا کی راہ میں دشمنوں میں گھر گئے ہوں اور اگر وہاں سے جانا چاہیں تو نکل نہیں سکتے ناواقف لوگ ان کو سوال نہ کرنے کی وجہ سے امیر سمجھتے ہیں لیکن تم ان کی صورت دیکھتے ہی تاڑ جاؤ گے کہ محتاج ہیں وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ تم جو کچھ نیک کام میں خرچ کرتے ہو (اور ایسے لوگوں کو دیتے ہو) خدا اس کو ضرور جانتا ہے۔ جو لوگ رات کو دن کو چھپا کے یا دکھا کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو اُن کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر قیامت میں ہے نہ ان کو کوئی خوف ہوگا نہ رنج۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت علیؓ کے پاس چار درہم تھے۔ آپؓ نے ایک درہم رات کو خیرات کیا اور ایک دن کو، ایک چھپا کر دیا اور ایک دکھا کر۔ اسی کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ جیسا فروخت کا معاملہ ہے ویسا ہی سود کا ہے۔ حالانکہ خرید و فروخت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے پس جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت آئی، اور وہ سود کھانے سے باز آگیا تو اس حکم کے آنے سے پہلے جو سود وہ لے چکا ہے وہ اسی کا ہوگیا اور اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے اور جس نے ممانعت کے بعد بھی سود لیا تو ایسے لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اللہ سود کو مٹاتا ہے۔

عرب میں سب سے بڑی سود خور قوم یہودی تھے جنہوں نے ہر طرف اپنے قرضوں کا جال بچھا رکھا تھا اور ہندوستانی بنیوں اور ساہوکاروں کی طرح سود کی بڑی بڑی شرحیں مقرر کر رکھی تھیں اور پھر سود در سود لے کر اصل رقم میں شامل کر لیتے تھے پھر کل رقم پر سود لگاتے تھے غرض ان سے قرض لینے والا چند سال میں تباہ ہو جاتا تھا اور اپنا سارا سرمایہ ان کے سپرد کر دیتا تھا جب حضرت رسولِ خداؐ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو یہ تماشا دیکھا کہ مدینہ کے انصار کا بال بال قرضہ میں جکڑا ہوا ہے اور یہودی سود در سود لے کر ان کے سروں پر بلا کی طرح سوار ہیں جو قرضہ نہیں چکاتا تھا اس کے بال بچوں کو بطور رہن اپنے گھر لے جاتے اور غلام و کنیز بنا کر ان سے کام لیتے۔ یہ تباہ کن سلسلہ ایامِ جاہلیت سے چلا آرہا تھا اور مسلمان نہایت عسرت و تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے بلکہ بہت سے ایسے تھے جنہیں دونوں وقت کھانا بھی میسر نہ آتا تھا۔ یہودیوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی یہ سلسلہ آپس میں شروع کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بنا پر سود کو حرام قرار دیا اور اس کی جگہ قرضِ حسنہ کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ قرضِ حسنہ کی صورت یہ تھی کہ مالداروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کو اس شرط پر بلا سود قرضہ دیں کہ جب ان کے پاس اتنی رقم ہو جائے تو بغیر کسی عذر و حیلہ کے اپنا قرضہ ادا کر دیں۔ اور قرض دینے والا ان کو مہلت دیتا رہے اگر عمر بھر

ان سے وہ قرضہ ادا کرنا ممکن ہی نہ ہو تو معاف کر دے اللہ اس کو روزِ قیامت دس گنا اجر دے گا۔ لین دین کے اس طریقہ کے رواج پانے کے بعد مسلمانوں کو بڑا فائدہ ہوا اور وہ یہودیوں کے ظلم و ستم سے نجات پا گئے۔ لیکن بددیانت اور بے ایمان لوگوں نے جب یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ باوجود پیسہ پاس ہونے کے قرضہ ادا نہ کیا اور قرض دینے والے سے حیلے بہانے کرنے لگے تو لوگوں نے قرضِ حسنہ دینا بند کر دیا۔ اگر مسلمان اس پر عمل کرتے رہتے تو سود کے چکر میں کبھی نہ پھنستے۔

وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع

اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور خدا ناشکرے گنہگاروں کو دوست نہیں رکھتا جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے پابندی سے نماز پڑھی اور زکوٰۃ دی ان کا اجر و ثواب ان کے رب کے پاس ہے روزِ قیامت نہ ان کو کوئی خوف ہوگا نہ رنج۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو سود لوگوں کے ذمّہ رہ گیا ہے اگر تم سچے مومن ہو تو اسے چھوڑ دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار رہو۔ ہاں اگر تم نے خدا سے توبہ کر لی ہے تو تمہارے لیے تمہارا اصلی مال کافی ہے نہ تم کسی کا زبردستی نقصان کرو اور نہ تم پر زبردستی

کی جائے اگر کوئی تنگدست تمہارا مقروض ہو تو اس کو اس کی خوشحالی تک مہلت دو اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے کہ اصل بھی بخش دو اور اس دن سے ڈرو جس دن تم سب کے سب خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور پھر وہاں جو کچھ کسی شخص نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی پر زیادتی یا حق تلفی نہ ہو گی۔

اس زمانہ میں بنکاری کا سسٹم روز بروز ترقی پر ہے۔ شہروں، قصبوں بلکہ دیہات تک میں بنک کھلے ہوئے ہیں اور لوگ ان میں برابر اپنا روپیہ جمع کرتے اور اپنی جمع شدہ رقم پر سالانہ سُود لیتے ہیں۔ یہ طریقہ اس سُود جیسا نہیں ہے جس کو شریعت نے حرام کیا ہے ان دونوں میں بیّن فرق ہے۔

۱۔ جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس پر قرض کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ہم بخوشی اس کو جمع کرتے ہیں اور مقصود ہمارا اپنے پیسے کی حفاظت ہوتا ہے۔

۲۔ نفع و نقصان میں دونوں پارٹیاں برابر کی شریک ہیں یعنی اگر کوئی بنک فیل ہو جائے تو اس کا نقصان ان سب کو برداشت کرنا ہو گا جو اپنی اپنی رقم جمع کرنے والے ہیں۔ لہٰذا اس کو قرض نہیں کہا جا سکتا بلکہ ایک تجارتی معاہدہ ہے۔

۳۔ بنک والے ختم سال پر جو کچھ بطور سُود دیتے ہیں وہ اپنی مرضی سے دیتے ہیں۔ ورنہ پیسہ جمع کرانے والے کی طرف سے اس کے متعلق کوئی شرط نہیں ہوتی۔

۴۔ بنک والے جو رقم جمع کرتے ہیں وہ اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ اس سے تجارت کرتے ہیں اور جو منافع ہوتا ہے، اس کا ایک حصہ رقم جمع کرنے والوں کو بقدر اس کی رقم کے دیتے ہیں۔ یہ منافع مطابق ان کی سالانہ آمدنی کے تقسیم ہوتا ہے۔ زیادہ رقم پر سود کی رقم بڑھ جاتی ہے کم ہونے پر کم دی جاتی ہے اس سے معلوم ہوا وہ سودی قرضہ سے علیحدہ ایک چیز ہے۔

البتہ جو قرضہ بنک سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں۔ کیونکہ وُہ تو لیا ہی قرض کے طور پر جاتا ہے۔ اس میں ضرر کی ایک ہی صورت باقی رہتی ہے یعنی اگر قرض لینے والے کو تجارت میں نقصان ہو تو بنک سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی زد صرف قرض لینے والے پر پڑے گی۔ اس طرح اگر کوئی رقم ذاتی ضرورت کے لیے لی جاتی ہے اور قرض لینے والا ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو بنک کا سُود بڑھتا ہی جاتا ہے اور یہی اس کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا سُود حرام کر کے خدا نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچا لیا۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ

اے ایماندارو جب تم ایک میعادِ مقررہ تک کے لیے آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اس کی لکھا پڑھی کر لیا کرو۔ اور لکھنے والے کو چاہیئے کہ تمہارے درمیان جو قول قرار ہوا ہے اُسے ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیئے بلکہ جس طرح خدا نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا ہے اسی طرح اس کو بے عذر لکھ دینا چاہیئے اور جس کے ذمہ قرض عائد ہوتا ہے اس کو چاہیئے کہ تمسک کی عبارت بتاتا جائے اور خدا سے جو اس کا رب ہے ڈرتا رہے اور بتانے میں قرض دینے والے کے حقوق میں کچھ کمی نہ کرے اور اگر قرض لینے والا کم عقل یا ضعیف ہو یا خود تمسک کا مطلب نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا سرپرست ٹھیک ٹھیک انصاف سے لکھوا دے اور اپنے بڑوں میں سے جن لوگوں کو تم گواہی کے لیے پسند کرو کم سے کم دو مردوں کی گواہی کرا لیا کرو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک اگر بھول جائے گی تو ایک دوسری کو یاد دلا دے گی۔ اور جب

گواہ حاکم کے سامنے گواہی کے لیے بُلائے جائیں تو وُہ حاضر ہونے سے انکار نہ کریں اور قرض کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی میعاد معیّن تک کی دستاویز لکھوانے میں کاہلی نہ کریں خدا کے نزدیک لکھا پڑھی بہت ہی منصفانہ کارروائی ہے اور گواہی کے لیے بھی مضبوطی ہے، (اور بہت قرینِ قیاس ہے) تاکہ تم آئندہ کسی شک و شبہ میں نہ پڑو۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ص وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

اگر نقد لین دین ہو تو نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام نہیں لیکن جب ایسی خرید و فروخت ہو تو گواہ کر لیا کرو اور کاتبِ دستاویز اور گواہ کو ضرر پہنچایا جائے اگر تم ایسا کر بیٹھے تو یہ تمہاری شرارت ہوگی اللہ سے ڈرو۔ خدا تم کو معاملہ کی صفائی سکھاتا ہے اور وُہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے اور قرض دینا ہو تو رہن با قبضہ رکھ لو اور اگر تم میں سے ایک کو ایک کا اعتبار ہو تو یوں ہی قرضہ دیا جا سکتا ہے۔ قرض لینے والے کو چاہیئے کہ قرض دینے والے کی امانت پُوری پُوری ادا کر دے اور اپنے پالنے والے خدا سے ڈرے۔ مسلمانو تم گواہی کو نہ چھپاؤ جو چھپائے گا بیشک اُس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے خوب جانتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣقف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣقف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۣوقفه وَاغْفِرْ لَنَا ۣوقفه وَارْحَمْنَا ۣوقفه اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وُہ سب اللہ ہی کا ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے چاہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ اُس کا محاسبہ ضرور کرے گا۔ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا اُس پر عذاب کرے گا اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ہمارے پیغمبر محمّد پر جو کچھ اُن کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور ان کے ساتھ مومنین بھی سب کے سب خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور کہنے لگے، اے ہمارے پروردگار ہم نے تیرے احکام سُنے اور مان لیے۔ پروردگار ہمیں تیری ہی مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لیے کیا اور جس نے بُرا کام کیا تو اُس کا وبال اُسی پر پڑیگا۔ اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھُول جائیں یا غلطی کریں تو ہماری گرفت نہ کر۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے اگلے لوگوں پر ڈالا تھا اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ ہم پر نہ ڈال جس کے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تُو ہی ہمارا مالک ہے اور تُو ہی کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اسلام میں یہی خوبی ہے کہ اس کے جتنے احکام ہیں وہ فطرتِ انسانی پر غیر معمولی بار نہیں ہر شخص کو اتنی ہی تکلیف دی گئی ہے جتنی وہ برداشت کر سکے مثلاً نماز کھڑے ہو کر پڑھنا واجب ہے لیکن اگر بیمار ہو تو بیٹھ کر پڑھے۔ اگر بیٹھا بھی نہ جائے تو لیٹ کر پڑھے۔ اشارہ سے پڑھے۔ اسی طرح روزہ میں بھی، سفر میں اور بعض مجبوریوں میں رعایت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا آرام چاہتا ہے ان کو تکلیف نہیں دینی چاہتا۔ پہلی اُمتوں کے لیے جو احکام تھے وہ اُن کی شرارتوں کی وجہ سے بہت سخت کر دیئے گئے تھے۔ مثلاً پچاس نمازیں مال کا چوتھائی حصہ زکوٰۃ۔ نجس کپڑے کو بجائے دھونے کے کاٹ دینا۔ مسجد کے سوا دوسری جگہ نماز نہ پڑھنا۔ تیمم سے نماز صحیح نہ ہونا۔ رمضان میں سو جانے کے بعد پھر کھانے کی اجازت نہ ہونا۔ رمضان میں عورت کے پاس جانے کی ممانعت وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ہمارے رسولؐ رحمۃ للعالمین تھے لہٰذا خدا نے اُن کی اُمت پر اپنے احکام بہت آسان کر دیئے۔

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۗ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾

اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں وُہ زندہ ہے اور سارے جہان کا انتظام کرنے والا ہے اے رسول اُس نے تم پر حق کتاب نازل کی ہے جو ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔ اس سے پہلے اللہ نے توریتؔ انجیل کو نازل کیا جو لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت تھی اور قرآن کو نازل کیا جن لوگوں نے آیاتِ خدا کے قبول کرنے سے انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، اللہ ہر چیز پر غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ آسمان میں ہو یا زمین میں۔ اللہ پر کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ وُہی تو وُہ خُدا ہے جو ماں کے پیٹ میں جیسی صورت چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا

کوئی معبود نہیں وہ ہر شے پر غالب اور دانا ہے۔ وُہ وہی ہے جس نے کتاب (قرآن) نازل کی اس میں بعض آیتیں تو محکم ہیں جو بہت صریح ہیں عمل کرنے کے لیے اصل و بنیادی ہیں اور کچھ آیتیں متشابہ یعنی گول گول ہیں جن کے معنی میں کئی پہلو نکل سکتے ہیں پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وُہ انہی آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فساد برپا کریں اور اس واسطے بھی کہ انہیں اپنے مطلب کے موافق ڈھال لیں اور خدا اور ان لوگوں کے سوا جو بڑے پایہ کے ہیں ان کا اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ سب محکم ہوں یا متشابہ، ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور عقل والے ہی اس کو سمجھتے ہیں۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ قرآنِ کریم اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہو چکی ہیں ان سب کی تصدیق کرتا ہے لیکن یہ تصدیق صرف انہی احکام و ہدایات کی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے نہ کہ ان تحریفات کی جو علمائے یہود و نصارٰی نے کر کے ایک نئی توریت و انجیل بنا کر لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

توریت سے مراد وہ احکام جو حضرت موسٰیؑ پر تقریباً چالیس سال تک نازل ہوتے رہے ان میں سے دس احکام تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی الواح پر کندہ کر کے ان کو دیئے تھے باقی احکام کو حضرت موسٰیؑ نے لکھوا کر ان کی بارہ[۱۲] نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ[۱۲] قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اس کا نام توریت تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی صورت میں بیت المقدس کی پہلی تباہی تک محفوظ تھی۔ لیکن جب بخت النصر نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو توریت کی تمام کتابیں، جو لوگوں کے پاس تھیں تباہ ہو گئیں۔ اس کے بعد لوگوں نے جو جس کو یاد تھا لکھ کر توریت نام رکھا۔ اسی زمانہ میں تحریفات و تصرفات شروع ہوئے بہت زمانہ بعد حضرت عزیرؑ نے اصلی توریت کا پتہ چلایا۔ لیکن محرّفہ توریت کا رواج عام ہو چکا تھا اس لیے یہودیوں کے پاس وہی رہی۔ یہی حشر انجیل کا ہوا جو چار انجیلیں رائج ہیں وہ اصلی انجیلیں نہیں بلکہ ان کے اندر وہ باتیں پائی جاتی ہیں جو حضرت عیسٰیؑ نے اپنے حواریوں سے بیان کی تھیں۔ موجودہ انجیلوں میں وہ اقوال داخل ہیں لیکن ان کو حضرت عیسٰیؑ پر نازل ہونے والی انجیل نہیں کہا جا سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۗ (وہ رحموں میں تمہاری جیسی صورت چاہتا ہے بناتا ہے) اس آیت میں خدا نے اپنی کمالِ صنعت کا ذکر کیا ہے۔ پہلے وقتِ مجامعت نطفہ کو اصلابِ آباء سے نکالا۔ پھر اس کا رحم تک پہنچایا پھر عورت کی منی کو اس سے ملایا۔ پھر کچھ دن بعد اس نطفہ کو علقہ (خون کا لوتھڑا) بنایا پھر علقہ کو گوشت کا بچہ بنایا پھر ہڈی بنائی پھر ہڈی پر گوشت چڑھایا پھر اس میں روح ڈال کر مُردہ کو زندہ کیا۔ یہ اس کی قدرت کے کرشمے ہیں دوسرا کون کر سکتا ہے۔ اس پر بھی غور کرو ہر مصوّر جو نقش بناتا ہے وہ ساکن سطح پر بناتا ہے چلتی پھرتی موجوں پر نہیں بناتا، متحرک سطح پر نہیں بناتا لیکن اس صانعِ عالم نے نطفہ کے قطرہ پر جو سیال تھا، انسانی بدن کا نقش بنانا شروع کیا۔ پھر یہ دیکھو کہ ہر مصوّر جو نقش بناتا ہے وہ روشن سطح پر بناتا ہے تاکہ ہر خد و خال آسانی سے بن سکے لیکن مصوّرِ قدرت نے اپنا کمال دکھانے کے لیے یہ نقش تین تین تاریکیوں میں بنایا ہے۔ اوّل وہ جھلی جس میں وہ نطفہ ڈالا گیا پھر بچہ دانی کی تاریکی پھر پیٹ کی تاریکی اور پھر ایسا نقش بنایا کہ قدرت اپنی صنعتِ کاملہ پر جھوم گئی اور اپنی تعریف میں یہ الفاظ کہہ اٹھی فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ "پاک ہے وہ اللہ جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے"۔ نہ ماں کو خبر کہ اس کے پیٹ میں کیا بن رہا

ہے۔ لڑکا ہے یا لڑکی۔ کالا ہے یا گورا شقی ہے یا سعید۔ ناقص الخلقت ہے یا کامل الخلقت۔ نہ باپ کو اطلاع کرا اندر ہی اندر کیا ہورہا ہے۔ صرف نو ماہ بعد کارخانۂ قدرت کی یہ بنی ہوئی مکمل مشین شکمِ مادر سے باہر آتی ہے۔ قدرت نے جو پرُزے اس میں فٹ کیے ہیں اگر ان میں سے کوئی پرُزہ خراب ہوجائے تو دُنیا کے کسی کارخانہ سے ایسا پرُزہ نہیں مِل سکتا۔ عجب یہ ہے کہ اگر ایک بال گر جائے تو کوئی اسے دوبارہ جما نہیں سکتا۔

مُحْكَمٌ وَّ مُتَشَابِه ۔ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں۔ اوّل محکم، جن کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تمام احکام جو از قسم عبادات و معاملاتِ باہمی ہیں وہ سب آیاتِ محکمات کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وغیرہ۔ دوسری آیات متشابہات ہیں جن کے معنی واضح نہیں اور ان کے معنی میں کئی کئی پہلو نکلتے ہیں اور اصلی مفہوم سمجھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ بنا بر تقلید یا تعصب کوئی ایسی تاویل کرتے ہیں جو ان کے مقصد و مدعا اور عقیدہ کے مطابق ہو چونکہ اسلام میں تہتّر فرقے ہیں جن کے عقیدے مختلف ہیں لہٰذا وہ آیاتِ متشابہات ہی سے کام لے کر اپنا مقصد پورا کرتے ہیں اور اپنے عقیدہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایسی آیات کو پیش کرتے ہیں۔

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ الخ ۔ خدا فرماتا ہے کہ ان آیات کی تاویل کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان لوگوں کے جو علم کے بڑے رتبہ پر فائز ہیں۔ انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ راسخون فِی العلم کون ہیں فرمایا وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ سے نیکی ہو زبان سچی ہو دل مستقیم ہو اور جو حرام پیٹ اور فرج سے محفوظ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ صفات معصوم کے سوا دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ کیونکہ اس امت میں ان کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے نیکی کے سوا کوئی ظلم نہ کیا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ دل میں کبھی کوئی غلط خیال نہ گزرا ہو لقمۂ حلال کے سوا لقمۂ حرام نہ کھایا ہو۔ (درمنثور سیوطی) یہ سب صفتیں علیحدہ علیحدہ نہیں بلکہ من حیث المجموع اہلبیت کے سوا دوسروں میں نہ ملیں گی۔

راسخون فی العلم سے مراد صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کو علم میں اتنا رسوخ حاصل ہو کہ وُہ کسی سوال کے جواب میں یہ نہ کہیں کہ ہم اس کا جواب نہیں جانتے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ متکلم اپنے کلام میں ایک ہی معنی معیّن کرتا ہے نہ کہ دس دس۔ پس جن کے گھر میں کلامِ خدا نازل ہُوا اور جن کو اس کی تعلیم دی گئی وہی خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس آیت کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ ایسی آیات اس لیے نازل کی گئی ہیں کہ لوگ رسولؐ کی طرف سے بے خبر نہ ہوجائیں اور جو باتیں ان کی سمجھ میں نہ آئیں اُن کا مطلب کسی غیر سے نہ پوچھیں بلکہ رسولؐ سے آکر پوچھیں تاکہ رسولؐ اور امت میں رابطہ قائم رہے۔ پس رسولؐ کے بعد ہر زمانہ میں کوئی ایک شخص ایسا باقی رہنا چاہیئے جو معصوم ہو اور رسولؐ کی طرح وہی علم رکھتا ہو تاکہ وہ صحیح تاویل بتا سکے ورنہ گمراہی کا اندیشہ ہے۔

موجودہ قرآن میں راسخون فِی العلم کے بعد "م" لکھی ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آیاتِ متشابہات کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یہاں تک کہ رسولؐ بھی نہیں جانتے۔ تو ایسی صورت میں ان آیات کا نازل کرنا بے سُود ہُوا کیونکہ خدا تو کسی کو بتانے کے لیے نہیں آتا اور اس کے سوا کوئی ان آیات کی تاویل جانتا نہیں پھر لوگ کس سے معلوم کریں۔ ضرور اللہ کے بعد کچھ لوگ ہر زمانہ میں ایسے موجود رہنے چاہئیں جو صحیح تاویل بتا سکیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ⑨ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ⑩ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫

اور وُہ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت کرنے کے بعد ڈانواں ڈول نہ کرنا، اور ہمیں اپنی بارگاہ سے رحمت عطا کر تو سب سے زیادہ بخشنے والا ہے تو ہی ایک دن جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں سب لوگوں کو جمع کرے گا بیشک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے ان کو خدا کے عذاب سے نہ ان کے مال ہی بچائیں گے نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی یہی لوگ جہنّم کے ایندھن بنیں گے۔ ان لوگوں کا حال قومِ فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا خدا نے ان کے گناہوں کے بدلہ میں انہیں دھر پکڑا اور خدا تو سخت سزا دینے والا ہے۔ اے رسول کافروں سے کہہ دو تم مسلمانوں کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہو گے اور جہنّم میں اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ

وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

بے شک تمہارے سمجھنے کے لیے ان دو مخالف گروہوں میں جو بدر کی لڑائی میں ایک دوسرے سے گتھ گئے تھے رسول کی سچائی کی ایک بہت بڑی نشانی ہے کہ ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کرتا تھا، ایک کافروں کا تھا جن کو مسلمان اپنی آنکھ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ اللہ اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے۔ بے شک آنکھوں سے دیکھنے والوں کے لیے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے (دُنیا میں) لوگوں کو ان کی مرغوب چیزیں مثلاً بی بیوں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیروں عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی باڑی کے ساتھ الفت کھُل کر دکھا دی گئی ہے یہ سب دنیوی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں اور ہمیشہ کا اچھا ٹھکانا تو خدا ہی کے یہاں ہے ان لوگوں سے کہو کیا میں تم کو ان سب چیزوں سے بہتر چیز بتاؤں (اچھا سنو) جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں بہشت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اس کے علاوہ ان کے لیے صاف ستھری بیبیاں اور سب سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی ہے اور خدا اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

پہلی آیات میں بدر کا مختصر قصہ بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ ظاہر کرے کہ اس جنگ میں ہمارے رسولؐ کی رسالت کی تصدیق کے لیے بڑی بڑی نشانیاں موجود تھیں ایک تو ان میں مسلمانوں کا گروہ تھا جن کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی جن میں ستتر مہاجر تھے اور دو سو چھتیس انصار تھے جو خدا کے عبادت گزار بندے تھے اور اسلام کے فدائی دوسری جماعت کافروں کی تھی جو مسلمانوں سے دوگنے تھے جن کا سردار ابوجہل تھا۔ مسلمان کافروں سے آنکھیں بند کر کے نہیں لڑے نہ ایسے نادان تھے کہ کم و زیادہ میں تمیز نہ کر سکتے ہوں سب کچھ ان کے علم میں تھا مگر وہ خدا پر بھروسہ کر کے لڑے اُن کو یقین تھا کہ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے اور فتح ہماری ہی ہوگی۔

آگے کی آیت میں خدا مسلمانوں کو یہ بتا رہا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسان کے دل میں سب سے زیادہ ہے ان میں اول نمبر عورتوں کا ہے شیطان کا سب سے بڑا جال عورت ہے۔ دُوسری محبت کی چیز اولاد ہے جس کی محبت میں انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔ تیسری چیز خدا کی یاد سے غافل کرنے والی روپیہ پیسہ کی محبت ہے۔ چوتھی چیز گھوڑے ہیں پانچویں چیز کھیتی باڑی ہے۔ فرماتا ہے کہ مسلمانو تم ان کی محبت میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ یہ تو چند روزہ بہار ہے آخر ایک دن ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر دُنیا سے رخصت ہو جاؤ گے ان میں سے کوئی چیز تمہارے ساتھ جانے والی نہیں لہٰذا ان کی فکر میں نہ رہو بلکہ اپنے اعمال کی طرف

توجہ کرو جو تم کو ایسے باغوں میں لے جانے کے باعث ہوں گے جہاں نہریں بہت ہوں گی اور خوبصورت عورتیں تمہارے سامنے ہوں گی اور پھر خدا کی خوشنودی بھی تمہیں حاصل ہوگی یہ سب نعمتیں دوامی ہوں گی۔

جنگِ بدر میں رسولؐ کی رسالت کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ اوّل تو دشمن کی تعداد زیادہ تھی دوسرے اس کے ساتھ سامانِ جنگ بہت زیادہ تھا۔ پھر عیش و نشاط کا سامان بھی ساتھ تھا۔ شرابیں پیتے تھے۔ رقص و سرود میں راتیں گزارتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ کل دو آدمیوں کے پاس گھوڑے تھے اور چھ زرہ پوش تھے۔ کھانے کی طرف سے بھی مطمئن نہ تھے۔ اس صورت میں فتح کی کیا امید ہو سکتی تھی۔ پس مسلمانوں کی فتح ہونا اس کی دلیل ہے کہ خدا کی مدد ان کے ساتھ تھی اگر حضرت رسولِ خداؐ سچے نبی نہ ہوتے تو خدا ان کی مدد کیوں کرتا۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں پس ہمارے گناہ بخش دے اور عذابِ جہنّم سے بچا لے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں سچ بولنے والے ہیں خدا کے سامنے گڑگڑانے والے ہیں۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی راتوں میں خدا سے استغفار کرنے والے ہیں۔ خدا اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی گواہی دی ہے کہ خدا عدل و انصاف کے ساتھ دنیا کے کارخانے کا چلانے والا

ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہر شے پر غالب اور حکمت والا ہے، بے شک سچا دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے اہلِ کتاب نے جو اس دینِ حق سے اختلاف کیا ہے تو آپس کی شرارت اور حقیقتِ امر معلوم ہونے کے بعد ہی کیا ہے۔ جس شخص نے خدا کی نشانیوں سے انکار کیا تو خدا اس سے بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اگر یہ لوگ تم سے خواہ مخواہ کج بحثی کریں تو کہہ دو کہ میں نے تو خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور اس نے بھی جو میرا پیرو ہے۔ اے رسول تم اہلِ کتاب اور جاہلوں (مکہ والوں) سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسلام لے آئے ہو یا نہیں اگر اسلام لے آئے تو راہِ راست پر آ گئے اگر منہ پھیریں تو اے رسول تم پر صرف پیغام پہنچا دینا فرض ہے اور خدا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔ سے معلوم ہوا کہ خدا عادل ہے اپنی توحید کے بعد ہی اس نے اپنے عدل کا ذکر کیا ہے لہٰذا ہم نے عدل کو اصولِ دین میں داخل کر لیا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے نبی کو بھی قتل کر دیا ہے تو توبہ کے بعد خدا اس کو بخش سکتا ہے یہ عقیدہ سراسر باطل ہے۔ عدلِ الٰہی کا اقتضا یہ ہے کہ مقتول کا بدلہ لے۔ ورنہ مقتول کی فریاد سننے والا کون ہوگا۔ جب اس نے فرمایا ہے کہ اگر عمداً بندۂ مؤمن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے تو پھر معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ دنیا میں بہت سے ادیان پائے گئے۔ ان میں سے بعض تو مر گئے بعض نیم مردہ ہیں اور بعض چل رہے ہیں۔ عقلی فیصلہ یہ ہے کہ جب سب کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ لیکن دنیا والوں نے دینِ خدا میں تصرفات کر کے نئے نئے دین بنا لیے۔ لیکن اس امرِ اہم کو بندوں کی مرضی پر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاءؐ تک خدا کا پسندیدہ دین تو ایک ہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ یہ دین فطرتِ انسانی پر نظر رکھ کر بنایا گیا ہے پس جہاں فطرت کے خلاف کوئی امر پایا جائے گا وہ عقل کے خلاف ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ خدا کے دین کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ خدا کا شریک کسی کو قرار نہ دیا جائے اور صدقِ دل سے اس کی توحید کا اقرار کیا جائے۔ ہر انسان اپنی فطرت پر غور و خوض کے بعد اس عقیدہ کے ماننے پر مجبور ہوگا کیونکہ اس کی فطرت یہ بتاتی ہے کہ مُدبّرِ عالم ایک ہی ہونا چاہیے جیسے اس کے بدن کا مُدبّر صرف ایک ہی دل ہے اگر اس کے سینہ میں دو دل رکھ دیے جائیں تو تمام بدن کا نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک ہی روح اس کے سارے بدن پر کارفرما ہے اگر کوئی دوسری روح اس پر مسلط کر دی جائے تو پھر اس کی موت یقینی ہے۔ دو حکومتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ اگر دونو برابر اختیار والے ہیں تو دو کی ضرورت نہیں اور اگر ان کی طاقت و قدرت کم و بیش ہے تو غالب قوت اپنے شریک کو ہرگز مداخلت نہ کرنے دے گی۔ پس جن ادیان میں توحید نہیں یا ناقص ہے وہ خدائی دین نہیں کہے جا سکتے۔ اسلام جو خدا کا دین ہے شروع سے آخر تک اسی عقیدہ کی تعلیم دیتا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح نبوت و قیامت وغیرہ کا عقیدہ بھی دلائل و براہین سے ثابت ہے پس جہاں اصول اسلام نہیں پائے جاتے یا ناقص صورت میں پائے جاتے ہیں وہ خدائی دین کہلانے کے مستحق نہیں۔ جن لوگوں نے بتوں کو خدا سمجھا یا اُن کے اندر خدا کو حلول کیا ہوا جانا یا جنھوں نے عزیرؑ نبی کو ابن اللہ کہا (یہودی) یا جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ اور حضرت مریمؑ کو معاذ اللہ خدا کی بی بی سمجھا وہ کھلے مشرک ہیں۔ ان کا

دین خدا کا دین نہیں کہا جا سکتا کیونکہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ جورو۔ باپ بیٹا ہونا مخلوق کی صفت ہے نہ کہ خالق کی

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ز وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ص وَّغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَکَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰھُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ قف وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط

جو لوگ خدا کی آیات سے انکار کرتے ہیں اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور ان کو بھی قتل کرتے ہیں جو انہیں انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں تو ان لوگوں کو اے رسول دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو یہی وہ لوگ ہیں جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں بیکار ہو گئے کوئی ان کا مددگار نہیں کیا تم نے ان علمائے یہود کے حال پر نظر نہیں کی جن کو کتاب توریت کا ایک حصہ دیا گیا تھا اب ان کو کتابِ خدا کی طرف بُلایا جاتا ہے تاکہ وہی کتاب ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر دے تو اس پر بھی ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے یہی لوگ تو روگردانی کرنے والے ہیں۔ یہ سرکشی اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں سوائے چند دنوں کے جہنم کی آگ ہمیں چھوئے گی بھی نہیں۔ جو افترا پردازیاں یہ لوگ کرتے رہے ہیں انہوں نے ہی ان کو دین کے معاملہ میں بھی دھوکا دیا ہے پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ان کو قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں

اکٹھا کر دیں گے اور ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اے رسول کہہ دو کہ تم یہ دعا مانگو اے خدا تمام عالم کا مالک تو ہی ہے تو جسے چاہے ملک عطا کرے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔

یہودیوں کو اس بات پر بڑا غرہ تھا کہ خدا ہم پر عذاب نہ کرے گا اور اگر کرے گا بھی تو چند روز کے لیے کیونکہ ہم اولادِ انبیاءؑ ہیں وہ اپنے پیارے نبیوں کی اولاد کو آتشِ جہنم میں کیوں جلائے گا۔ اس بنا پر بدکاری کرنے میں ان کی جسارت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ جب اس زمانہ کے انبیاءؑ جو شہر شہر گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے تھے ان کو بُرے کاموں سے روکنا چاہتے تھے تو وہ کہتے تھے آپ ہماری فکر نہ کریں جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اُسے ہم دھیان میں نہیں لاتے آخر ایک روز آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے صبح ہونے سے پہلے سولہ نبیوں کو قتل کر دیا۔ جب ایک سو بارہ خدا کے نیک بندوں نے اس قتل پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تو ان شریروں نے ان سب کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں جو یہودی تھے چونکہ وہ اپنے اسلاف کی اس حرکت پر نادم نہیں تھے لہٰذا اُن کی تنبیہ کے لیے یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو آگاہ کیا گیا کہ قیامت میں سب سے زیادہ عذاب انہی پر ہوگا۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ۔ توریت میں شوہر والی عورت اور بی بی والے مرد کی سزا سنگسار کرنا تھی۔ ابتدائے اسلام میں دو ایسے ہی مرد و عورت نے زنا کیا چونکہ دونوں مالدار تھے یہودی عالم ان کے خلاف فتوٰی دینا نہیں چاہتے تھے اور اس فکر میں تھے کہ کسی حیلہ سے ان کو بچا لیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ پیغمبرِ اسلامؐ سے کرایا جائے۔ چنانچہ قوم کے سربرآوردہ لوگ حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ مسئلہ پیش کیا۔ آپؐ نے فرمایا توریت کے حکم کے مطابق ان دونوں کو سنگسار کیا جائے۔ یہودی علماء نے یہ سمجھ کر کہ حضرتؐ توریت پڑھے ہوئے نہیں ہیں بڑی دلیری سے کہا یہ حکم توریت میں نہیں ہے حضرتؐ نے فرمایا توریت کو لا کر میرے سامنے پڑھو وہ لے آئے مگر شرارت یہ کی کہ اصلی آیت چھوڑ گئے اور آگے پیچھے کی آیتیں پڑھ دیں جن کا اس مسئلہ سے تعلق نہ تھا۔ عبداللہ بن سلامؓ نے جو پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے اور توریت کے حافظ تھے انہوں نے توریت کو ان سے لے کر اس آیت کو پڑھ دیا اور ان کی چوری ظاہر کر دی۔ ان آیات میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿٢٨﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی

السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿٢٩﴾ یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٣٠﴾ ع

بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ وہ زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور مُردہ سے زندہ کو اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے مومنوں کو چاہیے کہ وُہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں جو کوئی ایسا کرے گا پھر اُسے کسی چیز یعنی خدا سے واسطہ نہ رہے گا سوائے اس کے کہ تم ان کے شر سے ڈر کر کچھ بچاؤ کر لو اور اللہ تعالیٰ تمہیں صرف اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اسی کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔ اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے خواہ اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اُسے جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اُسے بھی جانتا ہے۔ اور اللہ ہر شے پر قادر ہے وُہ دن یاد رکھو جبکہ ہر شخص اپنی ہر نیکی اور بدی کو جو وہ کر چکا ہے موجود پائے گا اور یہ خواہش کرے گا کہ اس کے اور اس کی بُرائی کے درمیان ایک لمبی مدّت حائل ہو جاتی (اور اس سے مواخذہ نہ ہوتا) اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

ان آیات میں حسبِ ذیل باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے :

١۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ سے زندہ کو۔ جیسے انڈے سے مرغی اور مرغی سے انڈا یا جیسے نطفہ سے انسان بنایا ہے اور انسان سے نطفہ۔

٢۔ دوسرے مومنین کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں یعنی اپنے اوپر اُن کو ایسا غلبہ نہ دیں کہ اسلامی فرائض ادا کرنے سے وہ قاصر ہو جائیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی مصالح کی بنا پر اُن سے تعلقات پیدا کرنے ناگزیر ہوں جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔ تو یہ تعلقات اس حد تک رہیں کہ اسلام کے اصول و فروع پر کوئی زد نہ پڑ سکے۔

٣۔ اگر کوئی شخص ایسے لوگوں کے درمیان محصور ہو گیا ہو جو اس کے دین اور مذہب کے سخت مخالف ہوں اور وہ اپنے عقیدہ کا اقرار کرانا چاہتے ہوں یا کوئی غلط بات اس سے کہلوانی چاہتے ہوں اور درصورتِ انکار اُس کی اپنی جان جانے کا خوف ہو تو اسلام نے اجازت دی ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو کچھ وہ لوگ کہلانا چاہیں کہہ دے بشرطیکہ وہ اپنے دل میں اپنے ایمان پر قائم ہو اس کو تقیہ کہتے ہیں ہر شخص فطرۃً جان کے لیوا خطروں میں اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ یہ قابلِ اعتراض بات نہیں۔ جو لوگ اس مسئلہ میں شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ غور و تامل سے کام نہیں لیتے اور محض شیعوں کی ضد میں اعتراض کر دیتے ہیں۔ تقیہ کے جواز اور ثبوت میں ایک دو

نہیں سینکڑوں مضامین لکھے جاچکے ہیں اور کتابوں کی صورت میں بھی جواز ثابت کیا جاچکا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ عہدِ رسولؐ میں بھی تقیہ کیا جاتا تھا جیسا کہ حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ثابت ہے کہ جب انہیں مشرکین مکہ نے قتل کی دھمکی دے کر کلمۂ کفر کہلوانا چاہا تو کہہ دیا اور روتے ہوئے رسولؐ کے پاس آئے حضرتؐ نے فرمایا "ایسا کہہ دینے سے تم کافر نہیں ہوئے کیونکہ تمہارا دل ایمان سے پُر ہے اگر پھر کبھی ایسا موقع آئے تو پھر کہہ دینا۔" ہم اس موقع پر جناب مولانا مودودی صاحب کی کتاب تفہیم القرآن جلد اول صـ۲۴۴ سے تقیہ کے متعلق ان کی رائے لکھتے ہیں۔

"لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ اس حد تک ہونا چاہیئے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کرلو۔"

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے تقیہ کے جواز کے متعلق یوں کہا ہے۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

یعنی جو جھوٹ کسی مصلحت کی بنا پر ہو وہ اس سچ سے کہیں بہتر ہے جو کسی فتنہ کے برپا کرنے کا سبب ہو۔

۴۔ اس دنیا کے مشاغل میں غرغب ہو کر انسان کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک دن اُسے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہاں جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہوگا سب کا سب ذرّہ ذرّہ اس کے سامنے موجود ہوگا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

اے رسول لوگوں سے کہدو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخشدے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے (اے رسول) کہدو کہ تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پس اگر تم نے رُوگردانی کی تو اللہ انکار کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنی محبت کو اتباعِ رسولؐ پر موقوف رکھا ہے یعنی جو لوگ رسولؐ کی پیروی کریں گے اور عمل میں ان کے قدم بقدم چلیں گے اللہ ان کو دوست رکھے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اطاعت اور پیروی بغیر محبت نہیں ہوسکتی محبت مقناطیس اطاعت ہے جہاں محبت نہیں وہاں اطاعت نہیں۔ محبت کے یہ معنی نہیں کہ صرف ذاتِ رسولؐ ہی سے محبت ہو بلکہ رسولؐ جن سے محبت رکھتے ہوں اُن سے محبت کرنا بھی فرض ہے۔ جن لوگوں نے صرف رسول سے محبت کی اور ان لوگوں کی محبت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جن سے رسولؐ محبت کرتے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ محبت مفید نجات نہ ہوگی۔ رسولؐ نے حضرت علیؑ سے بارہا فرمایا حُبُّكَ حُبِّيْ (تیری محبت میری محبت ہے)

(تم سے صلح مجھ سے صلح ہے اور تم سے جنگ مجھ سے جنگ ہے) جس طرح اللہ کی محبت بغیر محبتِ رسولؐ نہیں ہوسکتی اسی طرح رسولؐ کی محبت بغیر ان کے اہلبیتؑ کی محبت کے نہیں ہوسکتی۔ اگر اہلبیتؑ کی محبت واجب و لازم نہ ہوتی تو اس کو اجرِ رسالت قرار نہ دیا جاتا۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔ (میں تم سے اس کے سوا اور کوئی اجرِ رسالت نہیں چاہتا کہ میرے ذوی القربیٰ سے محبت کرو۔ اس کا مفصل حال سورۂ شوریٰ میں ملاحظہ کیجیے۔

کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں جو ایسے شخص کو دوست رکھتا ہو جو اس کی اولاد کا دشمن ہو اور اُن کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتا ہو۔ محبت ایک صلہ رکھتی ہے اور محبت کے ہزارہا درجات ہیں پس جس کسی کو جس درجہ کی محبت ہوگی اسی کے لحاظ سے اس کو صلہ ملے گا۔ مدارج ناشناس کی محبت اور ہے منافق کی اور صدقِ دل سے محبت کرنے والوں کی اور ہے۔ یہ آخری محبت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی پوری پوری اطاعت کرے اور اس کے نقشِ قدم پہ چلنے کی انتہائی کوشش کرے اور جان و مال سے ہر وقت اس کی مدد کرنے کے لیے تیار رہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓي اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

بے شک اللہ نے برگزیدہ کیا آدم و نوح اور اولادِ ابراہیمؑ اولادِ عمران کو تمام عالموں پر بعض کی اولاد کو بعض سے (بلند مرتبہ بنایا) اور اللہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جتنے انبیاؑ و مرسلین بھیجے وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے اس کے انتخاب میں آئے ہوئے تھے۔ پھر یہ کون سا انتخاب ہے جو مخصوص ہے آدم و نوح و آلِ ابراہیم و آلِ عمران سے۔ نبوت و رسالت کے علاوہ ضرور کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ اصطفا عمل میں آیا۔

۱۔ آدم علیہ السلام کا یہ انتخابِ خصوصی یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ بے ماں باپ کے پیدا کیے گئے تھے یا اس بنا پر کہ نسلِ انسانی ان سے چلی یا یہ کہ وہ خدا کے پہلے خلیفہ ہوئے۔

۲۔ نوحؑ کا انتخابِ خصوصی یا تو اس بنا پر ہے کہ شریعت کا آغاز اُن سے ہوا یا اس بنا پر ہے کہ نسلِ انسانی دوبارہ ان سے چلی اور اس بنا پر وہ آدمِ ثانی کہلائے۔

۳۔ آلِ ابراہیمؑ کا انتخابِ خصوصی اس بنا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب دی۔ حکمت دی اور ملکِ عظیم عطا فرمایا جیسا فرماتا ہے فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔

۴۔ آلِ عمران کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک موسیٰؑ مراد ہیں لیکن یہ تو آلِ ابراہیمؑ میں داخل ہیں اور ان کا

اصطفا ہو چکا ہے وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ (میں نے تمہیں اپنے لیے انتخاب کیا) ۔ بعض نے کہا ہے آلِ عمران سے مراد مریمؑ ہیں ۔ ان کا انتخاب بھی ہو چکا ہے ۔ یَا مَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفَاكِ وَطَھَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعَالَمِیْنَ ۔ کوئی اور خصوصیت موسیٰؑ و مریمؑ میں ایسی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر یہ خصوصی انتخاب ہوا ہو ۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آلِ عمران کچھ اور لوگ ہیں جن کو ان خصوصیات کے علاوہ جو آلِ ابراہیمؑ کو دی تھیں کوئی اور بھی خصوصیت حاصل ہے یعنی اولادِ ابراہیمؑ تو ہیں مگر ایک نئی فضیلت کے مالک ہیں عمران نام ہے حضرت ابو طالب کا پس ان کی اولاد یعنی ائمہ اثنا عشر کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ان میں ایک نہ ایک فرد ہر زمانہ میں بمصداق لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہدایت کے لیے موجود رہے گا ۔ آلِ ابراہیمؑ میں سوائے آلِ محمدؐ کسی کو یہ فضیلت حاصل ہی نہیں ہے ۔

تفسیر اہلبیت میں وارد ہے کہ آلِ عمران سے مراد علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد ہیں کیونکہ عمران ابو طالبؑ کا نام ہے ۔ تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت میں آلِ عمران کے بعد آلِ محمدؐ بھی تھا اور تفسیر ثعلبی میں ابن مسعودؓ سے بھی یہی روایت ہے ۔ مولانا مقبول احمد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے اپنے مترجمہ قرآن کے حاشیہ پر وہی لکھا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے ۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ج اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ط وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ج وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا لا وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ط كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ لا وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ج قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَكِ هٰذَا ط قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

جب عمران کی بی بی (حنّہ) نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ اے میرے پروردگار میں نے جو بچّہ میرے پیٹ میں ہے اُسے دُنیا کے معاملات سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے بس میری اس نذر کو قبول کر لے تو سب سے زیادہ سُننے والا اور جاننے والا ہے ۔ پس جب وضع حمل ہو (اور دیکھا کہ لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی) تو کہنے لگیں اے میرے پروردگار، اب میں کیا کروں میں تو لڑکی جنی ہوں (اس کہنے کی ضرورت کیا تھی) جو وہ جنی تھیں اللہ اس سے واقف تھا اور انہوں نے کہا لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا ۔ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے ۔ میں اس کو اور اس کی اولاد کو

کو شیطان مردود کے فریب سے بچانے کے لیے تیری پناہ میں دیتی ہوں ۔ اُن کے پروردگار نے اس نذر (مریم) کو خوشی سے قبول فرما لیا اور ان کی نشو و نما اچھی طرح کی اور زکریا کو ان کا کفیل بنایا جب کبھی زکریا مریم کے حجرۂ عبادت میں جاتے تو مریم کے پاس کچھ کھانا موجود پاتے، پُوچھتے کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا وہ کہتیں یہ اللہ کے یہاں سے آیا ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے ۔

بنی اسرائیل میں سالہا سال سے یہ رسم چلی آ رہی تھی کہ وہ خدمتِ بیت المقدس کے لیے اپنا ایک لڑکا مخصوص کر دیتے تھے ۔ وہ عمر بھر بیت المقدس میں رہ کر عبادت کرتا اور جھاڑو دغیرہ دینا اور صفائی کرتا تھا ۔ اس رسم کی بنا پر بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے اس رسم کو پُورا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ بعض عورتیں جب پیٹ میں بچہ ہوتا تھا اُس وقت سے یہ نذر مان لیتی تھیں چنانچہ اسی بنا پر حضرت مریمؑ کی والدہ نے بھی جب حاملہ ہوئیں تو یہ نذر مان لی ۔ لیکن ان کی امید کے خلاف بجائے لڑکے کے لڑکی پیدا ہوئی ۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ بہت رنجیدہ ہوئیں کیونکہ اب تک کوئی لڑکی بیت المقدس کی خدمت کے لیے نذر نہیں ہوئی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی تڑپ دیکھ کر رحم کھایا اور لڑکی ہی کو منظور فرما لیا اور ان کی نشو و نما میں فضلِ خدا شاملِ حال ہوا اور عام لڑکیوں سے جلد وہ خاصی سیانی ہو گئیں ۔ چنانچہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لے کر بیت المقدس میں پہنچیں اب وہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ لڑکی کا نگران کون بنے ۔ ہر پجاری چاہتا تھا کہ میں ہی کفالت میں لے لوں ۔ آخر قرعہ ڈالا گیا تو حضرت زکریاؑ کے نام پر نکلا ۔ اور نکلنا بھی چاہیئے تھا، اگرچہ وہ سب لوگ خدا کے نیک بندے تھے لیکن معصوم تو نہ تھے نیت کا کسی وقت بگڑ جانا ممکن تھا ۔

حضرت زکریاؑ نے جناب مریمؑ کو ایک حجرہ میں مصلّٰی بچھا کر بٹھا دیا کہ یہاں اللہ اللہ کیے جاؤ ۔ اس حجرہ کا دروازہ بند کر کے کنجی اپنے پاس رکھتے تھے صرف دن میں ایک بار کھانا پانی دینے کے لیے دروازہ کھولتے تھے ۔ لیکن جب آتے تو دیکھتے کہ خوشبودار کھانا ان کے سامنے رکھا ہوا ہے پوچھتے یہ کہاں سے آیا وہ بتا دیتیں کہ اللہ کے یہاں سے آیا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے ۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت اسد مادر امیر المؤمنینؑ کے لیے حضرت علیؑ کی ولادت کے وقت جنت سے کھانا آیا یا جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کے لیے ایسا ہوا تو لوگ مانتے نہیں لیکن مریمؑ کے لیے کھانا آنا تسلیم کرتے ہیں حالانکہ جناب خاتونِ جنتؑ کا مرتبہ مریمؑ سے کہیں زیادہ ہے ۔

سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے ان کا کہنا ہے یہ کھانا اس طرح وہاں کے پجاری ان کو پہنچا دیا کرتے تھے جیسا کہ لوگ عموماً مسجدوں کے درویشوں کو یا مندروں کے پجاریوں کو بھیج دیا کرتے ہیں ۔ لیکن ان کا یہ کہنا قرآن کے بیان کے بالکل خلاف ہے کھانے کی ذمّہ داری جناب زکریاؑ نے اپنے سر لی تھی دوسرے حجرہ کا دروازہ بند رہتا تھا کوئی غیر کیسے اندر داخل ہو سکتا تھا تیسرے یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی کہ کسی نے کھانا پہنچا دیا ہو اور حضرت زکریاؑ نے دیکھ لیا ہو ۔ بلکہ قرآن کہتا ہے جب کبھی زکریا آتے کھانا موجود پاتے ۔ چوتھے اگر کسی غیر کا بھیجا ہوا ہوتا تو جناب مریمؑ یہ نہ فرماتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے بلکہ صاف بتا دیتیں کہ یہاں کے رہنے والوں میں سے فلاں نے مجھے لا کر دیا ہے چھپانے کی کیا ضرورت تھی ۔ پانچویں یہ کھانا پھلوں کی صورت میں ہوتا تھا اور وہ بھی غیر موسمی، یعنی گرمی کے موسم میں جاڑے کے پھل اور جاڑے کے موسم میں گرمی کے پھل ۔ ایسا سوائے خداداد عطیہ کے اور کیسے ممکن تھا ۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا ۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ۗ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۗ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

جب حضرت زکریاؑ نے یہ دیکھا کہ ان کی سالی کی لڑکی یعنی مریمؑ پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے تو ان کے دل میں بھی اولاد پیدا ہونے کا خیال پیدا ہوا پس بارگاہِ باری میں یہ دعا کرنے لگے، اے میرے پالنے والے مجھے بھی اپنی بارگاہ سے پاک و پاکیزہ اولاد عطا فرما تو بے شک دعاؤں کا سننے والا ہے ابھی حجرۂ عبادت میں کھڑے یہ دعا کر ہی رہے تھے کہ فرشتوں نے ان سے کہا اللہ تم کو یحییٰ کے پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے جو کلمۃ اللہ عیسیٰؑ کی تصدیق کرے گا، لوگوں کا سردار ہوگا اور خواہشات کی روک تھام کرے گا اور ایک نکوکار نبی ہوگا۔ انہوں نے کہا اے میرے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بی بی بانجھ ہے۔ خدا نے فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے انہوں نے عرض کی میرے اطمینان کے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ خدا نے کہا بس نشانی یہی ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے مگر اشارے سے اور اس کے شکریہ میں اپنے ربّ کا ذکر زیادہ کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دعا حضرت زکریاؑ نے اس وقت کی جب وہ کافی بوڑھے تھے اور بی بی بانجھ تھی یعنی کوئی امید اولاد ہونے کی باقی نہ رہی تھی لیکن چونکہ قدرتِ الٰہی پر اعتماد رکھتے تھے اس لیے دُعا کی مگر جب ان کو بشارت دی گئی تو پھر کیوں کہا کہ ایسا کیسے ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہ سامنے آکر نہیں کہا تھا بلکہ ان کی آواز سُنائی دی تھی اس لیے اس کی تصدیق کے لیے پھر انہوں نے کہا یہ کیسے ہوگا۔ جب اس کی تصدیق ہو گئی تو مزید اطمینانِ قلب کے لیے علامت کا سوال کیا۔ جواب ملا تین دن تم اشاروں میں بات چیت کرو گے۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس شکریہ میں

سوائے ذکرِ الٰہی کوئی اور کلام کرنا ہی نہیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ اب اس سلسلہ میں کسی سے کوئی اور بات کرو ہی نہیں تاکہ لوگ تمہاری نسبت یہ بدگمانی نہ کرنے لگیں کہ تم سٹھ گئے ہو۔ اور تمہارے اس کہنے پر کہ میرے لڑکا ہوگا تمہارا مذاق نہ اُڑائیں۔ خاموش رہو جب لڑکا پیدا ہوگا تو سب ہی قدرتِ خدا کا تماشہ دیکھ لیں گے۔

حصُوراً کے معنی جن لوگوں نے یہ سمجھے ہیں کہ وہ عورتوں کی طرف رغبت کرنے والے نہ تھے ہمارے خیال میں غلط ہیں۔ اس سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ معاذ اللہ نامرد تھے۔ حالانکہ انبیاءؑ کے لیے یہ عیب ہے۔ بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی پر پورا پورا کنٹرول رکھنے والے تھے۔

حضرت یحییٰؑ چند ماہ کے حمل کے بعد پیدا ہوئے۔ ایسا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا۔ یہ خصوصیت صرف دو بچوں کو حاصل ہوئی اولادِ اسحاقؑ میں صرف حضرت یحییٰؑ کو اور اولادِ اسمٰعیلؑ میں صرف حضرت امام حسین علیہ السّلام کو۔ حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے چھ ماہ بڑے تھے اور حضرت عیسیٰؑ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر جانے سے چھ ماہ قبل شہید کیے گئے تھے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۗ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

جب ملائکہ نے کہا اے مریم اللہ نے تمہیں برگزیدہ کیا اور تمہیں برگزیدہ کیا دنیا کی عورتوں پر۔ اے مریم اپنے ربّ کی فرمانبرداری کرو سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ اے رسول یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو بذریعہ

وحی بتارہے ہیں۔ تم ان کے پاس اس وقت نہیں تھے جب انہوں نے اپنے اپنے قلم اس لیے پانی میں ڈالے کہ یہ معلوم کریں کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا اور جب وہ جھگڑا کر رہے تھے تم اس وقت بھی کہاں تھے۔ جب ملائکہ نے کہا اے مریم، اللہ تمہیں اپنے اُس کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسٰی بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں باعزت اور خدا کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ وہ بچپن میں اور بڑھاپے میں لوگوں سے یکساں کلام کرے گا اور نکوکاروں میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا میرے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ کسی مرد کا مجھ سے تعلق ہی نہیں۔ خدا نے فرمایا اس طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے جب وہ کہتا ہے ہو جا پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

ان آیات میں بہت سی چیزیں قابلِ بیان ہیں :

۱ - حضرت مریمؑ کا اِصطفا دو بار ہؤا۔ پہلا اِصطفا اس بنا پر ہے کہ اولادِ انبیاءؑ میں سے ان کو نساء العالمین کا سردار بنانے کے لیے چُنا گیا۔ دوسرا اصطفا اس بنا پر ہے کہ ان کو بغیر شوہر بچّہ جننے کے لیے چُنا گیا۔ آخر کی یہ فضیلت بے شک ایسی ہے کہ دُنیا کی کسی عورت کو اس میں شرکت نہیں ہے، رہیں اور صفات تو اُن میں دیگر عورتوں کی شرکت بھی ہے۔ مثلاً جناب فاطمۃ الزہرا صلوات اللہ علیہا بہت سے فضائل میں اس سے کہیں بہتر ہیں مثلاً جناب مریمؑ کے باپ نبی نہ تھے اور فاطمہ زہراؑ کے باپ خاتم الانبیاء تھے۔ دوسرے جناب مریمؑ کو شوہر کی طرف سے کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کے شوہر افضل الصدیقینؑ امیر المومنینؑ اور خلیفۂ ختم الانبیاءؐ تھے۔ جناب مریمؑ کی نسل سے صرف ایک معصوم ہو کر آئے اور جناب فاطمہؑ کی نسل سے گیارہ معصومین ہوئے ——— پس حضرت فاطمہؑ کا مرتبہ یقیناً جناب مریمؑ سے زیادہ تھا۔ اگر مریمؑ اس وقت کی تمام عورتوں کی سردار تھیں تو جناب فاطمہؑ تمام زنانِ عالم کی سردار ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ سیدۃ النساء اہل الجنۃ بھی ہیں یعنی جنت کی عورتوں کی سردار بھی ہیں۔

۲ - طَهَّرَكِ - اولادِ جناب اسحاقؑ میں صرف ایک جناب مریمؑ ایسی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کے رجس سے پاک رکھا تھا۔ یعنی حیض و نفاس وغیرہ کی آلائش سے پاک تھیں۔ گناہوں کی نجاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تاہم یہ تاکیدی طہارت نہ تھی یہی سبب تھا کہ یہودیوں نے ازراہِ عداوت ان پر معاذاللہ بدکاری کی جھوٹی تہمت عاید کر دی لیکن جناب فاطمہؑ جس آیتِ تطہیر کا مصداق ہیں اس میں يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ہے یعنی اہلبیتؑ سے طہارتِ کاملہ کا تعلق ہے۔ کوئی افترا پردازی بھی اُڑ کر اُن کی طرف نہیں آسکتی۔

جناب مریمؑ کا یہ واقعہ حضرت رسولِ خداؐ کی رسالت کی تصدیق کے لیے کافی ہے کیونکہ یہ واقعہ ہزارہا برس پہلے کا ہے نہ تو حضرتؐ وہاں موجود تھے اور نہ آپؐ نے توریت کو پڑھا تھا بلکہ یہ تمام واقعات بذریعہ وحی آپؐ کے علم میں آئے۔ اگر آپؐ سچے نبی نہ ہوتے تو ان واقعات کا علم آپؐ کو کیسے ہوتا۔ اسی لیے آپؐ کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت تھی تاکہ شک کرنے والے یہ شک نہ کریں کہ فلاں کتاب میں پڑھ لیا ہوگا۔

۳ - ملائکہ نے کہا اے مریمؑ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی بشارت دینے بہت سے ملائکہ آئے تھے حالانکہ اس آیت سے ان کی نفی ہوتی ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا وہ فرشتہ ایک آدمی کی شکل میں ان کے سامنے آگیا اور بشارت دی

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جمع کا صیغہ تعظیماً استعمال کیا گیا ہے ورنہ مراد جبرئیلؑ امین ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ملائکہ جبرئیل امینؑ کے ساتھ اظہارِ عظمت کے لیے آئے تھے سلام کرنے والے صرف جبرئیلؑ تھے۔

۴ - اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ - جس سے معلوم ہؤا کہ یہ نام خدا کا خود رکھا ہؤا ہے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء میں صرف دو نام ایسے ہیں جن کو خدا نے رکھا ہے ایک جناب یحییٰؑ کا نام دوسرے جناب عیسٰیؑ کا نام۔ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ یہ دو نام ایسے ہیں کہ ان سے پہلے کسی اور کے رکھے ہی نہیں گئے۔ اور بنی اسمٰعیل میں پانچ نام ایسے ہیں جو خدا نے رکھے ہیں اور یہ نام ان سے پہلے کسی نے نہیں رکھے تھے وہ محمدؐ۔ علیؑ۔ فاطمہؑ۔ حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔

۵ - بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کا تعلق عالم امری سے تھا جہاں کلمۂ کُن کہتے ہیں وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ اسباب و وساطت سے تعلق نہیں ہوتا۔

۶ - وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ - دنیا میں تو خدا نے یہ شرف بخشا کہ نبی و رسول کلمۃ اللہ و روح اللہ بنایا اور آخرت میں ان کو شفاعت کا اختیار دیا۔

يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا - اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچپن میں بھی ایسا ہی دانشمندانہ اور ہدایت آمیز کلام کرتے ہیں جیسا کہ ادھیڑ عمر میں کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ آسمان سے ضرور نازل ہوں گے ورنہ جب ان کا انتقال جوانی میں ہؤا تھا تو پھر ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام کرنا کیسا؟

قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ الخ - جب فرشتہ سے ولادتِ فرزند کی بشارت جناب مریمؑ نے سُنی تو تعجب سے کہا بھلا میرے بچّہ کیسے ہوگا جبکہ میرا تعلق کسی مرد سے رہا ہی نہیں۔ لَمْ يَمْسَسْنِي کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ مجھے کسی آدمی نے چھؤا ہی نہیں۔ کیونکہ ناممکن تھا کہ جناب مریمؑ کا بدن کوئی نہ چھوتا۔ کم سے کم اُن کے رشتہ داروں نے تو بچپن میں ضرور چھؤا ہوگا۔ مَس کے دو معنی ہیں، ایک مسِّ ظاہری جیسے ہم کسی بدن یا چیز کو چھُو لیں۔ دوسرے مسِّ باطنی یعنی تعلق ہونا جیسے عرفِ عام میں کہا جاتا ہے فلاں شخص کو علم سے مس تک نہیں یعنی کوئی تعلق نہیں۔ یہی معنی یہاں مراد ہیں یعنی کسی مرد سے میرا تعلق جب رہا ہی نہیں تو پھر بچّہ پیدا ہونا کیسا؟

۷ - ہمارے بعض مفسرین نے جیسے سرسیّد احمد خاں نے جو خرقِ عادت کے قائل نہیں، توریت سے یہ روایت تفسیر میں نقل کی ہے کہ حضرت مریمؑ کی منگنی یوسف نجار سے ہوئی تھی۔ چونکہ یہودیوں میں یہ قاعدہ تھا جیسا کہ ہمارے یہاں بھی ہے کہ شادی سے پہلے عورت اپنے منگیتر کے پاس نہیں سوتی تھی اس کو وہ بہت معیوب سمجھتے تھے۔ مریمؑ و یوسف شادی سے پہلے مل گئے لہٰذا حضرت عیسٰیؑ کا باپ یوسف ہؤا۔ لیکن کئی وجہ سے یہ خیال باطل ہے :

(ا) یہودی ایسا ازراہِ عداوت کہتے ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ کی عداوت میں یہ غلط روایت بنائی گئی ہے۔

(ب) خدا جناب مریمؑ کو صدّیقہ کہتا ہے۔ دو بار اُن کا اِصطِفا ہؤا ہے ان کی طہارتِ نفس کی خبر دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیسے جھوٹ بول سکتی تھیں کہ میرا تعلق کسی مرد سے نہیں رہا۔

(ج) جا بجا قرآن میں ان کو عیسٰی بن مریم کہا گیا ہے۔ باپ کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی باپ ہوتا جائز یا ناجائز

تو اس کو کیوں چھپایا جاتا۔

(۵) اگر حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کسی شیطانی عمل کے تحت ہوتی تو بعد پیدائش یہ کیوں کہتے اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ میں اللہ کا بندہ ہوں شیطان کا نہیں۔

(۵) اگر حضرت عیسیٰؑ معاذ اللہ زنا زادہ ہوتے تو خدا انہیں آغوشِ مادر میں سلام کرنے کی قوت کیوں دیتا اور ان کو اپنا رسول کیوں بناتا ان پر اپنی کتاب نازل کیوں کرتا۔ لہٰذا معلوم ہوا یہ سب افترا پردازی ہے۔ لوگوں کو بے باپ کے حضرت عیسیٰؑ کا پیدا ہونا عقل میں نہیں آتا۔ لیکن جس نے آدمؑ و حواؑ کو بے ماں باپ کے پیدا کر دیا اس کے لیے باپ کے بغیر پیدا کرنا کیا دشوار تھا۔ جو منی کے ایک قطرہ کو ترقی دے کر آدمی بنا دیتا ہے اس کے لیے کیا دشوار ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ ۚ

فرشتہ نے کہا اے مریم، خدا اس کو تمام کتب آسمانی حکمت اور توریت و انجیل کی تعلیم دے گا اور بنی اسرائیل کا رسول بنائے گا اور ان سے کہے گا میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے اپنی نبوت کی یہ نشانی لے کر آیا ہوں کہ میں مٹی سے ایک پرندہ کی صورت بناؤں گا پھر اس پر کچھ دم کروں گا پس وہ حکم خدا سے پرندہ بن کر اُڑ جائے گا اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کروں گا اور مُردوں کو بحکم خدا زندہ کر دوں گا اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ بھی بتا دوں گا بیشک ان باتوں میں تمہارے لیے میری نبوت کی بڑی نشانی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے جتنے معجزات کا دعویٰ کیا ہے ان سب میں یہ شرط لگا دی ہے کہ یہ سب میں بحکم خدا کر سکتا ہوں یعنی میرا خالق ہونا مجازی سمجھو اصلی خالق تو وہی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا اور غیب کی خبریں دینا سب خدا کے عطیات اور اس کے تفضلات ہیں۔ جناب عیسیٰؑ کے زمانہ میں جادوگروں کا بھی زور تھا اور اطبّا کا بھی۔ لہٰذا ان کو ایسے ہی معجزات دئے گئے جو

ان کے غروروں کی ناک رگڑنے والے تھے ہر موقعہ پہ آپؑ کا باذن اللہ کہنا اس لیے تھا کہ لوگ مجھے خدا سمجھ کر گمراہی میں نہ پڑ جائیں۔ باوجود اس احتیاط کے پھر بھی لوگ ان کو خدا کا بیٹا کہنے ہی لگے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع

اور توریت جو میرے سامنے موجود ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں تاکہ جو چیزیں تم پہ حرام ہیں ان میں سے بعض کو بحکم خدا تم پہ حلال کروں اور خدا کی طرف سے اپنی نبوت کی نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اس کی عبادت کرو یہی نجات کا سیدھا راستہ ہے اس کے بعد بھی جب عیسیٰ نے ان کو کفر پر اَڑے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کون ایسا ہے جو خدا کی طرف ہو کر میری مدد کرے۔ حواریوں نے کہا ہم خدا کے طرفدار ہیں ہم خدا پر ایمان لائے اور عیسیٰ سے کہا آپ گواہ رہنا کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب جو تُو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے تیرے رسول کی پیروی کی۔ پس ہمیں اپنے رسول کے گواہوں میں رکھ لے۔ یہودیوں نے عیسیٰ سے مکاری کی اور خدا نے اُن کے دفعیہ کی تدبیر کی اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے معجزات دکھا کر جب اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل کرانی چاہی تو کچھ لوگ آپؑ کے دشمن بن گئے اور آپؑ کو ستانا شروع کیا۔ آپؑ نے یہ حال دیکھ کر لوگوں سے کہا اس خدائی معاملہ میں کوئی میرا مدد کرنے والا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم آپ کی مدد کریں گے۔ حور کے معنی سفید کے ہیں چونکہ یہ لوگ دھوبی تھے اور کپڑے سے میل کچیل صاف کرتے

تھے لہٰذا حواری کہلائے۔

جب شریر لوگوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ جن کی تعداد بارہ تھی حضرت عیسٰیؑ کے تابعین میں سے بن گئے ہیں تو انہوں نے ان کو ستانے کی تدبیر کی یعنی ان کو گرفتار کر کے سولی دینا چاہا مگر اللہ کی تدبیر کے سامنے اُن کی کیا چلتی۔ یہاں مکر اللہ کے معنی یہ نہیں کہ اللہ نے مکر کیا۔ علم بدیع میں ایک صنعت کا نام مشاکلہ ہے یعنی جن الفاظ میں کوئی بات کہے انہی الفاظ میں اس کو جواب دیا جائے اور معنی اور ہوں۔ مثلاً ایک برہنہ تن آدمی آپ کے سامنے آئے اور آپ اس سے کہیں جو تم کھانا چاہتے ہو بتا دو وہی ہم تمہارے لیے پکوا دیں۔ وہ جواب میں کہے ایک کُرتا پاجامہ پکوا دیجیے یعنی مجھے دے دیجیے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

جب خدا نے کہا اے عیسٰی، میں تمہاری دنیا میں ٹھہرنے کی مدت کو پورا کرنے اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں نے جو الزام گندگی کا تم پر لگایا ہے اس سے بھی پاک رکھوں گا اور روز قیامت تک تمہارا اتباع کرنے والوں کو کافروں پر غالب رکھوں گا پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہوگی پس اُس روز تمہارے درمیان جو جھگڑے ہوتے رہے تھے ان سب کا فیصلہ کر دوں گا۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہوگا دنیا و آخرت دونوں جگہ ان کو سخت عذاب دوں گا اور پھر وہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کو پورا پورا اجر ملے گا۔ اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اے رسول یہ جو ہم تمہارے سامنے بیان کر رہے ہیں ہماری قدرت کی نشانیاں اور پُرحکمت تذکرے ہیں۔

جب یہودیوں کی عداوت حد سے بڑھی تو انہوں نے بادشاہِ وقت سے ان کو سُولی دینے کا حکم حاصل کیا اور حضرت عیسٰیؑ کو ایک مکان میں مقید کر دیا کہ صبح کو سُولی دیں گے۔ مکان کے سامنے ہی صلیب قائم کی گئی۔ حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ اس وقت دو حواری تھے ایک تو دیوار پھاند کر رات ہی میں چل دیا اور دوسرا بھی کسی حیلہ سے نکل گیا حالانکہ مرتے دم تک وفادار رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن مصیبت کے وقت ساتھ دینا بڑے جوانمردوں کا کام ہے۔ صبح کو ایک آدمی حضرت عیسٰیؑ کو پکڑ کر لانے کے لیے اس مکان میں داخل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت عیسٰیؑ کا مشابہ بنا دیا۔ جب وہ باہر نکلا تو یہودیوں نے اسی کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا۔ رات میں حضرت جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور حضرت عیسٰیؑ کو لے کر آسمان پر چلے گئے۔

یہودی بھی جھوٹے نصرانی بھی جھوٹے اور قادیانی بھی جھوٹے۔ خدا فرماتا ہے اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ، متوفی کا اصل یا مادہ وفا ہے جس کے معنی پورا کر دینے کے ہیں یعنی دنیا میں رہنے کی جو مدت تھی وہ پوری کر دی۔ جیسے یہ کہتے ہیں فلاں نے وفاء عہد کیا یعنی جو وعدہ کیا تھا پورا کیا۔ یہاں مار ڈالنے کے معنی نہیں۔ جیسا کہ سورۂ زمر میں فرماتا ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِىْ لَمْ تَمُتْ فِىْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى (اللہ جانوں کی مدت ان کی موت کے وقت پوری کر دیتا ہے اور جن کی موت نہیں آتی ان کی موت ان کی نیند میں پوری کرتا ہے پس جن کی مدت حیات پوری ہو گئی ہے انہیں تو روک لیتا ہے اور نیند والوں کو چھوڑ دیتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ توفی موت سے عام ہے یعنی نیند کے وقت تمام نفسوں کی موت ہو جاتی ہے یعنی جن کی موت آ چکی ہوتی ہے ان کو روک لیا جاتا ہے اور باقی کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ بس اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے عیسٰی میں تمہیں محفوظ کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔ رَافِعُكَ اِلَىَّ کے متعلق جنہوں نے کہا ہے وہ رفع روحانی تھا نہ کہ جسمانی تو انہوں نے غلط سمجھا ہے کیونکہ مرنے کے بعد رفع روح تو ہر مرنے والے کا ہوتا ہے۔ حضرت عیسٰیؑ پر ہی کیا موقوف ہے اور اس کو خاص طور سے بیان کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کے متعلق یہود و نصاریٰ میں سخت اختلاف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے دونوں غلط ہیں۔ یہودی کہتے ہیں ہم نے ان کو قتل کر کے سُولی پر چڑھایا تھا۔ نصاریٰ کہتے ہیں قتل نہیں کیا بلکہ سُولی دی تھی اور جب رمق جان باقی تھی تو ان کو سُولی پر سے اُتار لیا گیا تھا اور حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لانے والوں نے اُن کو قبر میں دفن کر دیا تھا تاکہ یہودیوں کو پتہ نہ چلے لیکن تیسرے روز قبر کھول کر دیکھا گیا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اس واقعہ کو دیکھنے والے ہزارہا آدمی تھے۔ یہودی بھی نصرانی بھی اور ان کے بیان میں اس قدر اختلاف، یہ دلیل ہے اس کی یہ دونوں جھوٹے ہیں۔ نہ اُن کو قتل کیا گیا نہ صلیب دی گئی بلکہ اللہ نے تو صحیح سلامت اُن کو اُٹھا لیا۔ اور جس کو قتل کیا یا صلیب دی وہ عیسٰیؑ نہ تھے بلکہ ایک دوسرا شخص تھا جس پر حضرت عیسٰیؑ کا شُبہ ہُوا تھا۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۣ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع

بے شک عیسٰی کی مثل خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے جن کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ہو جا پس وہ ہو گیا۔ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس تم شک کرنے والوں میں سے نہ بننا۔ اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم آچکا (کہ عیسٰی خدا کے بندہ ہیں) اگر یہ لوگ تم سے ان کے بارہ میں جھگڑا کریں تو ان سے کہو آؤ ہم بھی اپنے بیٹوں کو بلائیں تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم بھی اپنی عورتوں کو بلائیں تم بھی اپنی عورتوں کو بلاؤ ہم بھی اپنے نفسوں کو بلائیں تم بھی اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر خدا کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ بے شک یہ سچے قصے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر یہ لوگ رُوگردانی کریں تو بیشک اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

یہ آیت مباہلہ کے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے دعوتِ اسلام دینے کے لیے کچھ وفد بھیجے۔ ایک وفد نجران بھی گیا۔ وہاں کے عیسائیوں نے دلائل سُننے تو حضورؐ سے بحث کرنے کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہُوا چنانچہ ان کا ایک وفد جس میں چالیس آدمی تھے تین سرداروں کی ماتحتی میں جو اسقف۔ عاقب اور سید کہلاتے تھے۔ ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ میں وارد مدینہ ہُوا حضرتؐ نے اُن سے پوچھا کس ارادہ سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے مناظرہ کریں گے چنانچہ آپؐ کئی روز اُن کو سمجھاتے رہے۔ آپؐ نے فرمایا تم عیسٰیؑ کو ابن اللہ اس لیے کہتے ہو کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوتے تھے لیکن آدمؑ کو کیوں نہیں کہتے جو بے ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ خدا نے جس طرح آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا اسی طرح عیسٰیؑ کو پیدا کیا تھا۔ مگر وہ نہ مانے اور اپنی ہٹ پر جمے رہے بہر حال یہ طے پایا کہ مباہلہ کیا جائے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہر فریق یہ کہتا تھا کہ اگر میرا حریف اپنے دعوٰی میں جھوٹا ہے تو یا اللہ تُو اس پر عذاب نازل کر۔ جب مباہلہ طے پا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ باوجود علم آجانے کے اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے

کہو ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم اپنی لڑکیوں کو بلائیں تم اپنی لڑکیوں کو بلاؤ۔ ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر لعنت قرار دیں۔

مباہلہ میں جانے سے پہلے حضورؐ خانۂ امّ سلمہؓ میں تشریف لائے اور علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو اپنی یمنی چادر کے اندر لے کر فرمایا، یا اللہ یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ امّ سلمہؓ نے اس چادر میں آنے کی خواہش کی تو یہ کہہ کر ان کو روک دیا کہ تم خیر پر ضرور ہو مگر اہلبیت میں تمہارا شمول نہیں۔ معلوم ہُوا ازواج سے علیحدہ یہ ایک طبقہ تھا۔ اسی وقت جبرئیلؑ امین آیت تطہیر لے کر نازل ہوئے جس کے مصداق یہی پانچوں بزرگ تھے اور یہی وہ اہلبیت تھے جن کو اللہ نے تمام ظاہری و باطنی عیوب سے پاک رکھا ہے۔ آیہ مباہلہ کی عملی تفسیر دکھانے کے لیے حضورؐ مباہلہ کے لیے بیت الشرف سے اس طرح نکلے کہ امام حسنؑ کی اُنگلی پکڑے ہوئے تھے اور امام حسینؑ کو گود میں لیے ہوئے۔ حضرت فاطمہؑ ان کے پیچھے تھیں اور حضرت علیؑ ان کے پیچھے۔ جب نصارٰی کے پادری کی نظر ان پر پڑی تو اس نے اپنے گروہ سے کہا تم ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دُعا کریں کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دے تو وہ ضرور ہٹا دے گا۔ اگر محمدؐ کو اپنی صداقت پر پُورا یقین نہ ہوتا تو آتشِ غضبِ الٰہی میں جلوانے کے لیے کبھی اس کنبہ کو ساتھ لے کر نہ آتے۔ چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کی اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔ یہ واقعہ ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کا ہے ــــ اب اس واقعہ کے تحت میں چند باتوں پر غور کرنا ہے :

۱۔ حضرتؐ جب اپنے اہلبیتؑ کو ساتھ لے کر چلے تھے تو فرمایا تھا جب میں بد دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ اس سے ثابت ہُوا کہ جس طرح آپؐ کو اپنی بد دعا کے رَد نہ ہونے کا یقین تھا اسی طرح اپنے اہلبیتؑ کی آمین کے رَد نہ ہونے کا بھی یقین تھا۔

۲۔ جب حضورؐ بد دعا کے لیے خود ہی کافی تھے تو اپنے ساتھ ان لوگوں کو کیوں لے گئے۔ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ دکھانا مقصود تھا کہ یہ شریکِ کارِ رسالت ہیں۔ دوسرے میری رسالت کے معصوم گواہ ہیں۔ ان کی اور میری عظمت میں کوئی فرق نہیں۔ یہ میرے نُور کے ٹکڑے ہیں ہم ایک جان اور پانچ قالب ہیں۔

۳۔ میں ھدایت کا پُورا بندوبست اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں حسنؑ و حسینؑ بچوں کے لیے ہیں فاطمہ زہراؑ عورتوں کے لیے ہیں اور علیؑ جوانوں کے لیے اور میں من حیث المجموع سب کے لیے ہادی ہوں۔ گویا میرے گھر میں انسان کے ہر طبقہ کی ہدایت کا سامان ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے آیہ مباہلہ میں ان سب کو ساتھ لے جانے کا حکم دیا۔ ورنہ نصارٰی سے مقابلہ کے لیے صرف رسولؐ کافی تھے۔ بچوں اور عورتوں کا اس سے تعلق نہ تھا۔

۴۔ یہ بھی بتانا تھا کہ آیہ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ میں صادقین کے مصداق یہی ہیں۔ کیونکہ جب نصارٰی نے مباہلہ سے گریز کی تو گویا اپنے کو کاذب تسلیم کر لیا۔ اس صورت میں ان کا مدمقابل صادق قرار پایا۔

۵۔ دشمنانِ اہلبیتؑ نے ہر اُس آیت میں تاویل کی ہے جو اہلبیت علیہم السلام کی شان میں ہے، سوائے اس آیت کے کہ یہاں کوئی تاویل کرتے نہیں بنتی۔ کیونکہ عملی صورت اس کے ساتھ ہے۔

۶۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حسنین علیہما السلام فرزندانِ رسولؐ نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا یہ جانتے ہوئے کہ رسولؐ کے بیٹے نہیں ہیں بیٹوں کو شریکِ مباہلہ کرنے کا ذکر آیت میں کیوں کرتا۔

۷- اب کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ علیؑ نفسِ رسولؐ نہیں۔ اگر آیت میں اَنْفُسَنَا سے مراد خود نفسِ رسولؐ ہو تو حضورؐ اپنے ساتھ ایک ایسے شخص کو کیوں لے گئے جس کے لے جانے کا آپؐ کو حکم نہ تھا۔ اور خدا نے ٹوکا کیوں نہیں کہ میری مرضی کے خلاف علیؑ کو کیوں لے جا رہے ہو۔

۸- اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت مسلمانوں میں ان چار افراد کے سوا جو رسولؐ کے ساتھ میں تھے اور کوئی مسلمان ایسا سچا نہ تھا جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور کبھی حضورؐ کی صداقت میں ہلکا سا شک بھی نہ کیا ہو۔

۹- یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے چہروں پر صداقت کا نور اس حد تک چمکتا تھا کہ کفار بھی اسے دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ مقربانِ بارگاہِ ایزدی ہیں ان کی کوئی درخواست بارگاہِ ایزدی سے بغیر قبول ہوئے نہیں رہ سکتی۔

۱۰- یہ بھی معلوم ہوا کہ نفسِ واحد پر جمع کا اطلاق ہو سکتا جیسے علیؑ و فاطمہؑ کے لیے نِسَآءَنَا وَ اَنْفُسَنَا کا لفظ بولا گیا۔ بس اسی طرح آیہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ میں تعظیماً حضرت علیؑ کے لیے جمع کے صیغے لائے گئے ہیں۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶۴﴾ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوْرَىٰةُ وَٱلْإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعْدِهِۦٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۶۵﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ ۚ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾

اے رسولؐ تم ان سے کہو کہ اے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اللہ کے سوا ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کا شریک نہ بنائے۔ اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (کسی اور کے نہیں۔) اے اہلِ کتاب تم ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑا کرتے ہو۔ توریت و انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ تم تو ایسے احمق لوگ ہو کہ ایسی بات میں جھگڑا کرتے ہو جس کے متعلق تمہیں علم نہیں پس جس بات کا تمہیں علم ہی نہیں اس میں جھگڑا کیوں کر رہے ہو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

یہود و نصاریٰ برسوں سے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ جھگڑا کرتے چلے آ رہے تھے کہ یہودی کہتے تھے وہ یہودی تھے اور

نصاریٰ کہتے تھے وہ نصرانی تھے۔ قرآن کہتا ہے یہ کیسا بے عقلی کا جھگڑا ہے غور کرو تم یہودی بنے جب توریت نازل ہوئی اور نصرانی بنے جب انجیل نازل ہوئی اور یہ دونوں کتابیں تو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کے بہت بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر ان کا یہودی یا نصرانی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

مَا كَانَ إِبْرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿۶۷﴾ إِنَّ أَوْلَى ٱلنَّاسِ بِإِبْرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِىُّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ وَلِىُّ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۸﴾ وَدَّت طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۶۹﴾ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿۷۰﴾

ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ تو بڑے کھرے مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ ابراہیم سے زیادہ خصوصیت تو ان لوگوں کو تھی جو ان کی پیروی کرتے تھے اور اس پیغمبر اور ایمانداروں کو بھی ہے اور اللہ مومنوں کا مالک ہے۔ اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے تو بہت چاہا کہ کسی طرح تم کو راہِ راست سے بھٹکا دیں حالانکہ وہ تم کو تو کیا بھٹکاتے اپنے ہی کو بھٹکاتے ہیں لیکن اس کو سمجھتے نہیں۔ اے اہلِ کتاب تم آیاتِ الٰہی سے کیوں انکار کرتے ہو۔ حالانکہ (ان کی صداقت کے) تم خود گواہ ہو۔

اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان ایک مدت سے یہ جھگڑا چلا آ رہا تھا کہ ان میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ ابراہیمؑ ہماری جماعت کے آدمی تھے۔ قرآن ان سے کہتا ہے کہ وہ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ اللہ کے مخلص بندے تھے۔ یہ کہنا کہ وہ ہماری جماعت میں سے تھے بالکل غلط ہے کیونکہ تم جب ان کی پیروی نہیں کرتے اور تم نے اپنا مذہب ان کے مذہب سے الگ بنا لیا ہے تو پھر تم کو یہ کہنے کا حق ہی نہیں۔ ہاں ان کے سچے پیرو ہمارے نبیؐ ہیں یا وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے ہیں۔

ع ۱۵

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اے اہلِ کتاب تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو تم جان بُوجھ کر حق کو چھپاتے ہو۔ اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ایمان والوں پر جو کتاب (قرآن) نازل ہوئی ہے صبح کو تو اس پر ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو تاکہ مسلمان اس تدبیر سے اپنے دین سے پھر جائیں۔ جو تمہارے دین کے سوا کسی اور دین کا پیرو ہو اس کی بات مانو اے رسول ان سے کہہ دو کہ ہدایت تو بس وہی ہے جو خدا کرے اور یہُودی یہ بھی کہتے ہیں کہ جو یہ کہے کہ تمہارا سا دین کسی اور کو دیا گیا ہے اس کی بات بھی نہ ماننا اور یہ بھی نہ ماننا کہ خدا کے یہاں کوئی تم سے جھگڑا کرے گا۔ اے رسول تم ان سے کہدو (یہ تمہارا خیال خام ہے) فضل و کرم اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے وہ صاحبِ فضل عظیم ہے۔

بنی اسرائیل اس حسد میں مرے جاتے تھے کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل میں کیوں چلی گئی۔ اس بنا پر وہ اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ کوئی تدبیر ایسی کریں کہ مسلمان اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں آخر سب نے مل کر یہ تدبیر نکالی کہ کچھ لوگ صبح کو جا کر مسلمان ہو جائیں اور مسلمانوں سے بڑے خلوص سے ملیں جلیں لیکن جب شام ہو تو پھر یہودی بن جائیں اور اسلام سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ایسا کرنے پر مسلمان اس شبہ میں پڑ جائیں گے کہ ضرور اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اسلام لا کر پھر پلٹ گئے۔ لیکن ان کی یہ تدبیر چلی نہیں بہت جلد مسلمانوں پر ان کا یہ فریب ظاہر ہو گیا۔
یہودی یہ بھی کہتے پھرتے تھے کہ سچا دین ہمارا ہے ایسا دین تو کسی کو دیا ہی نہیں گیا جو اس کے خلاف کہے اس کی

بات مت مانو۔ خدا کے یہاں کسی دین والا ہم سے اس بارہ میں جھگڑا نہیں کر سکتا۔ توریت میں آنحضرتؐ کے متعلق جو بشارتیں دی گئی تھیں یہُودی اُن کو چھپاتے تھے بلکہ تحریف کر کے حضرتؐ کے خلاف باتیں درج کر دی تھیں۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

اور اہلِ کتاب میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس سونے کا ڈھیر رکھ دو تو جس وقت مانگو وہ تمہیں دے دیں گے اور بعض ایسے (نادہند) ہیں کہ اگر ان کی سپرد ایک دینار کر دو تو جب تک ان کے سر پر کھڑے نہ رہو تمہیں واپس نہ دیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وُہ کہتے ہیں کہ عرب کے جاہلوں کا حق مار لینے میں ہم پر کوئی الزام عاید ہی نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھُوٹ بولتے ہیں۔ ہاں جو کوئی اپنے عہد کو پُورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ متّقیوں کو دوست رکھتا ہے۔ بیشک جو لوگ اپنے عہد کو جو اللہ سے کیا ہے اور اپنی قسموں کو (جو پُورا کرنے کے لیے کھائی تھیں) تھوڑی سی قیمت میں بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ روز قیامت خدا ان سے نہ تو کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ (گناہوں کی گندگی سے) ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

اس آیت سے مسلمانوں کو یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ امانت میں خیانت نہ کیا کریں اور جو عہد قسم کھا کر کیا ہو اس کو نہ توڑیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ج وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ج وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع

ان اہلِ کتاب میں ایک گروہ ایسا بھی تو ہے جو توریت کی عبارت کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ پڑھ جاتا ہے تاکہ تم سمجھو کہ یہ عبارت کتاب کی ہے حالانکہ وہ کتاب کی نہیں ہوتی اور کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں کسی آدمی کے لیے زیبا نہیں کہ خدا تو اسے اپنی کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم اللہ والے بن جاؤ کیونکہ تم تو ہمیشہ کتابِ خدا دوسروں کو پڑھاتے رہتے ہو اور خود بھی پڑھتے رہتے ہو اور وہ تم سے یہ تو کبھی نہ کہے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بناؤ بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے کہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد تمہیں کفر کا حکم کرے

یہودی اکثر مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے رسولؐ اگرچہ بظاہر خدا کی پرستش کے دعوے دار ہیں لیکن ان کی غرض یہ ہے کہ لوگوں سے اپنی عبادت کرائیں۔ ورنہ ہم تو خدا کی عبادت پہلے ہی سے کرتے آئے ہیں۔ خدا نے اس آیت میں ان کا جواب دیا ہے کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا نبی بنائے اور اس کو علم و حکمت عطا کرے پھر وہ بجائے خدا کی عبادت کرانے کے اپنی عبادت کرانے لگے۔ تم توریت کو پڑھتے ہو اس میں یہ کہاں ہے کہ تم پیغمبروں یا فرشتوں کی عبادت کرو۔ پس ہمارا رسولؐ مسلمانوں کو ایسا حکم کیسے دے سکتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

جب خدا نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ ہم جو کچھ تم کو کتاب و حکمت دیں اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسول آئے اور جو کتاب تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ پھر خدا نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے میرے عہد کا بوجھ اٹھا لیا تو انہوں نے کہا ہم نے اقرار کر لیا۔ فرمایا اچھا تو تم آج کے قول قرار پر آپس میں ایک دوسرے کے گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ ایک گواہ ہوں۔

یہ عہد انبیاء سے عالمِ ذر میں لیا گیا تھا اس بنا پر ہر نبی کو آپؐ کی رسالت و نبوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اور آپ کی مدد یہ تھی کہ ہر نبی اپنی امت سے آپ کا تعارف کرائے اور آپؐ پر ایمان لانے کی ہدایت کرے۔ یہ میثاق آنحضرتؐ کے ختم الانبیاءؐ ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔ کیونکہ آپؐ سے کسی نبی کے متعلق کوئی میثاق نہیں لیا گیا اگر آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو آپؐ سے ضرور اس کے متعلق عہد لیا جاتا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ص لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ز وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ج وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

یادرکھو جو کوئی اس عہد سے پھر جائے گا وہ نافرمانوں میں شمار ہوگا کیا خدا کے دین کے سوا وہ کوئی اور دین تلاش کررہے ہیں حالانکہ جو لوگ آسمانوں میں ہیں (فرشتے) اور زمین میں ہیں خوشی سے یا ناخوشی سے اسکے مطیع بن چکے ہیں۔ اور اُسی کی طرف وہ پلٹ کر جائیں گے۔ اے رسول کہدو ہم تو اللہ پر ایمان لاچکے اور جو ہم پر نازل ہوا اس پر بھی اور اس پر بھی جو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور اسباط پر آیا اور اس پر بھی جو موسٰی و عیسٰی اور خدا کی طرف سے آنے والے نبیوں پر نازل ہوا ہے ہم بہ حیثیت فرستادہ خدا ہونے کے ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرماں بردار بندے ہیں اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین اختیار کرے گا تو خدا اسے قبول نہیں کرے گا اور وُہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

اسلام کے معنی گردن بطاعت نہادن کے ہیں یعنی فرماں بردار ہونا۔ آسمان و زمین میں کوئی مخلوق ایسی نہیں جو قانونِ قدرت کو قبول نہ کرے چاہے خوشی سے قبول کرے یا ناخوشی سے، قبول کرنا پڑے گا ضرور۔ دین اسلام خدا کا دین ہے جس کے تمام قوانین فطری ہیں پس جو کوئی اس کے سوا کوئی اور دین قبول کرے گا وہ لامحالہ اصولِ فطرت سے ہٹا ہوا ہوگا ایسی صورت میں خدا اُسے کیسے قبول کرسکتا ہے تمام کائنات کا خالق ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ
اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا قف فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ
اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الضَّاۗلُّوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ
اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ط اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ

اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾ ع

خدا ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت کرے گا جنہوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کرلیا اور اس کی گواہی دی کہ بیشک رسول برحق ہیں اور ان کے پاس قدرت کی نشانیاں بھی آئیں خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (یعنی اپنی توفیق ان سے سلب کرلیتا ہے) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہوتی ہے وہ جہنّم میں ہمیشہ رہیں گے اور ان پر عذاب میں کوئی کمی نہ ہوگی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ہاں جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں گے اور اپنی حالت درست کرلیں گے تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے جن لوگوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اور کفر کو بڑھاتے رہے تو ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور وہی لوگ گمراہ ہیں۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ اسی حالت میں مرگئے تو اگر وہ اپنی گلوخلاصی کے لیے اتنا سونا بھی دیں کہ زمین بھر جائے تب بھی یہ بدلہ ان سے قبول نہ کیا جائے گا۔ انہی کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾

تم ہرگز نیکی نہ پاؤ گے جب تک وُہ چیز راہِ خدا میں صرف نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو اور جو چیز تم راہِ خدا میں خرچ کرو گے اللہ اس کا جاننے والا ہے۔ تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے مگر وہ جو توریت کے نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیے تھے۔ تم یہودیوں سے کہو توریت کو لاؤ اور اگر تم سچے ہو تو اُسے ہمارے سامنے پڑھو اس کے بعد جو اللہ پر افترا پردازی کرے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ کہو اللہ نے سچ کہا ہے بس اے مسلمانو تم ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو جو باطل سے کترا کر چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔

یہودی ہمیشہ اس پر فخر کرتے تھے کہ ہم نسلِ ابراہیم علیہ السلام سے ہیں اور ہم ہی ان کے سچے پیرو ہیں۔ وہ آئے دن اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں پہ کوئی ایسا اعتراض کریں کہ ان سے جواب نہ بن پڑے۔ آخر بہت سے سوچ بچار کے بعد دو اعتراض بڑے طمطراق سے لے کر آئے۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ ملتِ ابراہیمی میں اونٹ کا گوشت حرام تھا اور اے مسلمانو تم اسے کھاتے ہو اور حلال سمجھتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء بیت المقدس کو قبلہ مانتے آئے ہیں تم نے اسے چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنا لیا، ایسی صورت میں تم ملتِ ابراہیمؑ پہ کہاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں دونوں اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل پہ سب کھانے حلال تھے۔ اونٹ کا گوشت یعقوب علیہ السلام اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ ان کو ایک ایسی بیماری تھی کہ اونٹ کا گوشت نقصان دیتا تھا۔ تم کہتے ہو توریت کا حکم یہ ہے ذرا توریت لا کر ہمارے سامنے پڑھو تو، تاکہ تمہارا جھوٹ کھل جائے۔ حضرت یعقوبؑ کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ یہ تو ایک رسمی بات ہوئی اس سے حرام ہونا کہاں ثابت ہوتا ہے۔ یہ جواب سُن کر وہ ڈھیلے پڑ گئے اور توریت لا کر سُنانے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسری بات کا جواب اگلی آیت میں یوں دیا گیا ہے :

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے۔ وہ برکت والا ہے اور تمام عالموں کے لیے ہدایت کا باعث ہے اس میں خدا کی روشن نشانیاں ہیں ان میں سے ایک مقامِ ابراہیم ہے جو شخص اس میں داخل ہو جائے اس کے لیے امان ہے اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خوشنودی خدا کے لیے خانۂ کعبہ کا حج کریں بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور جو انکار کرے تو اللہ تمام عالموں سے بے پرواہے۔

یہ جواب ہے یہودیوں کے دوسرے اعتراض کا کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر خانہ کعبہ کی طرف نماز کیوں پڑھتے ہو۔ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ بیت المقدس سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ بائیبل سے یہ ثابت ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں بنا تھا اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے درمیان آٹھ نو سو سال کا فاصلہ تھا پھر جو عمارت ابراہیمؑ نے بنائی تھی اُس سے بیت المقدس کو اولیت کیسے حاصل ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ بنایا۔ اس کا ثبوت مقامِ ابراہیمؑ سے ہے جس پر کھڑے ہو کر بنایا تھا اور اس پر حضرت ابراہیمؑ کے قدم کا نشان بھی ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر شرف حاصل ہو۔

دوسری وجۂ فضیلت یہ ہے کہ خدا نے اس کو جائے امن قرار دیا ہے جو اس میں داخل ہو گیا چاہے قاتل ہی کیوں نہ ہو جب تک وہ خود نہ نکلے کوئی جبراً اُسے باہر نہیں نکال سکتا۔

تیسرے ہر سال لوگوں کو وہاں حج کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور اس کی ابتدا زمانہ ابراہیمؑ سے ہوئی۔ یہ فضیلتیں بیت المقدس کے لیے نہیں لہٰذا تم بیکار اس پر فخر کرتے ہو کہ بیت المقدس کو خانۂ کعبہ پر شرف حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عمر بھر میں ایک بار ہر اس شخص پر حج فرض کیا ہے جو اتنا پیسہ رکھتا ہو کہ وہاں تک جا سکے اور واپس آ سکے اور راستہ بھی پُرامن ہو۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع

اے اہلِ کتاب تم آیاتِ خدا سے کیوں انکار کرتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس پر گواہ ہے۔ اے رسول کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب جو لوگ ایمان لائے ہیں تم ان کو راہِ خدا سے کیوں روکتے ہو۔ دیدہ و دانستہ کجروی کو ڈھونڈتے ہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ اے ایمان والو، اگر تم نے اہل کتاب کے کسی فرقہ کا بھی کہنا مانا تو یاد رکھو ایمان لانے کے بعد وہ تمہیں پھر کافر بنا دیں گے اور تم کیسے کافر بن جاؤ گے حالانکہ آیاتِ خدا تم پر پڑھی جاتی ہیں اور اللہ کا رسول بھی تم میں موجود ہے۔ یاد رکھو جو شخص اللہ سے وابستہ رہا وہ ضرور صراطِ مستقیم پر لگا دیا گیا۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ شاس بن قیس یہودی جو بڑا فریبی انسان اور بدگو تھا اور اسلام کی عداوت کی آگ بُری طرح اس کے دل میں بھڑک رہی تھی ایک روز اوس اور خزرج کی طرف سے جو عرب کے نامور قبیلے تھے اور مسلمان ہو گئے تھے گزرا۔ پہلے ان دونوں قبیلوں میں سخت عداوت تھی ہمیشہ آپس میں جنگ ٹھنی رہتی تھی مسلمان ہونے کے بعد دشمنی دوستی سے بدل گئی اور آپس میں پیار اور محبت سے رہنے لگے۔ شاس ملعون کو اُن کا یہ میل جول سخت ناگوار ہوا سوچا کوئی چال چل کر ان میں جنگ کرا دینی چاہیئے قبیلہ اوس کے ایک شخص کو اُس نے ورغلانا شروع کیا اور کہنے لگا تمہارا قبیلہ ہمیشہ ان بزدلوں پر غالب رہا ہے اب کیسے میل ہو گیا پھر دونوں قبیلوں کی خانہ جنگیوں کے متعلق جو قصیدے تھے پڑھنے لگا وہ اوسی جوان اس کے دامِ فریب میں پھنس گیا رفتہ رفتہ نوبت جنگ و پیکار کی آ گئی۔ اس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ جب حضرتؐ نے ان کو یہ آیت سُنائی تو وہ بہت نادم ہوئے اور پھر آپس میں مِل جُل گئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو حق ڈرنے کا ہے اور مرو تو مسلمان رہ کر مرُو اور اللہ کی رسّی کو سب مِل کر پکڑ لو اور ٹکڑیوں میں نہ بٹ جاؤ اور اللہ کی جو نعمتیں تم کو مِلی ہیں ان کو یاد کرو (وہ وقت یاد کرو) جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تمہارے دِلوں میں محبّت ڈالی پس تم خدا کی اس نعمت کی بدولت آپس میں بھائی بن گئے اور تم تو اپنے اعمال کی بدولت دوزخ کے کنارہ پر کھڑے تھے اللہ نے تم کو اُس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو نیکیوں کی طرف بُلائے۔ اچھے کاموں کا حکم دے بُرے کاموں سے روکے ایسی لوگوں کے لیے آخرت میں بہتری ہو گی اُن لوگوں جیسے مت بنو جنہوں نے آپس میں پھُوٹ ڈالی اور روشن دلیلیں آنے کے بعد بھی اختلاف سے نہ بچے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے عذابِ عظیم ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ الخ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ہم اہلبیت خدا کی وہ رسّی ہیں جس کے پکڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے (صواعق محرقہ۔ تفسیر ثعلبی)۔

إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً الخ اسلام سے پہلے قبائل عرب میں وہ بدامنی پھیلی ہوئی تھی کہ خدا کی پناہ۔ ذرا ذرا سے جھگڑے پر تلواریں نیام سے نکل آتی تھیں اور پھر وہ جنگل کی آگ کی طرح تمام قبیلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی اور اس کا سلسلہ ایک دو دن نہیں چالیس چالیس اور ساٹھ ساٹھ برس تک چلتا تھا۔ مقتول کے تمام خاندان سے نسلاً بعد نسلٍ بدلہ لیا جاتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد

حضرت رسولِ خدا کی ہدایت سے یہ آگ خدا خدا کر کے بجھی اور صدیوں کی دشمنی دوستی سے بدلی اور ان کے درمیان اخوت قائم ہوئی۔

شیطان نے کسی دین کو بغیر اختلاف کے نہیں چھوڑا۔ یہودیوں میں اکہتّر فرقے بنے۔ نصاریٰ میں بہتّر اور اسلام میں تہتّر۔ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا ہے میری اُمّت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں بہتّر ناری ہوں گے اور ایک فرقہ ناجی ہو گا۔ یہ وہی فرقہ ہے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بُلائے گا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا اور یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو معصوموں کے پیچھے چلے ہوں ورنہ غیر معصوم کی اقتدا میں صحیح راستہ سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ ﴿١٠٨﴾

اس دن کے عذاب سے ڈرو جس میں کچھ چہرے تو سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ پس جن کے منہ کو کالک لگی ہو گی ان سے کہا جائے گا تم (وہی تو ہو جو) ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے۔ لیکن جن کے چہرے سفید براق ہوں گے وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اے رسول یہ خدا کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سُناتے ہیں اور اللہ سارے جہان کے لوگوں میں سے کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

صحیح بخاری اور جمع بین الصحیحین میں ہے کہ حضرت رسولِ خدا نے فرمایا کہ قیامت میں کچھ لوگوں کو حوضِ کوثر سے ہٹا کر جہنم کی طرف لے جائیں گے میں ان کو پہچان لوں گا اور فرشتوں سے کہوں گا انہیں دوزخ کی طرف کیوں لیے جاتے ہو یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ وہ فرشتے کہیں گے آپ نہیں جانتے ان لوگوں نے آپ کے بعد آپ کے دین میں کیا کیا نئی باتیں پیدا کیں۔ جب سے آپ ان سے جُدا ہوئے یہ لوگ آپ کے دین سے اپنی ایڑیوں پر پھر گئے اور مرتد ہو گئے۔ (منقول از حاشیہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ
اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے اور تمام معاملات کی رجوع اللہ ہی کی طرف ہے تم کیسے اچھے لوگ ہو کر لوگوں کی ہدایت کے لیے پیدا کیے گئے ہو تم لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اگر اہلِ کتاب بھی اس طرح ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو ایماندار ہیں اور اکثر تو بدکار ہی ہیں یہ لوگ معمولی ایذا کے سوا تمہیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکتے اگر یہ تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے اور کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔

تمام مسلمان بہترین امت نہیں کہے جا سکتے اوّل تو ان میں ہر قسم کے بدکار لوگ موجود ہیں پھر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض کیسے انجام دے سکتے ہیں جبکہ خود ہی بدکاری سے ان کا نامۂ اعمال بھرا ہوا ہے اور جو نکوکار ہیں وہ بھی خطا و نسیان سے مبرّا نہیں۔ گناہوں سے ان کا دامن بالکل پاک نہیں۔
امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ خیر امت ہم ہیں۔ سیوطی نے بھی درمنثور میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ
وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا
يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ
اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَ
اُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

یہ اہلِ کتاب جہاں کہیں ہتّے چڑھے ان کو ذلت ہی نصیب ہوئی۔ اگر ان کو اللہ سے یا بندوں سے عہد کرنے پر کہیں پناہ مل گئی تھی پھر ہیر پھیر کے خدا کے غضب میں آ ہی گئے اور ان پر محتاجی کی مار الگ پڑی یہ سب کچھ اس سبب سے ہوا کہ وہ آیاتِ خدا سے انکار کیا کرتے تھے اور ناحق انبیائے خدا کو قتل کرتے تھے یہ سزا اس کی ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھ گئے تھے یہ لوگ بھی سب کے سب یکساں نہیں ان میں سے ایسے بھی ہیں جو دینِ خدا پر قائم ہیں اور راتوں کو آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیکیاں حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ نیک بندوں میں سے ہیں۔

یہودیوں میں سے چار پانچ آدمی ایسے بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے ان کے سردار عبداللہ بن سلام تھے یہ اللہ کے عبادت گزار بندے تھے۔ انہی کی تعریف ان آیات میں کی گئی ہے۔

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

جو کچھ وہ نیکی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جاننے والا ہے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا تو ان کو عذابِ خدا سے بچانے میں نہ ان کے مال کام آئیں گے اور نہ اُن کی اولاد، ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دنیا کے کاروبار میں خلافِ شرع جو کچھ یہ لوگ خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالے کا ٹھر ہو اور وہ ان لوگوں کے کھیت پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور پھر پالا (ساری کھیتی کو) ناس کر دے خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں اور لہو ولعب اور ناجائز کاموں میں روپیہ صرف کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مارتے ہیں۔ اگر راہِ خدا میں خرچ کرتے تو بارگاہِ باری سے ان کو ثواب بھی ملتا اور ان کے سرمایہ میں اضافہ بھی ہوتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

اے ایمان والو مومنین کے سوا غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہاری بربادی میں کوئی کمی نہ کریں گے اور جتنا تم تکلیف میں رہو گے اتنا ہی یہ خوش ہوں گے اور عداوت تو ان کے منہ سے ٹپکی پڑتی ہے اور جو بغض وحسد انکے دلوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس ظاہری حالت سے کہیں زیادہ ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو تو ہم نے تمہارے لیے کھلم کھلا آیات بیان کر دی ہیں اگر تم (ایسے سیدھے ہو کر) ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو مگر وہ ایسے نہیں (تو پھر میل کیسا)۔ جب یہ لوگ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصہ میں انگلیوں کو کاٹتے ہیں۔ تم ان سے کہو اپنے غصہ میں جل مرو۔ بے شک اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ اگر تمہیں خوشحالی چھو بھی جاتی ہے تو انہیں بُرا معلوم ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ اگر تم صبر سے کام لو اور پرہیزگار بنے رہو تو ان کا فریب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ خدا ان کے ہر ایک عمل کو گھیرے ہوئے ہے۔

کچھ ایسے مسلمان بھی تھے کہ باوجود یہودیوں کے مکر و فریب سے آگاہ ہونے کے ان میں خواہ مخواہ گھسے رہتے تھے۔ وہ ان کا راز معلوم کرنے کے لیے بظاہر ان کے دوست بنے ہوئے تھے اور کہتے تھے اجی ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہ احمق ان کے فریب میں آ کر راز کی باتیں سب اُگل دیتے تھے ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ ان سے میل جول ترک کرو۔ یہ ظاہر میں تمہارے دوست ہیں باطن

ہیں پکّے دشمن۔ ایسے لوگ جو بظاہر دوست ہوں اور بباطن دشمن۔ کُھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؕ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

اے رسول ایک وقت وہ بھی تھا جب تم مع بال بچّوں کے صبح سویرے ہی نکل کھڑے ہوئے اور مؤمنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھا رہے تھے اور اللہ سب سے زیادہ سننے والا اور جاننے والا ہے یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تم میں سے دو گروہوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ پسپائی کریں (پھر سنبھل گئے) کیونکہ اللہ تو ان کا سرپرست تھا اور اللہ پر تو ایمان والے ہی توکّل کرتے ہیں۔ بے شک اللہ نے جنگِ بدر میں تمہاری مدد کی حالانکہ تم دشمن کے مقابلہ میں بہت کم تھے (پھر بھی خدا نے فتح دی) پس تم خدا سے ڈرتے رہو تاکہ اس کے شکر گزار بنو۔ اے رسول اس وقت تم مومنین سے کہہ رہے تھے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور کفّار اپنے جوش میں ابھی تم پر چڑھ بھی آئیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار ایسے فرشتوں سے مدد کرے گا جو نشانِ جنگ لگائے ہوں گے۔

جنگِ بدر میں کفّارِ قریش کو جو شکست فاش ہوئی تھی اس نے ان کے دلوں میں ناسور ڈال دئے تھے اور مسلمانوں سے انتقام لینے کی آگ اس طرح ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی کہ کسی پہلو چین نہ تھا۔ اپنی عورتوں کو اس لیے رونے سے منع کر دیا تھا کہ رونے سے دل کی گرمی کم ہو جاتی ہے۔ اگلے ہی سال ابوسفیان پانچ ہزار جنگجو اپنے ساتھ لے کر مدینہ پر حملہ کے لیے بڑھا۔ جب حضورؐ کو خبر ہوئی

تو آپؐ ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے لیکن عبداللہ بن اُبی منافق راستہ ہی میں سے تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ اور اب کل سات سو آدمی حضورؐ کے ساتھ رہ گئے۔

جب میدانِ اُحد میں پہنچے تو آپؐ نے پہاڑ کو پس پُشت لیا اور اس درہ پر جہاں سے دشمن کے لیے کمک آنے کا اندیشہ تھا عبداللہ بن جُبیرؓ کو پچاس آدمیوں کے ساتھ معیّن کیا اور اُن سے کہہ دیا کہ چاہے پرندے تمہارا گوشت نوچ نوچ کر کھا لیں مگر تم جگہ سے نہ ہٹنا۔ لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خدا کی شان دشمن کے پیر اکھڑ گئے اور مسلمان تلواریں نیام میں رکھ کر مالِ غنیمت کو لُوٹنے میں ایسے سرغیب ہوئے کہ کسی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ درّہ کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ یار لوگ بڑے دھڑلّے سے لُوٹ رہے ہیں تو وہ کیوں اپنی جگہ جمے رہتے، درّہ چھوڑ کر لُوٹنے والوں میں شامل ہو گئے۔ درّہ کو خالی پا کر خالد بن ولید جو ایک ہزار سوار لیے گھات میں لگا کھڑا تھا فوراً درّہ پار کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور پیچھے سے ایسی مار دی کہ مسلمان حواس باختہ ہو کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ اور جیتی ہوئی لڑائی شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اگر حضرت علیؑ اپنی خداداد شجاعت سے کام نہ لیتے تو اُس روز حضرت رسولِؐ خدا کا شہید ہونا یقینی تھا۔ آپؐ کے دندان مبارک شہید ہو چکے تھے اور آپؐ زخمی ہو کر ایک پست مقام پر امدادِ خدا کے خواستگار بن بیٹھے تھے۔

بہر حال ان آیات میں مسلمانوں کی ہمّت افزائی کے لیے بتایا جا رہا ہے کہ جب تم بدر کی جنگ میں یہ دیکھ چکے تھے کہ خدا نے تمہاری مدد کی تھی اور تین ہزار فرشتوں کو تمہاری نصرت کے لیے بھیج دیا تھا اور مزید پانچ ہزار کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا تو پھر تم پر بزدلی کیوں غالب ہوئی اور میدان چھوڑ کر کیوں بھاگے۔ اس واقعہ کا بقیہ حصّہ آگے آ رہا ہے یہاں ہم صرف ملائکہ کی امداد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن میں جو ملائکہ کی مدد کا ذکر ہے سرسیّد احمد خاں صاحب نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی تفسیر انوار القرآن میں لکھا ہے کہ یہ خواب کا واقعہ ہے۔ ملائکہ کی کوئی فوج وہاں نہیں آئی تھی۔ اگر ملائکہ لڑے ہوتے تو ان کے کشتے بھی میدان میں پائے جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ صرف وہی ستر مشرکین کی لاشیں میدانِ جنگ میں تھیں جن کو مسلمانوں نے قتل کیا تھا۔ علاوہ اس کے جب صرف ایک فرشتہ ان سب کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا تو پھر تین ہزار کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

سرسیّد صاحب ایسے واقعات کو جن میں کوئی معجزانہ شان پائی جائے خواب کا واقعہ بتا کر ٹال دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ جنابِ ابراہیمؑ کے پرندوں کو زندہ کرنے اور حضرت عزیر کے زندہ ہونے کے اہم واقعات کو بھی انہوں نے خواب ہی قرار دیا ہے — مگر سیّد صاحب کی یہ رائے تمام مفسرین کی رائے کے خلاف ہے۔

آیات میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ ملائکہ شمشیر بکف ہو کر لڑے بھی تھے۔ بلکہ یہ تو مسلمانوں کی ہمّت افزائی اور اطمینانِ قلبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا گیا تھا جو کفّار کو نظر آتے تھے اور انہیں دیکھ کر اُن کی ہمّتیں پست ہو گئی تھیں اور ان کے دلوں پر ایسی کپکپی پیدا ہو گئی تھی کہ تلوار چلانی بھول گئے تھے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ صرف تین سو آدمی جن کے پاس معمولی سامانِ جنگ تھا ایک ہزار مسلح جوانوں پر جن میں عرب کے نامور نبرد آزما شامل تھے فتحیاب ہو جاتے۔

اگر یہ واقعہ خواب کا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنگِ احد کے سلسلہ میں دُہراتا نہیں۔ پھر رسولؐ خدا نے جیسے اپنی اور خوابیں

صحابہؓ سے بیان کی تھیں یہ بھی بیان فرماتے۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر خواب کی صورت میں کیا جاتا۔ جب غلط بیانی کا تعلق خدا سے نہیں ہو سکتا تو ضرور اس کی اصلیت ہے یہ کہنا کہ جہاں ایک ہی فرشتہ تمام دشمنوں کا صفایا کر سکتا تھا وہاں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلوبِ بیان ایک یہ بھی ہے کہ دشمن کو مرعوب کرنے اور اپنے ساتھیوں کا دل بڑھانے کے لیے ایسا کہا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ اپنے دشمن کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر تم نے میری سرحد میں قدم رکھا تو دس ہزار سپاہی کیل کانٹے سے لیس تمہیں کچلنے کے لیے تیار کھڑے ہوں گے اور ان کی کمک کے لیے ایک لاکھ مسلح سپاہی ان کی پس پشت ہوں گے۔ حالانکہ دشمن سے مقابلہ کے لیے صرف دس ہزار ہی بہت ہوتے۔ یہ اپنی قوت کا اظہار صرف دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے اور دوستوں کا دل بڑھانے کے لیے ہوتا ہے۔

سورۂ تحریم کی آیت ۴ میں دیکھیے کہ دو بی بیوں سے کہا جا رہا ہے اگر تم نے نبی کے خلاف شورہ پشتی کی تو اللہ اس کا مددگار ہے اور جبرئیل اور صالح المؤمنین اور اس کے بعد تمام ملائکہ اس کی پشت پر ہیں۔ دو عورتوں کا مقابلہ ایسا کون سا بڑے لشکروں کا مقابلہ تھا کہ سارے ملائکہ کا ذکر کیا گیا۔ صرف جبرئیل کافی تھے یہ صرف رسولؐ کی اعزازی شان دکھانے اور دونوں بی بیوں کو مرعوب کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

اگر ملائکہ کے لڑنے کا معاملہ ہوتا تو تعداد کی کمی یا زیادتی کا سوال پیدا ہو سکتا تھا اور جب صرف صف آرائی کی صورت تھی تو پھر یہ سوال مہمل ہے۔ کوئی آیت ایسی نہیں جس سے ثابت ہو کہ ملائکہ نے تلوار چلائی بلکہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تمہارے قلوب کے اطمینان کے لیے ایسا عمل کیا گیا تھا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اللہ نے تمہاری یہ امداد (ملائکہ سے) صرف تمہاری خوشی کے لیے کی ہے اور اس لیے کہ تمہارے دل کو ڈھارس ہو اور مدد تو ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو سب پر غالب اور حکمت والا ہے یہ مدد اس لیے کی تھی کہ کافروں کے ایک گروہ کو (قتل کرا کے) کم کر دے اور انہیں ایسا چوپٹ کر دے کہ ناکام و نامراد اپنے گھروں کو واپس ہوں۔ تمہارا اس میں کوئی اختیار نہیں چاہے ان کی توبہ قبول کرے چاہے ان کو سزا دے بے شک یہ لوگ ظالم ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دے دیتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو دونا دون (سود در سود) نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم اچھے حال میں رہو اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ بدر میں جو ملائکہ سے مدد کی گئی تھی اس کا منشا یہ تھا کہ یہ خبر سن کر کہ ملائکہ ہماری مدد کے لیے موجود ہیں مسلمانوں کے دل خوش ہو جائیں اور دلوں سے گھبراہٹ جاتی رہے اور جنگ میں کامیابی کے لیے سب سے پہلی بات لڑنے والوں کے دل کا قوی کرنا ہوتا ہے اور اس امر کی خوشخبری ملنا کہ ہمیں کامیابی ہوگی۔ ملائکہ اگرچہ تلواریں لے کر لڑے نہیں مگر ان کی صف آرائی دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔

سود کی حرمت پہلے بیان کی جا چکی ہے یہاں خصوصیت کے ساتھ سود در سود کھانے سے روکا گیا ہے کیونکہ مقروض کے تباہ و برباد کرنے میں سب سے بڑا حصہ اسی کا ہوتا ہے۔

وَسَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اے ایمان والو اپنے رب کی مغفرت کی طرف تیزی سے دوڑو اور اس جنت کو حاصل کرنے کے لیے بڑھو جس کی چوڑائی تمام آسمان و زمین ہیں اور جو متقیوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ وہ متقی جو راحت و مصیبت دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ غصّہ کو پینے والے ہیں۔ لوگوں کی خطائیں معاف کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور جب اتفاقاً کوئی بُرا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی اس سے معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ دیدہ و دانستہ اس پر ہٹ نہیں کرتے اور ان کی جزا ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے اور وُہ جنّت ہے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور عملِ صالح کرنے والوں کے لیے کیسا اچھا اجر ہے۔

وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ الخ اس آیت کے متعلق مفسّرین عامّہ و خاصّہ نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ اس آیت کے مصداق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار امام حسن علیہ السلام اشراف قوم کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ایک غلام سالن کا پیالہ لیے ہوئے آیا آپؑ کے رعب سے اس کا پاؤں تھرتھرایا اور وہ پیالہ مع سالن آپؑ کے سر اور چہرہ مبارک پر گر گیا۔ حضرتؑ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کانپنے لگا اور دفعتاً اس کی زبان سے نکلا الکاظمین الغیظ یعنی آپ غصّہ کو روکنے والے ہیں۔ فرمایا میں نے اپنا غصّہ ختم کیا۔ اس نے فوراً کہا وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ (آپ لوگوں کا گناہ بخشنے والے ہیں) فرمایا، میں نے معاف کیا اس نے کہا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔ (اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔ فرمایا، جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ بعض لوگوں نے یہ واقعہ امام حسینؑ کے متعلق لکھا ہے اور بعض نے امام زین العابدینؑ کے متعلق، بہرحال ہے اسی گھر کا واقعہ۔

آخری آیات کے متعلق ابن مسعودؓ سے یہ روایت ہے کہ ایک بار اصحابِ رسولؐ باہم یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ بنی اسرائیل ہم سے افضل تھے کیونکہ جب وہ گناہ کرتے تھے تو ان کے دروازہ پر لکھ دیا جاتا تھا اور اپنے ناک کان کا کفارہ دے کر گناہ سے پاک ہو جاتے تھے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارا گناہ بخشا گیا یا نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ تم بنی اسرائیل سے افضل ہو۔ کیونکہ توبہ کرنے کے بعد تمہارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔ خدا کی یہ خاص رحمت تم پر ہے کہ توبہ کے بعد گناہ بخش دیتا ہے بشرطیکہ تم صدقِ دل سے توبہ کرو اور اس کے بعد گناہ کرنے کا خیال چھوڑ دو۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَيَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۴۰﴾ ۙ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَيَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۱﴾

تم سے پہلے بھی بہت سے واقعات گزر چکے ہیں پس روئے زمین پر سیر کرو اور غور سے دیکھو کہ آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ یہ لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور نصیحت ہے متقی بندوں کے لیے۔ اے مسلمانو سستی اور کاہلی کو اپنے میں راہ نہ دو اور (اُحد کی اتفاقی شکست سے) رنجیدہ نہ ہو اگر تم مومن ہو تو آئندہ تم ہی غالب رہو گے اگر تمہیں شکست کا زخم لگا ہے تو ایسا ہی زخم (بدر میں) تمہارے مخالفوں کو بھی لگ چکا ہے یہ تو اتفاقاتِ زمانہ ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان اُلٹ پھیر کیا کرتے ہیں اور اس لیے تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان والے ہیں اور تم میں سے بعض کو درجہ شہادت عطا فرمائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور اس شکست سے یہ بھی مقصود تھا کہ ثابت قدم رہنے والے سچے مسلمانوں کو الگ کر دے ان لوگوں سے جو بھاگنے والے اور ثابت قدم رہنے والے نہ تھے۔

سوائے چند کے جنگِ اُحد میں سب ہی تو رسولؐ کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس جنگ میں وہ نمایاں خدمتِ اسلام کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپؑ لڑتے مارتے دشمنوں کو دُور تک بھگاتے بھی اور پھر ڈھال میں بھر کر پانی بھی لاتے اور جناب سیّدہؑ کے ساتھ رسولِؐ خدا کے زخموں کو دُھلاتے بھی تھے۔ یہ کام میدانِ جنگ میں جیسے مشکل ہوتے ہیں یہ لڑنے والے ہی جانتے ہیں۔ جب ہی تو جبرئیلؑ نے نازل ہو کر کہا تھا یا رسولؐ اللہ، یہ ہے سچی مواسات و ہمدردی۔ فرمایا کیوں نہ ہو علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ جبرئیلؑ نے کہا اور میں آپ دونوں سے ہوں۔
جب رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے یہ سوال کیا۔ یا علی جس طرح مجھے چھوڑ کر سب بھاگ گئے تھے تم کیوں نہ بھاگے ؟

فرمایا اَاَکْفُرُ بَعْدَ الْاِیْمَان (کیا میں ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا)۔ اس سے ثابت ہوا کہ علیؑ کے نزدیک اس روز میدانِ جنگ سے بھاگنا کفر تھا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ ع

ع ۱۴ ۵

اے مسلمانو، کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ تم سب کے سب جنّت میں داخل ہو جاؤ گے کیا اب تک خدا نے ان لوگوں کو بھی نہیں پہچانا جنہوں نے تم میں سے راہِ خدا میں جہاد کیا اور ان لوگوں کو بھی نہیں پہچانا جو جہاد میں ثابت قدم نہ رہے۔ لڑائی سے پہلے تو تم (اسلام کے فدائی بن کر) موت کی آرزو کیا کرتے تھے پس تم نے اس کو دیکھ لیا اور اب بھی دیکھ رہے ہو (پس وہ تمہاری شیخیاں کہاں گئیں)۔

جنگِ بدر میں جو مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو مسلمانوں کی ہمّت کچھ بڑھ گئی اور اسلام کی صداقت کا نقش ان کے دلوں میں اتنا اجاگر ہوا کہ راہِ خدا میں مرنے کی تمنّا کرنے لگے لیکن جب اُحد کا معرکہ سامنے آیا اور تین ہزار مشرکوں کا مقابلہ سات سو مسلمانوں سے آپڑا تو پہلے تو جم کر لڑے لیکن جب پسِ پشت سے آکر خالد نے حملہ کیا اور شیطان نے بہ آوازِ بلند کہا قُتِلَ مُحَمَّدٌ تو سب کے پیر اکھڑ گئے اور جسے جدھر جانے کا موقع ملا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا۔ اس وقت ایک حضرت علیؑ تھے کہ جن کی بے نظیر شجاعت نے رسولؐ کی جان بچائی۔ تین مرتبہ گھوڑے سے گرے اور ہر مرتبہ جبرئیلؑ نے سوار کیا۔ اس کا ذکر خدا نے ان آیات میں کیا ہے کہ اس روز پتہ چل گیا کہ کون ثابت قدم رہنے والا تھا اور کون بھاگ جانے والا۔ کس کو اپنی جان پیاری تھی اور کس کو رسولؐ کی جان پیاری تھی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

نہیں ہیں محمدؐ مگر ایک رسول یقیناً ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں پس اگر وہ مر جاتے یا قتل کر دئیے جاتے تو تم کیا اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو شخص پھر جائے گا تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اللہ تو شکر کرنے والوں ہی کو اچھا بدلہ دے گا۔

جب میدانِ اُحد میں یہ آواز بلند ہوئی کہ قَدْ قُتِلَ مُحَمَّدٌ (محمدؐ قتل کر دئیے گئے) تو بعض لوگوں نے دل میں کہا اور بعض نے آپس میں تذکرہ کیا کہ بس اسلام تو آج ختم ہو گیا اب ہم کو اپنے سابق دین کی طرف پلٹ جانا چاہیئے۔ خدا ان سے فرماتا ہے کہ محمدؐ اسی طرح ہمارے رسول تھے جیسے پہلے ہو چکے ہیں تو کیا ان رسولوں کے مرنے یا قتل ہونے سے خدا کا دین ختم ہو گیا تھا جو اب ختم ہو جائے گا۔ تمہارے پلٹ جانے سے اللہ کا کیا نقصان ہے اس کا دین تو ہر حالت میں قائم رہے گا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ج وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

بغیر حکم خدا کے کوئی شخص نہیں مرتا۔ وقتِ معیّن تک ہر ایک کی موت لکھی ہوئی ہے جو شخص اپنے عمل کا بدلہ دُنیا میں چاہتا ہے تو ہم دُنیا میں ہی دے دیتے ہیں اور جو آخرت میں بدلہ چاہتا ہے اُسے آخرت میں دیتے ہیں اور شکر کرنے والوں کو ہم بہت جلد اس کا بدلہ دیں گے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

اے مسلمانو جہاد کی مصیبت کچھ تم ہی پر نہیں آئی بلکہ ایسے بہت سے پیغمبر گزرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا ہے پس اُنہوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ کمزوری دکھائی۔ اور اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے اس کے سوا ان کا کہنا کچھ نہ تھا اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ بخش دے اور ہم نے اپنے معاملات میں جو زیادتیاں کی ہیں وہ بھی بخش دے اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

بہت سے کمزور ایمان والے مسلمان جب جہاد پر چلنے کا حکم ملتا تھا تو آپس میں مل کر کہتے تھے۔ اس رات دن کی کمربندی سے ہم تو اکتا گئے ہیں۔ چین سے گھروں میں بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ صورت جو جہاد کی پیش آرہی ہے آنحضرتؐ کے دورِ نبوت میں دیکھی جا رہی ہے اس سے پہلے جو انبیاء گزرے ان کے ساتھ رہنے والوں کے لیے تو یہ جان جوکھوں نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے غلط خیال کی تردید میں فرما رہا ہے کہ تم ہی وہ لوگ اکیلے نہیں ہو جو اپنے نبی کے ساتھ جاکر لڑتے ہو بلکہ بہت سے انبیاء ایسے ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ بہت سے خدا پرستوں نے قتال کیا۔ انہوں نے کافروں کو قتل بھی کیا اور قتل بھی ہوئے۔

لیکن ایسے بھی مسلمان تھے جو لڑنے سے ذرا نہ ڈرتے تھے۔ بلکہ جہاد کے مشتاق رہتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: تین چیزیں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں الاکرام بالضیف۔ والصوم فی الصیف۔ والجہادُ بالسیف۔ یعنی مہمان کا اکرام کرنا۔ گرمیوں میں روزہ رکھنا اور تلوار سے جہاد کرنا۔

جو خالص مومن ہیں وہ دُعا کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار، ہمارے گناہ بخش دے اور جو زیادتیاں ہم نے کیں اُن سے درگزر فرما اور کافروں کے مقابل ہماری مدد فرما۔

اللہ ایسے صابروں کو دوست رکھتا ہے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

پس ایسے کامل مومنوں کو اللہ نے دُنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں تو بہت ہی اچھا بدلہ دے گا اور اللہ تو احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اے ایمان والو اگر تم کافروں کی اطاعت کرو گے تو وُہ تم کو اُلٹے پاؤں کفر کی طرف پھیر کر لے جائیں گے اور پھر تم گھاٹے میں پڑے رہ جاؤ گے (نہ اِدھر کے رہو گے نہ اُدھر کے)۔ تم گھبراتے کیوں ہو اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وُہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ہم ان کافروں کے دلوں پر تمہارا رعب ڈال دیں گے۔ جو ایسے بُت کو پُوجتے ہیں جس کو خدا نے کوئی قوت نہیں دی۔ ان مشرکوں کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور ظالموں کے لیے وہ بہت بُری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ جب جنگِ اُحد سے ابوسفیان ناکام واپس ہوا تو راستہ میں اُسے خیال آیا کہ ہم نے بہت بُرا کیا کہ وہاں سے چلے آئے۔ اس وقت مسلمان تتر بتر بھی تھے اور زخمی بھی تھے۔ ان کے رسول بھی زخمی تھے۔ چلو ہم پلٹ چلیں اور دل کھول کر مسلمانوں کو قتل کریں لیکن حضرت علیؑ نے جس بُری طرح اُن کو کاٹا تھا اور ان کا صفایا کیا تھا اس کا منظر ابوسفیان کے ساتھیوں کی نظر میں تھا انہوں نے کہا بس جو کٹ چکے انہی پر بس کرو۔ پھر کر جاؤ گے تو جو زندہ ہیں ان سے بھی ہاتھ دھو گے مسلمان چاہے کتنے ہی تباہ حال ہوں لیکن جب تک علیؑ اُن کے ساتھ ہیں تم اُن پر فتح نہیں پا سکتے۔ بات کچھ ایسی تھی کہ ابوسفیان کا کلیجہ بھی دھک دھک کرنے لگا اور کچھ ایسا رعب اس پر چھایا کہ پیچھے پلٹنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس آیت میں اُسی کا بیان ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ج حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ط مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ج ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ج وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ط وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

اللہ نے جنگِ اُحد میں بھی اپنا وعدہ (فتح) سچ کر دکھایا جب تم پہلے حملہ میں اللہ کے حکم سے اُن کو قتل کر رہے تھے (مالِ غنیمت کے لالچ میں) پھر تم پر بزدلی غالب آگئی اور مورچہ کے معاملہ میں تم آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور اس کے بعد کہ خدا نے تمہیں وہ چیز دکھا دی (فتح) جسے تم دوست رکھتے تھے تم نے نافرمانی کی۔ تم میں کچھ ایسے لوگ تھے جو دُنیا کا فائدہ چاہتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو آخرت کا فائدہ چاہتے تھے۔ (اور انہوں نے اپنی جان فدا کر دی) اس پر بھی تمہارے بزدلے پن نے تم کو کفار کی طرف سے پھیر دیا یعنی بھاگ پڑے۔ اس سے خدا کو تمہارا امتحان لینا منظور تھا۔ اللہ نے پھر بھی تم کو معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔

جنگِ اُحد کے سلسلہ میں منافقوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب خدا نے فتح کا وعدہ کر لیا تھا تو پھر ہمیں شکست کیوں ہوئی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ پہلے حملہ میں فتح تو تمہارے سامنے آگئی تھی۔ تم کفار کو قتل کرتے جا رہے تھے۔ لیکن فتح کو شکست کی صورت میں تو تم نے خود بدلا۔ جب مالِ غنیمت کے لالچ میں تم درّہ چھوڑ کر لوٹ مار کے لیے دوڑ پڑے۔ تمہارے سردار عبداللہ بن جبیرؓ نے ہر چند تمہیں روکا مگر تم نہ مانے۔ چند آدمی عبداللہؓ کے ساتھ رہ گئے اور وہ سب شہید کر دئے گئے۔ باوجودیکہ یہ تمہاری نافرمانی سخت سزا کے قابل تھی مگر ہم نے پھر بھی تمہیں معاف کر دیا۔ اس پر بھی تم اُلٹا الزام ہم پر لگاتے ہو۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ط وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ لا وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ط يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَىْءٍ ط قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ط يُخْفُوْنَ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ط يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ط قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ج وَلِيَبْتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

(اور وہ وقت یاد کر کے شرماؤ) جب تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور رسول تمہارے پیچھے کھڑے پکار رہے تھے مگر تم جان کے خوف سے مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے (چونکہ تم نے رسول کو آزردہ کیا تھا) لہٰذا خدا نے بھی تم کو شکست کا صدمہ پہنچایا (یہ سبق دینے کے لیے) کہ جب تمہاری کوئی چیز جاتی رہے یا کوئی مصیبت تم پر آ پڑے تو صبر کرنا سیکھو اور اللہ تو جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے۔ اس غم کے بعد اللہ نے تمہارے اُوپر اطمینانی حالت طاری کی کہ تم میں سے ایک گروہ کو (جو سچے ایماندار تھے) گہری نیند آگئی اور دُوسرے گروہ کے لوگ جن کو اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی، اللہ کے حق میں ناحق جاہلیت کی سی بدگمانی کرنے لگے، کہنے لگے کیا اس معاملہ میں ہمارے لیے بھی کچھ اختیار ہے۔ اے رسول، ان سے کہہ دو کہ ہر معاملہ میں پُورا اختیار خدا ہی کا ہے۔ وُہ اپنے دلوں میں وہ چیزیں چھُپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اگر اس معاملہ میں ہمارا اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔ اے رسول تم ان سے کہو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن جن کے مقدر میں مرنا تھا وہ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اپنے مرنے کی جگہ ضرور آ جاتے

اور یہ اس واسطے کیا گیا تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خدا اس کا امتحان کر لے (اور لوگ دیکھ لیں) اور اس لیے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے صاف کر دے اور اللہ تو دلوں کی باتیں خوب جانتا ہے۔

جنگ اُحد کا حال

جنگِ اُحد میں سب سے نمایاں کام حضرت علیؑ نے کیا۔ مشرکین میں چوٹی کے جنگجو اور زبردآزما طلحہ بن ابی طلحہ اور ابو سعید بن ابو طلحہ جو علمدار لشکر بھی تھے اور ان دونوں پہ کفار کو بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمان ان سے مرعوب بھی تھے۔ سب سے پہلے ان کا حضرت علیؑ سے مقابلہ ہوا۔ آپؑ نے بہت جلد ان دونوں کو واصلِ جہنم کیا۔ اس کے بعد نو آدمی اور علمدار بنائے گئے۔ یہ سب بھی ذوالفقارِ حیدرِ کرار کا لقمہ بنے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس جنگ میں اتنے مشرکوں کو قتل کیا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اس جنگ میں حضرت حمزہؓ ایک حبشی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے آپؓ کا سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکالا اور اُسے دانتوں سے چاب کر نگلنا چاہا مگر نگل نہ سکی۔ اسی جنگ میں جب حضرت علیؑ مشرکوں کے سروں کا مینہ برسا رہے تھے مابین زمین و آسمان یہ آواز بلند ہوئی: لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ وَلَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَار۔

ابتداءً جنگ کی صورت بہت اچھی تھی۔ مسلمان مجاہد خوب جم کر لڑ رہے تھے۔ دشمن ہر طرف بھاگ رہے تھے کہ یکا یک پانسہ پلٹ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ مسلمان لوٹ مار میں پڑ گئے۔ اُدھر درّہ پر عبداللہ بن جبیرؓ کی ماتحتی میں جو پچاس آدمی بحفاظت کے لیے متعین کیے گئے تھے وہ یہ دیکھ کر کہ دشمن کا مال لُٹ رہا ہے لوٹ میں شریک ہونے کے لیے درّہ چھوڑ بیٹھے۔ عبداللہؓ نے ہر چند روکنا چاہا مگر نہ رُکے۔ چند آدمی جو عبداللہ کے ساتھ رہ گئے وہ کیا حفاظت کرتے۔ خالد بن ولید جو گھات میں تھا فوراً ایک ہزار فوج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا مسلمانوں پر آپڑا اور وہ مار پڑی کہ حواس باختہ ہو کر ہر طرف بھاگنا شروع ہو گئے۔ بعض پہاڑیوں پر جا چڑھے بعض ایسے لمبے گئے کہ تین دن بعد واپس آئے۔ رسولِ خداؐ ان کا نام لے لے کر پکار رہے تھے۔ اے تم کہاں مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو مگر جان بڑی پیاری چیز ہے اس آواز کو کون سنتا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر حضرت علیؑ اور چند اور مجاہد اس وقت اپنی جانوں پر نہ کھیل گئے ہوتے تو دشمن حضورؐ کو بے شہید کیے نہ چھوڑتے۔

جب بھاگے ہوئے لوگ مدینہ پہنچے تو منافقوں نے طعن آمیز باتیں کرنا شروع کیں اور ہنس ہنس کر کہنے لگے ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ باہر نکل کر لڑنا اچھا نہیں ہو گا یہیں مدینہ میں ڈٹے رہو اپنے گھروں کی حفاظت کرو اگر دشمن آئے تو یہیں اس کا مقابلہ کرو۔ مگر رسول اللہؐ نے ہماری بات نہ مانی اور بے شمار لوگوں کو قتل کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی انہی احمقانہ باتوں کا جواب ان آیتوں میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا تمہاری بزدلی اور نا اہلی سے ہوا رسول کا اس میں کوئی قصور نہیں فتح و شکست سب اللہ کے ہاتھ ہے۔ تم رسول کی بات مانتے اور میدان چھوڑ کر نہ بھاگتے تو اس روزِ بد کا منہ نہ دیکھتے۔ اگر تم گھروں میں بھی بیٹھے رہتے تو جن کے مقدر میں مرنا لکھا تھا وہ ضرور گھروں سے نکل کر وہیں پہنچ جاتے جہاں انہیں مرنا تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِیَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

ع ۱۶

بے شک جو لوگ تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے تھے جب دو جماعتیں آپس میں گتھ گئی تھیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ شیطان نے ان کے بعض افعال کی وجہ سے ان کے قدم ڈگمگا دئے تھے۔ خدا نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ بے شک اللہ غفور و حلیم ہے۔ اے ایمان والو تم ان لوگوں جیسے مت بنو جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اپنے ان بھائیوں کے متعلق جنہوں نے سفر کیا یا مجاہد بنے کہنے لگے اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے نہ قتل کیے جاتے اور یہ اس لیے کہتے تھے تاکہ خدا اس خیال کو ان کے دلوں میں حسرت بنا دے اور یوں تو خدا ہی جلاتا اور مارتا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا دیکھنے والا ہے اور اگر تم راہِ خدا میں قتل کیے جاؤ یا مر جاؤ اللہ کی بخشش اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہو اگر تم ویسے ہی مر جاؤ یا قتل کیے جاؤ تب بھی ایک دن اللہ کی طرف اُٹھائے جاؤ گے۔

منافق نہ تو جہاد میں خود جاتے تھے نہ دوسروں کو جانے دیتے تھے۔ جب جہاد کے لیے حضورؐ جانے لگے تو یہ منافق مختلف قسم کے حیلے حوالے کرتے کبھی کہتے ہمارے گھر خالی ہیں کبھی کہتے ہمارے باغوں میں فصلیں تیار ہیں کبھی کہتے شہر کے اندر جنگ کیجئے تو ہم لڑیں گے باہر نہیں اور جو لوگ شریکِ جہاد ہوتے اور شہید ہو جاتے تو واپسی پہ لوگوں سے کہتے اگر ہمارے کہنے پر عمل کرتے اور رسول کے کہنے میں آکر نہ نکل کھڑے ہوتے تو نہ مرتے نہ قتل ہوتے۔ گویا ان کے

نزدیک گھر میں رہنے والوں کو موت نہیں آتی۔ خدا ان کو بتا رہا ہے کہ موت تو گھر میں بیٹھنے والوں کو بھی آئے گی مگر جہاد میں مرنے والوں پر جو خدا کی رحمت اور بخشش ہوگی وہ اپنے بستر پر مرنے والوں کے لیے کہاں۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ج وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اے رسول یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم جیسا نرم دل رسول ان کو ملا اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمہارے پاس سے بھاگ جاتے پس ان کی خطاؤں سے درگزر کرو اور ان کے لیے استغفار کرو اور حسب دستور (کام کاج میں) ان سے مشورہ کر لیا کرو لیکن جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے جب اللہ تمہارا مددگار ہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں ذلیل کر دے تو اس کے بعد تمہاری مدد کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور مومنین کو چاہیئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہر کام میں انسان ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور تدبیر سے کام لینا چھوڑ دے۔ یہ تو انتہائی خطرناک اور اخلاقی جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظاہری اور باطنی قوتیں اس لیے دی ہیں کہ انسان ان سے کام لے اور معطل ہو کر نہ بیٹھ جائے۔ کوشش کرنا انسان کا فرض ہے نتیجہ جو کچھ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام جو سب سے زیادہ خدا پر توکل کرنے والے تھے کوئی کام ہی نہ کرتے۔ توکل کے تو یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی سی تدبیر تو کرتا رہے اور اس میں کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ کرے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے حکمران کو نرم دل اور خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہونا چاہیئے۔ بدمزاج اور کھُرّی طبیعت کا نہ ہو کہ بات بات پر انہیں مارنے کو تیار ہو جائے اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ط وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا تو روز قیامت وہی چیز بعینہٖ خدا کے سامنے لانا ہوگی پھر ہر شخص اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہ کیا جائے گا۔ بھلا وہ شخص جو خدا کی مرضی کا پابند ہو گیا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں گرفتار ہو اور جس کا ٹھکانہ جہنم ہو اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔ وہ لوگ خدا کے یہاں مختلف درجوں میں ہوں گے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ ان کا دیکھنے والا ہے۔ مومنین پر خدا کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان پر آیاتِ خدا کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفسوں کو پاک صاف بناتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

تفسیر صافی میں ہے کہ کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے کیونکہ خیانت امرِ نبوت کے منافی ہے تفسیر قمی میں ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو مالِ غنیمت بدر کے دن آیا تھا اس میں ایک سرخ رنگ کا سربند کم تھا۔ اصحاب رسول میں سے ایک صاحب نے کہا یہ سوائے رسول اللہ کے اور کسی نے نہیں لیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ بعد میں اطلاع ملی کہ فلاں شخص نے چرایا ہے اور فلاں جگہ دبا دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے جب اس جگہ کو کھدوایا تو وہ برآمد ہو گیا۔ عہدِ رسالت میں ایسے لوگ بھی مسلمان کہلاتے تھے اور زمرۂ صحابہ میں داخل تھے۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ
أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ
اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ
يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ج

جب جنگِ اُحد میں تم پر وُہ مصیبت پڑی جس کی دوگنی تم کفار پر ڈال چکے تھے تو گھبرا کر کہنے لگے یہ آفت کہاں سے آگئی۔ اے رسول کہہ دو کہ یہ خود تمہاری ہی طرف سے ہے (نہ رسول کی مخالفت کرتے نہ یہ سزا ملتی) بیشک خدا ہر شے پر قادر ہے اور جس دن جنگِ اُحد میں دونوں جماعتیں لڑ پڑی تھیں تو جو مصیبت تم پر پڑی وہ آئی تو خدا کے اِذن سے مگر اس کا سبب تمہاری شرارت تھی تاکہ خدا دیکھ لے کہ سچے ایمان والے کون ہیں اور ان لوگوں کو بھی جان لے جو منافق ہیں منافقوں سے جب کہا گیا کہ آؤ خدا کی راہ میں جہاد کرو اور اپنے دشمن کو ہٹا دو تو کہنے لگے اگر ہم لڑنا جانتے ہوتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ یہ لوگ اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب تھے۔

مِثْلَيْهَا۔ دونی اس لیے کہا کہ جنگِ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے اور جنگِ بدر میں ستر کفار قتل

اور یہ جو کہا گیا کہ یہ سب مصیبت تمہارے کرتوتوں سے تم پر آئی تو مطلب یہ ہے کہ اگر تم رسُول کی مخالفت نہ کرتے اور اپنے مقام پر جمے رہتے۔ لوٹ مار کے چکر میں نہ پھنس جاتے تو ہرگز شکست کا منہ دیکھنا نہ پڑتا۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا
لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن
كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ
رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾

وہ منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے گھروں میں مزہ سے بیٹھے رہے اور اپنے شہید بھائیوں کے بارہ میں کہنے لگے اگر ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ اے رسول ان سے کہو اگر تم سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال تو دو۔ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے اُن کو مُردہ نہ سمجھنا وہ تو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں سے طرح طرح کی روزی پاتے ہیں۔

منافقین ضرور جانتے تھے کہ اُحد میں جنگ ضرور ہوگی کیونکہ بدر کی شکست کا بدلہ لینے پر مشرکین تلے بیٹھے تھے۔ مگر یہ منافق زبان سے کہتے تھے کہ لڑائی وڑائی کچھ نہ ہوگی بیکار جاتا ہے۔ چنانچہ تین سو منافق راستہ ہی میں سے واپس آگئے تھے۔ جب جنگِ اُحد میں کچھ لوگ مارے گئے تو ان کے عزیزوں سے کہنے لگے ہم تو کہتے تھے کہ نہ جاؤ مگر وہ مانتے ہی نہیں نتیجہ یہ ہُوا کہ قتل ہو گئے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ان شہیدانِ راہِ خدا کو مردہ مت سمجھو یہ تو زندہ ہیں اللہ کے یہاں سے رزقِ روحانی ان کو مِل رہا ہے۔ تمہارا ان کا کیا مقابلہ۔

شہیدوں کے بہت سے درجات ہیں۔ اور انہی کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ سب سے اُونچا درجہ معصوم شہید کا ہے دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو میدانِ جنگ میں شہید ہوئے تیسرا درجہ ان کا ہے جو میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر اپنے بستر پر مرے چوتھا درجہ ان لوگوں کا ہے جو تبلیغ اسلام کی وجہ سے قتل ہوئے پانچواں درجہ ان لوگوں کا ہے جو حدودِ سلطنتِ اسلامی کی حفاظت میں مرے۔ چھٹا درجہ ان کا ہے جن کو دشمنانِ اسلام نے مسلمان سمجھ کر قتل کر دیا۔

میدانِ جنگ میں جو لوگ شہید ہوتے تھے ان کو انہی خون آلود کپڑوں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ یہی ان کا کفن ہوتا تھا۔ رسولِ اکرم کے ساتھ جہاد میں شہید ہونے والے خاص اعزاز کے مالک ہوتے تھے۔ ان کی مقدس لاشوں پر مخلوقاتِ ارضی میں سے کسی کا تسلط نہیں ہوتا وہ بدستور اپنے مرقد میں رہتی ہیں۔

فرحين بما آتاهم الله من فضله ويستبشرون بالذين لم يلحقوا بهم من خلفهم ألا خوف عليهم ولا هم يحزنون ﴿۱۷۰﴾ يستبشرون بنعمة من الله وفضل وأن الله لا يضيع أجر المؤمنين ﴿۱۷۱﴾ الذين استجابوا لله والرسول من بعد ما أصابهم القرح للذين أحسنوا منهم واتقوا أجر عظيم ﴿۱۷۲﴾ الذين قال لهم الناس إن الناس قد جمعوا لكم فاخشوهم فزادهم إيمانا وقالوا حسبنا الله ونعم الوكيل ﴿۱۷۳﴾ فانقلبوا بنعمة من الله وفضل لم يمسسهم سوء واتبعوا رضوان الله والله ذو فضل عظيم ﴿۱۷۴﴾ إنما ذلكم الشيطان يخوف أولياءه فلا تخافوهم وخافون إن كنتم مؤمنين ﴿۱۷۵﴾

راہِ خدا میں شہید ہونے والے جو زندہ ہیں ان کو خدا نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو لوگ ان سے پیچھے رہ گئے ہیں اور ان سے آکر نہیں ملے ان کے متعلق اس خیال سے خوشیاں مناتے ہیں کہ وہ بھی شہید ہو کر ان سے جاملیں ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ وہ رنجیدہ ہوں گے اور وہ خوش ہیں اللہ کی دی ہوئی نعمت پر اور اس کے فضل وکرم پر اور اس پر کہ اللہ مومنین کے ثواب کو ضائع نہیں کرتا۔ جنگِ احد میں جن لوگوں نے زخمی ہونے کے بعد بھی خدا اور رسولؐ کا کہنا مانا اور جن لوگوں نے نیکی کی اور پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے بہت بڑا ثواب ہے یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے کہا گیا کہ دشمنوں نے تم سے لڑنے کے لیے بڑا لشکر جمع کیا ہے اُن سے ڈرتے رہو تو بجائے خوف کے ان کا ایمان اور زیادہ ہوگیا اور کہنے لگے اللہ کی مدد ہمارے لیے کافی ہے وہ سب سے اچھا کارساز ہے (پھر وہ گئے اور جب لڑائی نہ ہوئی تو) خدا کی نعمت اور فضل کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آئے ان کو کوئی بُرائی چھو بھی نہ گئی۔ وہ اللہ کی خوشنودی کے پابند رہے اور اللہ بڑا افضل وکرم والا ہے۔ بے شک شیطان اپنے دوستوں کو ایسے خوف دلایا ہی کرتا ہے پس تم اس سے ڈرو نہیں اگر تم مومن ہو تو مجھ سے ڈرو۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ جنگِ اُحد کے بعد جب حضورؐ واپس ہونے لگے تو جبرئیل امینؑ نے آکر کہا کہ حکمِ خدا ہے کہ آپ ابوسفیان کے پیچھے جائیں اور اپنے ساتھ انہی لوگوں کو لیجیے جو زخمی ہیں (تاکہ وہ دل کھول کر ان سے بدلہ لیں) چنانچہ آپ اپنے زخمی اصحابؓ کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے اور مقام حمراء الاسد میں جاکر ٹھہرے۔ کفار مقام روحا میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کا ارادہ تھا کہ پلٹ کر جائیں اور مدینہ میں مسلمانوں کو تہ تیغ کریں۔ ابوسعید خزاعی نے حضرتؐ سے عرض کیا کہ ان زخمیوں کو زیادہ تکلیف میں ڈالنا مجھے گوارا نہیں میں ایک چال چلتا ہوں تاکہ دشمن گھبرا جائے چنانچہ وہ ابوسفیان سے ملے اور کہا، کیا مدینہ کا ارادہ کر رہا ہے کچھ خبر بھی ہے، حضرتؐ ایک جرار لشکر ساتھ لیے پھر تجھ سے لڑنے کے لیے چلے آرہے ہیں۔ یہ سُن کر وہ خوفزدہ ہو کر مکہ کو بھاگا مگر چلتے چلاتے ایک چال چل گیا، نعیم ابن مسعود اشجعی کو جو مدینہ آرہا تھا اپنے پاس بُلا کر کہا اگر تو محمدؐ کے لشکر میں جاکر یہ خبر اُڑا دے کہ کفار قریش کے ساتھ ایک بہت بڑا لشکر ہے وہ تم سے لڑنے کے لیے آنا ہی چاہتے ہیں بہتر یہ ہے کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ تو میں تجھے خرموں اور سوکھے انگوروں سے لدے ہوئے دس اُونٹ انعام میں دوں گا۔ جب نعیم یہ خبر لے کر آپؐ کے لشکر میں آیا تو حضرت علیؑ نے اس کے جواب میں فرمایا۔ کچھ پرواہ نہیں حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ سب سے اچھا کارساز ہے)۔ خدا کو حضرت علیؑ کی یہ بات ایسی پسند آئی کہ اس قول کی حکایت کر دی۔ اس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد جبرئیل امینؑ نے آکر یہ خبر دی کہ کفار بھاگ کر مکہ کو روانہ ہوگئے اب آپؐ اطمینان سے مدینہ کو واپس ہو جائیے۔

ولا يحزنك الذين يسارعون في الكفر إنهم لن يضروا الله شيئا يريد الله ألا يجعل لهم حظا في الآخرة ولهم عذاب عظيم ﴿۱۷۶﴾ إن الذين اشتروا الكفر بالإيمان لن يضروا الله شيئا ولهم عذاب أليم ﴿۱۷۷﴾ ولا يحسبن الذين كفروا أنما نملي لهم خير لأنفسهم إنما نملي لهم ليزدادوا إثما ولهم عذاب مهين ﴿۱۷۸﴾

اے رسول جو لوگ کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ ہرگز خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ خدا تو یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ ہی قرار نہ دے اور ان کے لیے تو وہاں بڑا سخت عذاب ہوگا۔ بے شک جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا انہوں نے کوئی نقصان اللہ کو نہیں پہنچایا اور ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے ہی۔ جو لوگ

کافر ہیں اُن کو بھول کر بھی یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ ہم نے جو اُن کو مہلت و فارغ البالی دے رکھی ہے وہ ان کے حق میں بہتر ہے ہم نے تو یہ مہلت اس لیے دے رکھی ہے کہ وہ گناہ اور زیادہ کریں اور ان کے لیے تو رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

کافروں کی زیادتی دیکھ کر آنحضرتؐ اکثر ملول رہا کرتے تھے خصوصاً جب منافقین یہ طعنہ زنی کرتے تھے کہ جو لوگ کافر ہیں اللہ نے ان کا کیا بگاڑا۔ مزہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خدا ان کو مارتا کیوں نہیں۔ ان کی فارغ البالی کو چھین کیوں نہیں لیتا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کی رسی اس لیے ڈھیلی چھوڑ دی ہے کہ بہت سے گناہوں کا بار اُن کے سر پر لد جائے جب وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہی نہیں اور ہمارے رسول کی ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے اُن کو ستاتے ہی رہتے ہیں تو بس اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تاکہ خوب جی بھر کر گناہ کر لیں۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع

اللہ ایسا نہیں ہے کہ مومنین کو اس حالت میں چھوڑ دے جس پر کہ تم ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے علیحدہ نہ کر دے اور نہ اللہ ایسا ہے کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے بلکہ وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے (علم غیب دینے کے لیے) چُن لیتا ہے پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگار بنے رہو گے تو تمہارے لیے بڑا اجر ہوگا۔ جو لوگ اس چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے اُن کو دے رکھا ہے کہ وہ ان کے لیے اچھا ہے بلکہ وہ ان کے لیے بہت بُرا ہے (یاد رہے کہ) جس چیز میں انہوں نے بخل کیا ہے اور قیامت میں ان کے گلے میں طوق بنا کر پہنا دیا جائے گا۔ اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

علم غیب بالذات خدا سے مخصوص ہے۔ رہے انبیاؑ و مرسلین جو کہ غیب کی باتیں بتاتے ہیں ان کا علم اللہ کی طرف سے ان کو عطا ہوتا ہے یعنی اُن کے لیے عین ذات نہیں البتہ داخل فی الذات ہوتا ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے روز قیامت ان کا مال طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک آتشیں سانپ بنا کر بطور طوق اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا جو حساب سے فارغ ہونے تک اس کا گوشت کھاتا رہے گا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ج اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

وقف لازم

بے شک اللہ نے ان کی باتیں سُن لیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں جو کچھ انہوں نے کہا ہم اس کو بھی لکھ لیتے ہیں اور ناحق انبیاؑ کے قتل کرنے کو بھی (وہ جو چاہیں کہے جائیں اور کیے جائیں) قیامت کے دن ہم ان سے کہیں گے کہ اب اس کی سزا میں جلا دینے والے عذاب کا مزہ چکھو یہ سزا ہے ان بد افعال کی جن کو تم مرنے سے پہلے بھیج چکے ہو بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد کر لیا ہے کہ جب تک کوئی رسول یہ معجزہ نہ دکھائے کہ وہ قربانی کرے اور آسمانی آگ اُسے جلا دے اُس وقت تک ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے تم ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے بھی خدا کے رسول معجزات لے کر آئے اور جس چیز کی تم نے فرمائش کی، وہ بھی پوری کی تھی۔ پس اگر تم سچے ہو تو تم نے (تمہارے باپ دادا نے) ان کو قتل کیوں کیا تھا۔ اے رسول اگر اس پر وہ تمہیں جھٹلائیں تو غم نہ کرو تم سے پہلے بھی یہ اُن رسولوں کو جھٹلا چکے ہیں جو معجزے صحیفے اور نورانی کتاب لے کر آئے تھے۔

یہودیوں کے سردار کعب بن اشرف نے ایک روز رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ ہم سے خدا نے معاہدہ کیا ہے کہ جب تک کوئی رسول معجزہ لے کر نہ آئے تم ہرگز اس پر ایمان نہ لانا۔ آپ نے ابھی تک کوئی ایسی قربانی نہیں دکھائی جسے آسمانی آگ نے آکر جلا دیا ہو پھر ہم آپ پر کیوں ایمان لائیں، آپ کا دعویٰ نبوت محض زبانی ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کے جواب میں خدا نے یہ آیات نازل کیں۔ اگرچہ مخاطبہ اس زمانہ کے یہودیوں سے ہے لیکن عمل دکھایا گیا ہے ان کے باپ دادا کا۔ چونکہ انہوں نے اپنے اسلاف کے اس عمل کو بُرا نہیں سمجھا پس گویا یہ سب کرتوت انہی کے قرار دئے گئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ آنحضرتؐ نے کیوں نہ ایسی قربانی کا معجزہ دکھا دیا جسے آگ جلا ڈالتی۔ جواب یہ ہے کہ اگر حضورؐ ایسا کرتے تو آئے دن لوگ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق معجزہ دکھانے کی فرمائشیں کیا کرتے اور معجزہ ایک تماشہ بن جاتا۔ دوسرے قربانی اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کے گوشت پوست سے غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ لیکن جس قربانی کو آگ جلا دے بھلا اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

ہر نفس کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے قیامت کے دن تم اپنے کیے کا بھرپور بدلہ پاؤ گے۔ جو شخص جہنم سے بچ گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا اور زندگانی دنیا متاعِ غرور کے سوا اور کیا ہے۔

جب ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور کوئی بچنے والا نہیں حتیٰ کہ سب ملائکہ بلکہ ملک الموت تک مر جائیں گے۔ پھر قیامت میں جب سب محشر میں جمع ہوں گے اور ہر ایک کی گردن میں اس کا اعمال نامہ پڑا ہو گا اور ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہو گا، تو یہاں دنیا میں بہت سوچ سمجھ کر رہا جائے۔ یہاں کی ساری دولت دھوکا ہے جسے انسان یونہی چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے گا۔ آخرت میں کام آنے والے صرف اعمالِ خیر ہوں گے۔ بس ایسی صورت میں انسان کو غافل نہ ہونا چاہیئے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

اے مسلمانو، تمہارے مالوں اور جانوں سے تمہاری آزمائش ضرور ہو گی۔ جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور جو مشرک ہیں ان سے تم نے ضرور تکلیف دہ باتیں سُنی ہوں گی پس ان پر صبر کرو اور پرہیزگار بنے رہو۔ بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ ان کو وہ وقت یاد دلاؤ جب اللہ نے اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ کتاب میں ہے، تم لوگوں سے اسے صاف صاف بیان کرو گے اور کوئی بات چھپاؤ گے نہیں مگر انہوں نے بجائے عمل کرنے کے کتاب کو پسِ پُشت ڈال دیا اور اس کو تھوڑی سی قیمت لے کر بیچ ڈالا۔ پس کیا ہی بُرا سودا انہوں نے کیا۔ اے رسول، تم انہیں خیال میں بھی نہ لانا جو اپنی کارستانیوں پر اِترا رہے ہیں اور کیا کرایا کچھ نہیں مگر تعریف کے خواستگار ہیں کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ یہ عذاب سے بچ جائیں گے ہرگز نہیں ان کے لیے تو بڑا دردناک عذاب ہے۔

یہودیوں اور مشرکین کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے تو سخت طعن آمیز باتیں کرتے اور کہتے تم نے مسلمان ہو کر کیا پایا۔ سوائے اپنی جان و مال کی قربانیاں دینے کے چونکہ ان کی تعداد زیادہ اور مسلمان تھوڑے سے ہوتے اگر ان کی باتوں کا جواب دیتے تو وہ مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ مجبوراً بیچارے چُپ رہتے۔ خدا انہی کی تسلی کے لیے فرما رہا ہے کہ صبر سے کام لو اور اپنی پرہیزگاری کو ترک نہ کرو۔ ان ظالموں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ ایک دن ضرور ملے گا۔ بے شک ایسی باتوں پر صبر کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ دوسرا گروہ یہودیوں کا ہے جن کا ذکر ان آیات میں ہے جب توریت نازل ہوئی تو یہودیوں نے اپنے انبیاء سے اس پر عمل کرنے کے بڑے بڑے لمبے چوڑے وعدے کیے مگر جب طمع دُنیا غالب آئی تو سارے وعدے پسِ پشت ڈال دیئے۔ احکامِ توریت پر عمل کرنا چھوڑ دیا بلکہ یہ غضب ڈھایا کہ امیر لوگوں کو جرم کی سزا سے بچانے کے لیے

توریت کے خلاف فتوے دینے لگے بلکہ توریت کی عبارتوں میں تحریف کر کے لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرنے لگے۔ انہی کے لیے فرمایا ہے کہ یہ ہمارے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ تیسرا گروہ ان مسلمانوں کا تھا کہ جب رسولؐ جہاد پر جاتے تو کترا جاتے اور جب وہاں سے پلٹتے تو حضرتؐ سے کہتے کہ ہم تو فلاں عذر کی وجہ سے نہ جا سکے تھے۔ یہ لوگ کرتے کراتے کچھ نہ تھے خواہ مخواہ کی تعریفیں لوگوں سے سُننا چاہتے تھے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

آسمان و زمین کی تمام سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبانِ عقل و فہم کے لیے اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں عقلمند لوگ وہی ہیں جو کھڑے ہوتے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بارہ میں فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پالنے والے یہ چیزیں تُو نے بیکار پیدا نہیں کیں پس ہم کو عذابِ نار سے بچا لے۔

جو لوگ مومنین کاملین ہیں وہ جب رات کو تہجد کی نماز پڑھتے ہیں تو اس وقت آسمانوں پر غور کرتے ہیں کہ اس قادرِ مطلق نے یہ بے ستون کی چھت کیسے بنائی ہے۔ یہ ستارے کیسے حسین اور روشن ہیں اور یہ زمین پانی پر کیسے بچھائی ہے۔ اس غور و فکر میں ان پر معرفتِ الٰہی کے دروازے کھلتے ہیں اور وہ اپنی مغفرت کے لیے دُعائیں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں جہنم سے بچا لے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

اے ہمارے پالنے والے جسے تُو نے دوزخ میں ڈالا اُسے تُو نے رسوا کیا اور ظالموں کا مددگار کوئی نہ ہوگا۔ اے ہمارے پروردگار جب ہم نے ایک ندا کرنے والے (پیغمبر) کو ایمان کی طرف بُلاتے سُنا تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری بُرائیاں ہم سے دُور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ دُنیا سے اُٹھا لے۔ اے ہمارے رب تُو نے اپنے رسولوں کی معرفت جو ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں دے اور قیامت کے روز ہمیں رسوا نہ کر، بے شک تُو وعدہ خلافی کرنے والا نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت علیؑ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو فاطمہؑ بنت اسد آپؑ کی والدہ اور فاطمہ زہراؑ اور فاطمہ بنت زبیر آپؑ کے ہمراہ تھیں۔ جب منزل صحنان پر پہنچے تو ایک رات اور ایک دن وہاں ٹھہرے، ان چاروں خدا والوں نے تمام راستے اُٹھتے بیٹھتے ذکرِ خدا میں گزار دیئے۔ ہر منزل پر ان کی یہی حالت رہی۔ چنانچہ یہ آیات انہی کی مدح میں ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

ان کے ربّ نے ان کی دُعاؤں کو قبول کر لیا اور فرمایا، میں تم میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت، ضائع کرنے والا نہیں کیونکہ تم ایک ہی جنس سے ہو پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو اذیّت دی گئی۔ انہوں نے قتل کیا اور قتل کیے گئے میں اُن کی بُرائیوں سے ضرور درگزر کروں گا اور ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اللہ کی طرف سے اُن کو یہ ثواب ملے گا، اور اللہ کے پاس تو بڑا اچھا ثواب ہے۔ اے رسول، کفّار کا شہروں میں چین سے پھرنا تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ یہ تو چند روز کی بہار ہے پھر تو ان کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور وہ بڑی بُری جگہ ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے ربّ سے ڈرے اُن کے لیے ضرور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ خدا کی طرف سے ان کی دعوت کا سامان ہے اور جو سامان خدا کے یہاں ہے وہ نیک بندوں کے لیے بہتر ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

بے شک اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور اس کتاب پر جو تم پر نازل کی گئی ہے اور جو ان کی طرف نازل کی گئی تھی ایمان لائے ہیں خدا کے سامنے سر جُھکاتے ہیں تھوڑی سی قیمت میں خدا کی آیات کو بیچتے نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا اجر خدا کے پاس ہے۔ بیشک اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو، سختیوں

میں صبر سے کام لو اور دوسروں کو بھی برداشت کرنے کے لیے کہو اور جہاد کے لیے کمریں کس لو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں فلاح و بہبودی نصیب ہو۔

اس میں دو باتوں کا ذکر ہے اوّل یہ کہ جب بادشاہ نجاشی کا جو بباطن مسلمان ہو گیا تھا انتقال ہوا تو حضرت رسولِ خدا نے مسلمانوں سے فرمایا میرے ساتھ آؤ تاکہ اپنے ایک ایمانی بھائی کی نماز جنازہ پڑھیں۔ چنانچہ آپؐ جنت البقیع میں تشریف لائے خدا نے آپؐ کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دئے اور نجاشی کا جنازہ آپؐ کے سامنے تھا۔ پس آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ منافقوں نے اس پر اعتراض کیا اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور یہ بتایا گیا کہ وہ غائبانہ حضوؐر پر ایمان لا چکا تھا اور اعمالِ صالحہ بجا لاتا تھا۔ دوسری آیت مسلمانوں کی ہمّت افزائی کے لیے ہے ان سے کہا گیا ہے کہ جہاد میں جو تکلیفیں تم کو پہنچیں انہیں خود بھی برداشت کرو اور دوسروں کو بھی برداشت کرنے کی تعلیم دو اور جہاد کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ اس میں تمہارے لیے دُنیا و دین دونوں جگہ بہتری ہے۔ دُنیا میں یوں کہ مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ لگے گا اور آخرت میں یوں کہ تمہیں جہاد کرنے کا بہت اچھا بدلہ ملے گا۔

(۴) سُوْرَةُ النِّسَاۗءِ مَدَنِيَّةٌ (۹۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾

شروع کرتا ہوں اس اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

اے لوگو اپنے اس ربّ سے ڈرو جس نے تم کو صرف ایک شخص سے پیدا کیا اس طرح کہ پہلے ان کی بی بی (حوّا) کو ان کی باقی مٹّی سے پیدا کیا اور پھر انہی دونوں سے بہت سے مرد اور عورتوں کو روئے زمین پر پھیلا دیا اور اس خدا سے ڈرو جس کے وسیلہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحم سے بھی ڈرو بے شک خدا تمہارا نگران ہے

اور یتیموں کو ان کا مال دے دو اور حرام مال کو حلال مال کے بدلہ میں نہ لو اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

حضرت حوّا کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ وہ حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئیں۔ پسلی آدم کے بدن کا جزو تھی پس کیونکر جائز ہوا کہ جو آدم کے بدن کا جزو ہو اس سے مباشرت کی جائے۔ جس خدا نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا اس کے لیے کیا دشوار تھا کہ وہ حوّا کو بھی اسی طرح پیدا کر دے۔

حضرت آدمؑ کی نسل کیونکر چلی اس میں بھی بڑا اختلاف ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت حوّا کے بطن سے تین سو بار اولاد ہوئی ہر بار ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی، ایک بار کا لڑکا دوسری بار کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا تھا۔ اوّل تو تین سو بار جننا ہی غیر معقول ہے۔ بیچاری حوّا کی ساری عمر اس جننے میں ہی صرف ہو گئی ہوگی۔ ایک نحیف الجثہ عورت پر قدرت نے اتنا بھاری بوجھ کیوں ڈالا۔ آٹھ دس بچے پیدا کرنے کے بعد ہی عورت لفافہ ہو جاتی ہے عورت کی فطری کمزوری پر نظر رکھتے ہوئے یہ صورت کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ پھر اس التزام کے ساتھ کہ ہر بار ایک لڑکا اور لڑکی پیدا ہو۔ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے کہ بھائی کا بیاہ بہن کے ساتھ ہو چاہے ان کی ولادت میں بُعد ہو مگر ہوں گے تو دونوں ماں جائے ہی۔ ایسی مباشرت فطرۃً باعثِ ناپسندیدگی ہوتی ہے۔ اسلام آدمؑ سے شروع ہوا ہے لہٰذا فطرت کے خلاف کوئی امر وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں ان سب لڑکوں کے لیے عورتیں کہاں سے آئیں اور تین سو لڑکیاں کس گھر بیاہی گئیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ دو حوریں جنت سے آئیں۔ ایک کی شادی شیث علیہ السلام سے ہوئی دوسری کی یافث سے اور انہی کی اولاد سے نسل چلی۔ یہ روایت بھی کچھ کان کو نہیں لگتی۔ ایک جنت کی حُور کو جو جنّت کی نعمتوں میں پلی بڑھی ہو برزخ بدل کر بشریت کا جامہ پہنا کر اس دار التکلیف میں بھیجنا اس لیے کہ وہ حضرت آدمؑ کی بہو کہلائے اور کسی ٹُھنٹے کی اتّی بنے۔ اس کی ضرورت کیا پیش آئی۔ اس حُور بیچاری کو کس جرم کی سزا دی گئی۔ کیا جو نفس ملکی اس کے اندر تھا وہ ایک مٹی کے پیکر میں خانہ نشیں ہو کر چین سے رہ سکتا ہے اور جسم کو آلہ کار بنا کر گھر گرہستی کا بوجھ سنبھال سکتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے وہ قادرِ مطلق جس نے حوّا کو پیدا کیا تھا یہ کھڑاگ کیوں پھیلاتا اس کے لیے دو عورتیں پیدا کرنا کیا دشوار تھا۔ تیسرا خیال یہ ہے کہ دو جنّیہ دو عورتوں کی صورت میں آئیں اور آدمؑ کے دو بیٹوں کی دُلہنیں بن گئیں۔ کہاں جن کی آتشی خلقت کہاں آدمی مٹی کا پُتلا ان کا نباہ کیونکر ہوا ہوگا۔

چونکہ یہ مسئلہ تو اصولی ہے نہ فروعی لہٰذا ہماری رائے میں تو اس پر غور کرنا ہی فضول ہے۔ ہم نے تو صرف لوگوں کے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ ہم تو اس تصور پر جھوم رہے ہیں کہ کتنا صاحبِ قدرت ہے ہمارا پروردگار جس نے ایک مرد اور ایک عورت کی نسل سے تمام روئے زمین کو بھر دیا اور سب کی روزی کا سامان مہیا کر دیا اور سب کی ہدایت کا بندوبست کر دیا اور اٹھارہ ہزار عالموں کی مخلوق کو حکم دیا کہ وہ ان کی بقا کے لیے اپنے اپنے فرائض برابر انجام دیتے رہیں۔ سبحانہٗ ما اعظم شانہٗ۔

پھر انسانوں کو ان آیات میں یہ ہدایت کی گئی وہ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں صلہ رحم کو مدّنظر رکھیں

یتیموں کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھائیں۔ حلال روزی کو حرام سے نہ بدلیں۔ جو لوگ یتیموں کو اپنی پرورش میں لے کر ان کا مال چٹ کر جاتے ہیں یہ تنبیہ اُن کے لیے ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ؕ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ﴿۴﴾

اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کر نکاح کر کے تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے اپنی مرضی کے موافق تین تین اور چار چار نکاح کرو پھر اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ متعدد بیبیوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو یا جو لونڈی تمہاری زر خرید ہو اس پر قناعت کرو یہ ترکیب بے انصافی نہ کرنے کے بہت ہی قرین قیاس ہے اور عورتوں کو جو اُن کا مہر ہے خوش خوش ادا کر دو اگر پھر تمہیں بخوشی کچھ چھوڑ دیں تو اُسے شوق سے کھاؤ۔

ان آیات میں پہلی بات تو یہ بیان کی گئی کہ اگر یتیم لڑکیوں سے تم نکاح کرو اور ان کے بے وارث ہونے کی وجہ سے انصاف نہ کر سکو یعنی ان کے حقوق کما حقہٗ ادا نہ کر سکو تو پھر انہیں چھوڑ کر دوسری عورتوں سے نکاح کر لو۔ دو تین چار تک لیکن اگر ان کے درمیان انصاف نہ کر سکو تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام کا یہ حکم انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ مرد کو تو چار چار عورتوں کی اجازت اور عورت کو صرف ایک مرد کی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اجازت مجبوری کی صورت میں دی گئی ہے دوسرے اگر مرد ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکتا اور ان کے حقوق پوری طرح ادا نہیں کر سکتا تو پھر یہ اجازت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ حکم عیّاشی کرنے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ ایسی صورت میں ہے جبکہ دوسری عورت سے شادی کے بغیر چارہ نہ ہو۔ مثلاً :

۱۔ ایک عورت ہے شادی کی وہ شادی کے بعد کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گئی کہ مرد اس کے پاس نہیں جا سکتا۔

۲۔ عورت اتنی کمزور ہے کہ وہ مرد کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتی۔ مرد طاقتور ہے وہ مباشرت کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے عورت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

۳۔ عورت ایامِ حیض میں کئی روز کے لیے بیکار ہو جاتی ہے یا ایامِ حمل میں اس سے مباشرت باعثِ ضرر ہوتی ہے،

یا وضع حمل کے بعد بہت دِن تک عورت قابلِ مجامعت نہیں ہوتی۔

۴۔ عورت بدمزاج ہے شوہر سے اکثر اس کی اَن بَن رہتی ہے اور وُہ اپنے میکے میں زیادہ رہتی ہے۔

۵۔ بالفرض مرد میں شہوت اِس قدر زیادہ ہے کہ ایک عورت سے اس کی آتشِ شہوت نہیں بُجھتی۔

ایسی صورتوں میں شریعت نے اجازت دے دی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اپنی بیبوں کے درمیان انصاف کرے ورنہ ایک سے زیادہ کی اجازت نہیں چاہے مرد کی کوئی حالت بھی ہو۔

تعدد کی اجازت ایسی صورت میں ہے جبکہ شدید مجبُوری لاحق ہو مثلاً:

ایک عورت سے شادی کی وہ جذام میں مبتلا ہو گئی۔ پھر دوسرے سے کی وہ تپ دق میں مبتلا ہو گی تیسری سے کی، وہ بانجھ ثابت ہوئی۔ چوتھی سے کی وہ ٹھیک نکلی۔ اب بتائیے اگر وہ چوتھی شادی نہ کرتا تو نہ تو اپنی خواہش کو پُوری کر سکتا تھا اور نہ صاحبِ اولاد بن سکتا تھا۔ اگر چوتھی بھی کسی عارضہ میں مبتلا ہو تو مرد اپنی قسمت پر رو لے اور کچھ نہیں ہاں اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی جگہ دوسری لا سکتا ہے۔

مہر کے مسئلہ کو لوگوں نے ایک مذاق بنا لیا ہے شادی کے وقت بڑے بڑے وزنی مہر قبول کر لیتے ہیں۔ محض اس خیال سے لیتا دیتا کون ہے یہ تو دفع الوقتی ہے لڑکی والے جتنا چاہیں بندھوا لیں۔ یہ تو اللہ سے کھلی بغاوت ہے۔ دوسرے عورت کی طلب پر کم ہو یا زیادہ، مرد دیتا ہی نہیں۔ بلکہ اس کی طلب پر عورت سے بہ سختی پیش آتا ہے یہ کہاں کا انصاف ہے۔ مرد کو چاہیئے کہ شادی کے وقت یہ تہیہ کرے جو مہر میں نے قبول کیا ہے اُسے ضرور ادا کروں گا اور جب عورت مانگے تو اُسے ادا کرنے میں پوری کد کرے ہاں اگر عورت کل یا جزو بخش دے تو دُوسری بات ہے۔

تفسیر صافی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور مہر ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو تو وہ شخص خدا کے نزدیک زانی ہے۔ امیر المؤمنینؑ سے منقول ہے کہ شرائط نکاح کا پورا کرنا واجب ہے ورنہ ازواج حلال نہیں ہوتیں۔

اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مردوں کو تو بیک وقت چار عورتوں کی اجازت دی گئی ہے اور عورت کو صرف ایک کی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ مرد میں بہ نسبت عورت کے شہوت زیادہ ہوتی ہے عورت میں کم۔ شہوت کا دار و مدار قوت پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جسمانی طاقت کے اعتبار سے مرد زیادہ قوی ہوتا ہے۔ دوسرے اگر عورت کو کئی مردوں سے مباشرت کی اجازت دے دی جاتی تو پتہ نہ چلتا کہ کون سا بچّہ کس کا ہے اس صورت میں میراث میں جھگڑا پڑ جاتا اور بچہ محرُوم الارث ہو جاتا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾

اپنے وہ مال جس پر تمہاری گذر بسر موقوف ہے بیوقوفوں اور نا سمجھ یتیموں کے ہاتھ میں نہ دے بیٹھو البتہ اس میں سے انہیں کھلاؤ پلاؤ اور ان سے پیار و محبت کی بات کرو اور ان کو پہلے کچھ رقم دے کر کاروبار میں لگاؤ یہاں تک کہ شادی کرنے کے قابل ہو جائیں پس اگر تم دیکھو کہ ان میں طریقہ سے خرچ کرنے کی صلاحیت آگئی ہے تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو اور خبردار ایسا نہ کرنا کہ اس خوف سے کہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کا مال تم سے نکل جائے گا۔ فضول خرچی میں پڑ کر جلدی سے ان کا مال نہ کھا بیٹھنا۔ اگر ولی دولتمند ہے تو اس کو چاہیئے کہ ان کا مال کھانے سے بچا رہے اور اگر فقیر ہے تو واجبی طور پر اس میں سے کچھ لے کر کھا لے۔ اور جب تم یتیموں کی سپرد اُن کا مال کرو تو لوگوں کو اس پر گواہ ضرور بنا لینا اور اللہ تو حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

جاہلیت میں عرب کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا اور اس کے بچوں کا کفیل کوئی شخص قرار پاتا تو وہ اس کے باپ کے مال کا مالک ہو جاتا اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق صَرف کرتا، یتیم بچوں کے کھانے کپڑے پر توجہ نہ کرتا۔ جب دیکھتا کہ وہ بالغ ہونے والے ہیں تو اس خیال سے کہ وہ مال اس سے نکل جائے گا بہت جلد فضولیات میں خرچ کر کے اپنا دامن جھاڑ دیتا۔ اس سے روکنے کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿۷﴾ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿۱۰﴾

ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں کچھ حصّہ تو خاص مردوں کا ہے اور اس طرح ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں کچھ حصّہ عورتوں کا بھی ہے خواہ ترکہ کم ہو یا زیادہ ہر ایک کا حصّہ ہماری طرف سے معیّن کیا ہوا ہے اور جب ترکہ کی تقسیم کے وقت وہ قرابت دار جن کا کوئی حصّہ نہیں اور یتیم بچے اور محتاج لوگ آجائیں تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے بعنوان شائستہ اچھی طرح بات کرو۔ ان لوگوں کو ڈرنا اور خیال کرنا چاہیئے کہ وہ لوگ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتے تو ان پر کس قدر ترس آتا۔ پس ان غریب بچّوں پر سختی کرنے میں خدا سے ڈرنا چاہیئے اور ان سے اچھی طرح بات کرنی چاہیئے۔ جو لوگ از راہِ ظلم یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور وہ واصلِ جہنّم ہوں گے۔

عرب میں قبلِ اسلام یہ دستور تھا کہ عورتوں اور چھوٹے بچّوں کو ترکہ سے کچھ نہیں دیتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ مال کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ جب حضورؐ مدینہ آئے تو یہی رسم وہاں جاری تھی۔ اس کی روک تھام کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ دنیا میں مختلف بلاؤں میں مبتلا ہوں گے اور آخرت میں انہیں جہنم کی بھڑکتی آگ میں ڈالا جائے گا۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۱۱﴾

خدا تمہاری اولاد کے حق میں تم سے وصیّت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر میّت کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں (دو یا دو سے زیادہ) تو ان کا مقرّرہ حصّہ کل ترکہ کا دو تہائی ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کا آدھا ہے اور میّت کے ماں باپ میں ہر ایک کا حصّہ اگر میّت کے کوئی اولاد ہو تو متروکہ میں سے خاص چیزوں میں چھٹا حصّہ ہے اور اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کا حصّہ (خاص چیزوں میں) ایک تہائی ہے اور باقی باپ کا ہے۔ اور اگر میّت کے (حقیقی یا سوتیلے) بھائی بھی ہوں تو (اگرچہ انہیں کچھ بھی نہ ملے گا) اس وقت ماں کا حصّہ چھٹا ہی ہوگا اور وہ بھی میّت نے جس کے بارہ میں وصیت کی ہے اس کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد تمہارے باپ ہوں یا بیٹے تم تو یہ نہیں جانتے ہو کہ ان میں کون تمہاری نفع رسانی میں زیادہ قریب ہے (پھر تم کتنا دخل دے سکتے ہو)۔ حصّہ تو صرف خدا کی طرف سے معیّن ہوتا ہے کیونکہ خدا تو ضرور ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ صاحبِ حکمت و تدبیر ہے۔

میراث کے مسائل کتبِ فقہ میں دیکھنے چاہئیں۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿١٢﴾

اور جو کچھ تمہاری بی بیاں چھوڑ کر مر جائیں پس اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو تو تمہارا آدھا حصہ ہے اور اگر ان کے اولاد ہو تو جو کچھ وہ ترکہ چھوڑیں اس میں سے بعض چیزوں میں چوتھائی تمہارا ہے اور وہ بھی عورت نے جس کی وصیت کی ہو اور ادائے قرض کے بعد اور اگر تمہارے کوئی اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں تمہاری بی بیوں کا بعض چیزوں میں چوتھائی ہے اور اگر تمہارے کوئی اولاد ہو تو تمہارے ترکہ میں ان کا خاص چیزوں میں آٹھواں حصہ ہے اور وہ بھی تم نے جس کے بارہ میں وصیت کی ہے اس کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد اور اگر کوئی مرد یا عورت اپنے اخیافی بھائی یا بہن کو چھوڑے تو ان میں سے ہر ایک کا خاص چیزوں میں چھٹا حصہ ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو سب کے سب ایک خاص تہائی میں شریک رہیں گے اور یہ سب میّت نے جس کے بارہ میں وصیت کی ہے اس کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد مگر ہاں جبکہ وہ وصیت وارثوں کو خواہ مخواہ نقصان پہنچانے والی نہ ہو یہ وصیت خدا کی طرف سے ہے اور خدا تو ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

حضرات اہلسنت کا یہ اعتراض ہے کہ شیعہ اپنی بی بیوں کو ہر چیز میں ترکہ نہیں دیتے بلکہ خاص خاص چیزوں سے دیتے ہیں جو قرآن کے خلاف ہے۔ جواب یہ ہے کہ خدا نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ بی بیوں کو کُل چیزوں سے دو بلکہ لَهُنَّ الرُّبُعُ

مِمَّا تَرَكْتُمْ میں ربع پر الف لام داخل کر کے اور مِمَّا میں من تبعیضیہ داخل کر کے بتا دیا کہ ان کا حصہ خاص چیزوں میں ہے اسی طرح جن لوگوں کے حصوں میں کچھ بھی تخصیص ہے اور ہر چیز سے ترکہ نہیں دلایا گیا ان میں الف لام اور من موجود ہے اور جن کو ہر چیز سے دلوایا ہے وہاں الف لام یا من نہیں ہے دیکھو شوہر کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں پورا آدھا دلوایا ہے وہاں الف لام یا من نہیں۔ اور جب اولاد ہو تو ہر چیز سے چوتھا حصہ نہ ملے گا بلکہ اکبر اولاد کا حق جبوۃ نکالا جائے گا اس واسطے الف لام اور من دونوں کے ساتھ بیان کیا۔ پورا حال کسی رسالہ میراث میں دیکھئے۔ تفسیر انوار النجف میں مولانا حسین بخش صاحب قبلہ نے تفصیل سے لکھا ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾ وَالّٰتِيْ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَإِنْ شَهِدُوْا فَأَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿١٥﴾ وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾

یہ ہیں اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا،

اور حدودِ خدا سے تجاوز کرے گا تو خدا اُسے جہنّم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس کے لیے سخت رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو اپنے لوگوں میں سے چار کی گواہی لو پس اگر وہ تصدیق کر دیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا خدا ان کے لیے کوئی دوسری راہ نکالے اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اِصلاح کرلیں تو چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ توبہ تو درحقیقت ان ہی کے لیے ٹھیک ہے جو نادانستہ بُری حرکت کر بیٹھیں پھر جلدی سے توبہ کرلیں اور اللہ بھی ایسوں کی توبہ قبول کرلیتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ ان کو کہیں نہ نکلنے دو یہاں تک وہ مرجائیں لیکن کچھ دن بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا اور یہ حکم نازل ہُوا کہ اگر کوئی بے شوہر والی عورت زنا کرلے تو عورت و مرد دونوں کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شوہر دار عورت زنا کرلے تو سنگسار کی جائے۔

توبہ کے متعلق حضرت رسولِ خدا نے فرمایا، جو گنہگار اپنے مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرلے تو خدا قبول فرماتا ہے پھر فرمایا ایک سال بہت ہے اس کو توبہ کرنا نصیب ہو یا نہ ہو لہٰذا ایک مہینہ مرنے سے پہلے توبہ کرلے تو خدا قبول کرلے گا۔ پھر فرمایا ایک مہینہ بھی بہت ہے اگر ایک دن قبل توبہ کرلے تو بھی قبول ہو جائے گی پھر فرمایا، ایک دن بھی بہت ہے اگر مرنے سے ایک گھڑی پہلے بھی توبہ کرلے تو رحمتِ خدا اُسے قبول کرلے گی۔

توبہ سے وہی گناہ معاف ہوتے ہیں جن کا تدارک نہیں ہوسکتا اور اگر تدارک ممکن ہے تو محض توبہ کام نہ دے گی۔ اگر بندوں کے حقوق اس کے ذمّہ ہیں تو انہیں واپس دے یا معاف کرالے تو خدا انہیں معاف نہیں کرتا۔

اسلام نے زانی اور زانیہ کے لیے سخت سزا رکھی ہے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ افسوس ہے کہ اسلامی سزائیں نظرانداز کردینے کی وجہ سے لوگوں کو گناہوں پر جرأت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اب زنا کو بہت سے لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ نوجوان مرد اور عورتوں میں اس کا رجحان بڑھتا جاتا ہے۔ اگر دونوں برضا و رغبت زنا کے مرتکب ہوں تو اس کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ ایسے عظیم گناہوں پر چند ماہ کی سزا دوسروں کے لیے باعثِ عبرت نہیں ہوسکتی۔ اگر سرِبازار ان کو کوڑے لگائے جاتے تو لوگ کانپ جاتے اور ایسا کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوتی۔ اکثر عورتیں اپنے شوہروں سے بیزار ہو کر دوسرے مردوں سے ناجائز تعلقات پیدا کرکے مرتکبِ زنا ہوتی ہیں اور جو اولاد ان سے ہوتی ہے اُسے اپنے شوہر کے سر تھوپتی ہیں کتنا عظیم گناہ ہے لیکن سزا کچھ بھی نہیں ــــ اگر حکومت سزا نہ دے تو کم از کم معاشرہ میں تو ایسے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان سے تعلقات قطع کیے جائیں۔ عبرت کے لیے تو یہ بھی زبردست تازیانہ ہوسکتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

توبہ ایسے لوگوں کے لیے مفید نہیں جو عُمر بھر بُرے کام کرتے رہے یہاں تک کہ موت سر پر آکھڑی ہُوئی تو کہنے لگے اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرگئے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اے ایماندارو تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ اپنے مورث کی عورت سے نکاح کرکے زبردستی وارث بن جاؤ اور جو کچھ تم نے انہیں ترکہ میں دیا ہے اس کو واپس لینے کی نیّت سے نہ روکو۔ ہاں اگر وہ کھُلم کھُلا بدکاری کریں تو روکنے میں مضائقہ نہیں۔ اور اپنی بی بیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو اور اگر تم کسی وجہ سے انہیں ناپسند کرو تو صبر سے کام لو ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا تمہارے لیے اس کو بہتر بنادے اور اگر تم ایک بی بی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بی بی تبدیل کرنا چاہو تو تم اگرچہ اس عورت کو جسے طلاق دینا چاہتے ہو بہت سا سامان دے چکے ہو تاہم اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تمہاری غیرت

اور حدودِ خدا سے تجاوز کرے گا تو خدا اُسے جہنّم میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اس کے لیے سخت رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں تو اپنے لوگوں میں سے چار کی گواہی لو پس اگر وہ تصدیق کر دیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا خدا ان کے لیے کوئی دوسری راہ نکالے اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اِصلاح کر لیں تو چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ توبہ تو درحقیقت ان ہی کے لیے ٹھیک ہے جو نادانستہ بُری حرکت کر بیٹھیں پھر جلدی سے توبہ کر لیں اور اللہ بھی ایسوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ ان کو کہیں نہ نکلنے دو یہاں تک وہ مر جائیں لیکن کچھ دن بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ حکم نازل ہُوا کہ اگر کوئی بے شوہر والی عورت زنا کر لے تو عورت و مرد دونوں کو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شوہر دار عورت زنا کرلے تو سنگسار کی جائے۔

توبہ کے متعلق حضرت رسولِ خدا نے فرمایا، جو گنہگار اپنے مرنے سے ایک سال پہلے توبہ کرلے تو خدا قبول فرماتا ہے پھر فرمایا ایک سال بہت ہے اس کو توبہ کرنا نصیب ہو یا نہ ہو لہٰذا ایک مہینہ مرنے سے پہلے توبہ کرلے تو خدا قبول کر لے گا۔ پھر فرمایا ایک مہینہ بھی بہت ہے اگر ایک دن قبل توبہ کر لے تو بھی قبول ہو جائے گی پھر فرمایا، ایک دن بھی بہت ہے اگر مرنے سے ایک گھڑی پہلے بھی توبہ کر لے تو رحمتِ خدا اُسے قبول کر لے گی۔

توبہ سے وہی گناہ معاف ہوتے ہیں جن کا تدارک نہیں ہو سکتا اور اگر تدارک ممکن ہے تو محض توبہ کام نہ دے گی۔ اگر بندوں کے حقوق اس کے ذمّہ ہیں تو انہیں واپس دے یا معاف کرلے خدا انہیں معاف نہیں کرتا۔

اسلام نے زانی اور زانیہ کے لیے سخت سزا رکھی ہے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔ افسوس ہے کہ اسلامی سزائیں نظر انداز کر دینے کی وجہ سے لوگوں کو گناہوں پر جرأت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اب زنا کو بہت سے لوگ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ نوجوان مرد اور عورتوں میں اس کا رجحان بڑھتا جاتا ہے۔ اگر دونوں برضا و رغبت زنا کے مرتکب ہوں تو اس کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ ایسے عظیم گناہوں پر چند ماہ کی سزا دوسروں کے لیے باعثِ عبرت نہیں ہو سکتی۔ اگر سرِ بازار ان کو کوڑے لگائے جاتے تو لوگ کانپ جاتے اور ایسا کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوتی۔ اکثر عورتیں اپنے شوہروں سے بیزار ہو کر دوسرے مردوں سے ناجائز تعلقات پیدا کر کے مرتکبِ زنا ہوتی ہیں اور جو اولاد ان سے ہوتی ہے اُسے اپنے شوہر کے سر تھوپتی ہیں کتنا عظیم گناہ ہے لیکن سزا کچھ بھی نہیں ـــــ اگر حکومت سزا نہ دے تو کم از کم معاشرہ ہی تو ایسے لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان سے تعلقات قطع کیے جائیں۔ عبرت کے لیے تو یہ بھی زبردست تازیانہ ہو سکتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَـيْـــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُھْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

توبہ ایسے لوگوں کے لیے مفید نہیں جو عُمر بھر بُرے کام کرتے رہے یہاں تک کہ موت سر پر آکھڑی ہُوئی تو کہنے لگے اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو کفر ہی کی حالت میں مر گئے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اے ایماندارو تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ اپنے مورث کی عورت سے نکاح کر کے زبردستی وارث بن جاؤ اور جو کچھ تم نے انہیں ترکہ میں دیا ہے اس کو واپس لینے کی نیّت سے نہ روکو۔ ہاں اگر وہ کھُلم کھُلا بدکاری کریں تو روکنے میں مضائقہ نہیں۔ اور اپنی بی بیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو اور اگر تم کسی وجہ سے انہیں ناپسند کرو تو صبر سے کام لو ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا تمہارے لیے اس کو بہتر بنا دے اور اگر تم ایک بی بی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بی بی تبدیل کرنا چاہو تو تم اگرچہ اس عورت کو جسے طلاق دینا چاہتے ہو بہت سا سامان دے چکے ہو تاہم اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تمہاری غیرت

یہ گوارا کرے گی کہ کوئی جھوٹا الزام لگا کر واپس لے لو حالانکہ تم میں سے ایک دوسرے کے ساتھ خلوت کر چکا ہے اور بیبیاں تم سے نکاح کے وقت (عقد وغیرہ کا) پکّا اقرار لے چکی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کا لڑکا اس بیوہ عورت کے سر پر کپڑا ڈال کر پہلے شوہر کے مہر ہی پر اُسے اپنی بی بی بنا لیتا یا کسی دوسرے شخص سے نکاح کر دیتا اور اس کا مہر خود صرف کرتا یا اس کو مقید کر دیتا یہاں تک کہ جو میراث اُسے شوہر سے ملی تھی اُسے دے کر یا تو چھٹکارا پاتی یا اُسی قید میں مر جاتی۔ ابتدائے اسلام میں بھی یہی قاعدہ جاری تھا۔ چنانچہ جب ابوقیس انصاری نے وفات پائی، تو اس کی بیوہ مسمّاۃ کبیشہ کے سر پر کپڑا ڈال کر اس کا سوتیلا بیٹا معض بن قیس اپنے تصرف میں لایا اور اُسے تنگ کرنے لگا۔ کبیشہ نے حضورؐ کے پاس آ کر فریاد کی۔ حضرتؐ نے فرمایا تو اپنے گھر جا جو وحی تیرے بارہ میں نازل ہو گی اس سے مطلع کروں گا۔ اس کے دوسرے ہی دن مدینہ کی بہت سی عورتیں جو اس مصیبت میں مبتلا تھیں آپؐ کی خدمت میں فریاد کرنے آئیں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان بیچاریوں نے اس مصیبت سے نجات پائی۔

یہ کس قدر انسانیت سوز رسم تھی۔ اسی طرح اور بہت سی بیہودہ رسمیں زمانۂ جاہلیت میں جاری تھیں۔ دنیائے انسانیت پر یہ اسلام کا احسان ہے کہ اس نے ان کثافتوں سے معاشرہ کو پاک و صاف کیا۔ خیر اب تو اسلامی دنیا میں ایسا کہیں نہیں ہوتا کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی ماں کو اپنی جورو بنا لے لیکن اور بہت سی باتیں ہیں کہ باوجود سخت ممانعت کے عمل میں آ رہی ہیں چوری۔ زناکاری۔ اغوا۔ ڈکیتی۔ یتیم کا مال کھانا۔ جھوٹی گواہی۔ جھوٹ بولنا۔ شراب نوشی مالِ غیر پر تصرّف۔ ظلم و ستم۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے مگر لوگوں کے منہ پر مہرِ سکوت لگی ہوئی ہے۔ سزا تو ایک طرف کوئی مرتکبِ گناہ سے اظہارِ بیزاری بھی نہیں کرتا۔ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ اصلی تباہی کا باعث یہی ہے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر لوگ قائم رہتے تو انسانی معاشرہ میں یہ گندگی نہ پائی جاتی۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ ع حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

جن عورتوں سے تمہارے باپ دادا نے نکاح کیا تم ان سے نکاح نہ کرو۔ جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، اب نہیں یہ تو بہت بُری اور اللہ کی ناخوشی کی بات ہے اور بہت بُرا طریقہ ہے۔ تمہارے اُوپر تمہاری مائیں تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دُودھ پلایا ہے اور تمہاری دُودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور وہ لڑکیاں جو تمہاری گودوں میں پرورش پا چکی ہیں اور تمہاری ان بیبیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہیں جن سے تم ہم بستری کر چکے ہو اور اگر ہم بستری نہیں کی صرف نکاح ہی ہوا ہے تو ایسی لڑکیوں سے نکاح کرنے میں گناہ نہیں اور تمہارے صلبی لڑکوں (پوتوں، نواسوں) کی بیبیاں (بہویں) اور دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ ہاں جو پہلے (ایّامِ جاہلیت میں) ہو چکا وہ ہو چکا۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بہنیں خواہ حقیقی ہوں یا سوتیلی یا مادری۔ پھوپھیاں خواہ اپنی ہوں یا باپ کی یا ماں کی یا دادا دادی یا نانا نانی کی ایسے ہی خالائیں خواہ اپنی ہوں یا باپ ماں یا دادا نانا کی۔ جس طرح یہ عورتیں مردوں پر حرام ہیں، اسی طرح ان رشتوں

کے مرد عورتوں پر حرام ہیں۔

دو بہنوں سے ایک ساتھ عقد اس لیے حرام ہے کہ ان دونوں کے درمیان عداوت پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے کیونکہ یہ مرد کی فطرت ہے کہ وہ کسی ایک کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اور عورت کی فطرت یہ ہے کہ وہ دوسری بی بی کی طرف شوہر کا رجحان نہیں چاہتی اس بنا پر بہنوں کی فطری محبت عداوت سے بدل جائے گی اور اس طرح ان پر ظلم ہوگا۔

ان آیات میں بیٹیوں سے نکاح کرنے کی حرمت کا تو ذکر ہے لیکن نواسیوں کا ذکر نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نواسیاں حکم بنات میں شامل ہیں یعنی وہ بھی لڑکیوں ہی میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر اولادِ جناب فاطمہ زہرا زینبؑ و امّ کلثومؑ بناتِ رسولؐ کہلاتی تھیں جن کا ذکر انہوں نے خود بازار کوفہ میں کیا اور ان ناواقف الحال لوگوں کو بتایا کہ نَحْنُ بَنَاتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ (ہم رسولؐ اللہ کی بیٹیاں ہیں)۔ جو لوگ نواسیوں کو لڑکیوں میں داخل نہیں سمجھتے وہ بتائیں کہ ان سے نکاح کی حرمت کس طرح ثابت ہوتی۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

(اور حرام ہیں تم پر) شوہر دار عورتیں مگر وہ شوہر دار عورتیں جو جہاد میں کفار سے تمہارے ہاتھ آجائیں (حرام نہیں) یہ خدا کا تحریری حکم ہے جو تم پر فرض کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا عورتوں کے سوا اور عورتیں تم پر حلال ہیں، بشرطیکہ بدکاری و زنا کا مقصد نہ ہو بلکہ تم عفت اور پاکدامنی کے لحاظ سے ان کے مہر کے بدلے نکاح کرنا چاہو۔ ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہو تو ان کا جو مہر تم نے معین کیا ہے دے دو اور مہر مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں مدت کی کمی بیشی پر راضی ہو جاؤ تو اس میں کچھ گناہ نہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف اور مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے۔

اس آیت سے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ الخ صاف اور صریحی طور پر متعہ کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ اس آیت سے پہلے نکاح دائمی کا مفصل بیان آچکا ہے۔ تمام شرائط بیان ہو چکی ہیں۔ پھر نکاح کے متعلق یہ بیان غیر ضروری تکرار ہوگا۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن کے علاوہ جو قرآن کے اور نسخے صحابہ کے پاس تھے ان میں اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (یعنی وقتِ معین تک) لکھا ہوا تھا۔ عقد دائمی جب غیر معین صورت میں ہوتا ہے تو معین صورت والا عقد ضرور اس کے علاوہ کوئی ہونا چاہیئے تفسیر دُرِّ منثور وغیرہ میں ہے کہ جب ابنِ عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انہوں نے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کے ساتھ پڑھی اور حبیب ابی نعرہ وغیرہ نے کہا کہ ہم تو یوں نہیں پڑھتے تو ابن عباسؓ نے کہا واللہ خدا نے اس آیت کو یوں نازل کیا ہے۔ اس بنا پر حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ "اگر عمرؓ لوگوں کو متعہ سے منع نہ کرتے تو قیامت تک سوائے شقی و بدبخت کے کوئی زنا نہ کرتا"۔

جناب جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ کے پورے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کی پوری خلافت میں اور حضرت عمرؓ کے نصف زمانہ خلافت تک لوگ برابر متعہ کرتے تھے لیکن نصف زمانہ خلافت کے بعد حضرت عمرؓ نے متعہ کی حرمت کا حکم جاری کیا وہ بھی ان الفاظ میں:

مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَنَا اَنْهٰى عَنْهُمَا وَاُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا۔

(دو متعہ عہدِ رسالت میں حلال تھے (متعۃ الحج و متعۃ النساء) میں ان دونوں کو حرام کرتا ہوں۔ ان کے کرنے والے کو

سزا دوں گا۔ (درمنثور سیوطی جلد۲، تفسیر کشاف جلد۱، معالم التنزیل، مستدرک، تاریخ طبری جمع بین الصحیحین، عینی شرح صحیح بخاری)

اس سلسلہ میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اس آیت کی ناسخ کوئی دوسری آیت قرآن میں موجود نہیں۔

۲۔ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ متعہ عہدِ رسالت میں حلال تھا اور لوگ متعہ کرتے تھے۔

۳۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ حضرت عمرؓ کو حرام کرنے کا مجاز تھا یا نہیں۔

۴۔ شریعتِ رسولؐ میں جو حلال اور حرام ہے وہ قیامت تک باقی رہنے والی چیز ہے کسی کو اس میں ترمیم یا تنسیخ کی اجازت نہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر کوئی حکم باقی نہیں رہ سکتا۔

۵۔ جو لوگ اسے عیاشی یا رنڈی بازی سے تعبیر کرتے ہیں وہ حقیقت سے دور ہیں اور تعصب کی آگ میں جل رہے ہیں۔

۶۔ متعہ کرنا کسی پر واجب نہیں ایک فطری ضرورت کا پورا کرنا اور زنا جیسے حسنات سوز گناہ سے بچنا ہے۔

چند ضروری باتوں پر غور کیجئے:

(الف) ایک فوجی اپنے وطن سے دور کسی محاذ پر پڑا ہوا ہے۔ سال دو سال وہیں اُسے گزارنا ہیں اس کے شہوانی جذبات زور پر ہیں۔ بتائیے وہ کیا کرے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا یہ کہ دائمی عقد کرکے دوسری بی بی ساتھ رکھے۔ فوجی قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دوسری یہ ہے کہ کسی عورت سے زنا کرکے بھڑکتی آگ کو دبائے لیکن شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس صورت میں صرف ایک ہی علاج ہے چند روز یا صرف ایک دو رات کے لیے وہ متعہ کرلے تاکہ شرعی دائرہ میں بھی رہے اور تسکینِ نفس بھی ہوجائے۔

(ب) ایک شخص کی بی بی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ وہ اس سے ہم بستر نہیں ہوسکتا۔ غریب آدمی ہے دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ دو بیبیوں کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ دوسرے اُسے امید ہے کہ علاج کرنے کے بعد اس کی بی بی صحتیاب ہوجائے گی مگر کچھ وقت درکار ہے ایسی صورت میں یا تو وہ زنا کی طرف جھک پڑے گا یا اپنی صحت کھو بیٹھے گا۔ ایسی مجبوریوں کے وقت شارع نے متعہ کی اجازت دے رکھی ہے۔

۷۔ متعہ نکاح کی ایک قسم ہے جس کے تمام احکام نکاحِ دائمی کی طرح ہیں سوائے اس کے کہ متعہ میں مدت معین کرلی جاتی ہے۔ نکاحِ دائمی میں مدت معین نہیں ہوتی باقی سب احکام اسی طرح ہیں صیغہ پڑھا جاتا ہے۔ زن و مرد کا ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ مہر بھی معین ہوتا ہے۔ مدت متعہ ختم ہونے کے بعد ممتوعہ عورت بھی مطلقہ عورت کی طرح عدہ میں بیٹھتی ہے۔ اس سے پہلے وہ کسی سے عقد دائمی یا متعہ نہیں کرسکتی۔ ممتوعہ عورت سے جو اولاد ہوتی ہے وہ نکاح دائمی والی عورت کی اولاد کی طرح ورثہ میں حصہ لیتی ہے۔ متعہ بازاری عورت سے مکروہ ہے۔ پاکدامن اور مومنہ عورت سے مستحب ہے جبکہ اس میں وہی شرائط پائی جائیں جو نکاحِ دائمی کے لیے ہوتی ہیں۔ اگر مدتِ متعہ گزر جائے تو آپس کی رضامندی پر مدت کو بڑھایا جاسکتا ہے یہ کہہ کر کہ اِسْتَحْلَلْتُكِ بِاَجَلٍ (میں نے تجھے ایک مدت کے لیے حلال کیا)۔ مدت کا ذکر کردیا جائے۔

۸۔ جو عورتیں بیوہ ہوجاتی ہیں اور کسی وجہ سے وہ کسی دوسرے سے عقدِ دائمی نہیں کرسکتیں تو زنا سے بچنے کے لیے بہتر صورت یہی ہے کہ وہ متعہ کرلیں۔

۹۔ متعہ کی حالت زن و مرد دونوں کو حرامکاری سے بچالیتی ہے۔

اس زمانہ میں جو جابجا کاروبارِ زنا کے بازار قائم ہیں اور ان میں یہ جو چہل پہل نظر آرہی ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جو حلال صورت خدا اور رسولؐ نے بتائی تھی لوگوں نے اُسے ترک کردیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

تم میں سے جس کی مالی حالت کسی پاکدامن مومنہ سے نکاح کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو وہ اُن مومنہ لونڈیوں سے جو تمہارے قبضہ میں آچکی ہیں نکاح کرسکتا ہے اللہ تمہارے ایمان سے خوب واقف ہے۔ ایمان کی حیثیت سے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو پس اُن کے مالکوں کی اجازت سے ان لونڈیوں سے نکاح کرسکتے ہو اور ان کا مہر حسنِ سلوک کے ساتھ ان کو دے دو مگر انہی لونڈیوں سے نکاح کرو جو عفت کے ساتھ نہ تو کھلے خزانے زنا کرنا چاہیں نہ چوری چھپے آشنائی۔ پھر جب تمہارے نکاح میں آجائیں اور کوئی بدکاری کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں کو دی جاتی ہے اُس کی آدھی اُن لونڈیوں کو دی جائے گی اور لونڈیوں سے نکاح وہی شخص کرسکتا ہے جس کو زنا میں مبتلا ہوجانے کا خوف ہو پس اگر صبر کرو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

آزاد عورتیں اگر شوہر دار ہو کر زنا کریں تو ان کی سزا سنگسار کرنا ہے اور بے شوہر والی زنا کریں تو ان کی سزا سو کوڑے ہے اگر لونڈی بے شوہر دار ہو کر زنا کرے تو اس کی سزا پچاس کوڑے ہے یعنی آزاد عورت سے آدھی کیونکہ بحیثیت لونڈی ہونے کے اوّل تو اس کی عزّت کم ہے دوسرے اس کی ذمّہ داریاں بھی کم ہیں اور اگر شوہر دار ہو کر زنا کرے تو سات بار تک یہی سزا اس کو دی جائے گی۔ آٹھویں بار ایسا کرنے پر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ مردوں کے لیے بھی آزاد و غلام ہونے کی صورت میں یہی حکم ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا کنیز، زنا سے بچا رہے کیونکہ اس سے بہت سے مفسدے پیدا ہوتے ہیں۔ اور معاشرتی اخلاقی اور تمدّنی نظام میں بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر افسوس مسلمان اس کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتے۔ گویا اس کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتے۔

نوجوانوں کا رجحان دن بدن اس طرف بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اغوا کی خبریں برابر اخباروں میں آ رہی ہیں۔ عصمت مآب لڑکیوں اور عورتوں کی ناموس پر مجرمانہ حملے کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ اس جرم کی سزا وہ نہیں دی جاتی جو شرع نے مقرر کی ہے لہٰذا جرائم بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر سرِ بازار دو چار زانیوں کو کوڑوں کی سزا دی جانے لگے تو دیکھنے والوں کو عبرت ہو اور زنا کرنے والوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ دو چار ماہ کی قید سے ایسے لوگ نہیں گھبراتے۔

جن لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی عصمت دری کی جاتی ہے ان بیچاریوں پر کتنا سخت ظلم ہوتا ہے اس کی کون پروا کرتا ہے اوّل تو کنبہ قبیلہ میں اس کی عزّت و وقعت جاتی رہتی ہے۔ ایسی لڑکی کو اچھے خاندان والے شادی کا پیغام ہی نہیں دیتے مجبوراً کسی معیار سے گرے ہوئے پست سوسائٹی کے لڑکے سے اس کی شادی ہوتی ہے جب اس بیچاری کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور جس بے وقعتی سے وہ رہتی ہے وہ اس کے معزز خاندان کے لیے سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ایک بدکردار اس کی آبرو کو اپنی بدنفسی اور کمینہ پن کی بھینٹ چڑھا کر علیحدہ ہو جاتا ہے اور ذرا اس کا خیال نہیں کرتا کہ میں کیسا عظیم نقصان اس غریب لڑکی کی زندگی کو پہنچا رہا ہوں۔ اللہ مسلمانوں کی اس ظالمانہ اور وحشیانہ زندگی پر رحم کرے اور مسلمانوں کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ ایسے بدکرداروں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں۔

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ قف وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿٢٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ

تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ قف وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾ إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾

اللہ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تم سے صاف بیان کرے اور جو اچھے لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں اُن کے طریقوں پر تم کو چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرلے۔ جو لوگ بُری خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں راہِ حق سے ہٹا دیں۔ خدا چاہتا کہ تمہارے بارہ میں تخفیف کرے اور آدمی تو کمزور پیدا ہی کیا گیا ہے۔ اے ایمان والو ایک دوسرے کا مال حرام طریقہ سے کھایا کرو۔ ہاں اگر باہمی رضامندی سے تمہاری تجارت ہو اور اس میں ایک دوسرے کا مال ہو تو اس صورت میں (جائز طریقہ سے کھانے میں) مضائقہ نہیں اور اپنے نفسوں کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کرو (یعنی خودکشی نہ کرو) اللہ ضرور تمہارے حال پر مہربان ہے۔ جو شخص ظلم و جور سے ناحق ایسا کرے گا تو ہم بہت جلد اس کو جہنم کی آگ میں جھونک دیں گے اور ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ جن بُرے کاموں سے تم کو منع کیا گیا ہے اُن سے بچتے رہو تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں سے درگزر کریں گے۔ اور تم کو بہت اچھی عزّت کی جگہ پہنچا دیں گے۔

گناہانِ کبیرہ کے بارہ میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا اتفاق حسبِ ذیل گناہوں کے کبیرہ ہونے پر ہے:
کفر۔ قتلِ ناحق۔ والدین کی ناراضی۔ سود کھانا۔ مالِ یتیم کا ظلماً لے لینا۔ جہاد سے بھاگنا۔ خودکشی کرنا۔ ہجرت کے بعد صحرا نشین ہو جانا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہِ کبیرہ ہیں۔ ہر گناہ صغیرہ اگر بار بار کیا جائے تو گناہِ کبیرہ ہی بن جاتا ہے۔
تِجَارَةً بَيْنَكُمْ۔ تفسیر قمی میں ہے کہ اس سے مراد خرید و فروخت ہے جو حلال طریق سے کی جائے۔
لَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ۔ تفسیر قمی میں ہے کہ حضرت رسولؐ خدا کے ساتھ غزوات میں ایک شخص ایسا بھی جاتا تھا جو حضرتؐ کے حکم کے بغیر اکیلا ہی دشمن پر حملہ کر دیا کرتا تھا۔ خدا نے اُسے منع فرمایا کہ بغیر حکم رسولؐ اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالو۔
امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ کبائر کون کونسے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہر وہ گناہ جس پر اللہ نے عذابِ جہنم کا وعدہ کیا ہے کبیرہ ہے۔ تفسیر صافی میں ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ گناہانِ کبیرہ کی تعداد سات سو تک پہنچتی ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

اللہ نے جو ہم میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس نہ کرو (کیونکہ) فضیلت تو اعمال سے ہوتی ہے۔ مردوں کو ان کے کیے کا حصہ ملے گا اور عورتوں کو اپنے کیے کا۔ تم تو خدا سے اس کے فضل وکرم کی خواہش کرو بے شک اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔ ماں باپ ہوں یا قرابتداروں میں سے جو کوئی ترکہ چھوڑ جائے ہم نے ہر ایک کا ولی و وارث مقرر کر دیا ہے جن لوگوں سے تم نے پکا وعدہ کر لیا ہے اُن کا مقرر حصہ بھی دے دو بے شک اللہ ہر شے پر گواہ ہے۔

ایامِ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ لوگ جس کو لے پالک کرتے تھے اس کو اپنے وارثوں میں داخل سمجھتے تھے۔ خدا نے اس آیت میں اس کی ممانعت کر دی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اکثر لوگ حضرت رسولؐ پر اکیلے ایمان لاتے تھے اور باقی اقربا کافر رہتے تھے تو ان کی پریشانی دُور کرنے کے لیے حضورؐ نے مسلمانوں کے درمیان اخوت قائم کی۔ حضرت علیؓ کو خود اپنا بھائی بنایا۔ لیکن جب اُن کے اقربا مسلمان ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور ایک دوسرے کا وارث مقرر ہُوا۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

اللہ نے مردوں کو عورتوں پر قابو دیا ہے (انتظام کرنے کا اہل قرار دیا ہے) اس نے بعض کو (مردوں کو) بعض (عورتوں) پر فضیلت دی ہے اور انہوں نے ان (عورتوں) کے لیے اپنے اموال کو خرچ کیا ہے۔ پس جو عورتیں نیک ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور جس طرح اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے وہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔ اور جن عورتوں سے تمہیں نافرمانی کا اندیشہ ہو پہلے اُن کو سمجھاؤ اگر نہ مانیں تو ان کے پاس سونا چھوڑ دو۔ اگر اس پر بھی نہ مانیں تو ہلکی سی مار دو (خون نہ نکلے اور کوئی عضو نہ ٹوٹے) اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو تم بھی ان کے نقصان کی راہ نہ ڈھونڈو۔ اور یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔

مغربی تقلید کے دلدادوں میں یہ خیال بھی روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے کہ مردوں سے آگے عورتوں کو چلنا چاہیے کیونکہ وہ حسن و جمال کے علاوہ اور بہت سی باتوں میں مردوں سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ بہرحال اپنا اپنا خیال ہے اس چڑھی آندھی کو کون آتا رے۔ رہے ہم تو ہمیں بحیثیت مسلمان خدا کے قول ہی کی تائید کرنا ہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ چند باتیں بیان کر کے صاحبانِ عقل کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں:

(۱) فضیلت کا تعلق قوت سے ہوتا ہے چاہے جسمانی ہو یا روحانی۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بہ نسبت عورت کے مرد زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ حصولِ معاش میں وہ عورت سے زیادہ جدوجہد کرتا ہے اور ایسی سخت منزلیں طے کرتا ہے جس کے تصوّر سے عورت کانپ جاتی ہے۔ (۲) بہ نسبت عورت کے مرد قوی دل ہوتا ہے۔ عورت ذرا سی تکلیف میں رو پڑتی ہے، گھبرا جاتی ہے مرد تلواروں کی چھاؤں میں بھی نہیں گھبراتا۔ (۳) جنگ کے تمام محاذ مردوں کے زورِ بازو سے ہی فتح ہوتے ہیں۔ عورتوں کی کسی رجمنٹ نے آج تک یہ سعادت حاصل نہیں کی۔ (۴) سلطنتوں کا نظام ہمیشہ مردوں ہی سے متعلق رہا ہے۔ ہر ملک کا بادشاہ مرد ہی بنایا جاتا ہے اگر خال خال کہیں دو چار عورتیں نظر بھی آتی ہیں تو وہ حکم شاذ میں ہیں اور ان کے نظامِ سلطنت کو برقرار رکھنے والے مرد ہی ہوتے ہیں۔ (۵) علم میں سبقت لے جانے والے بھی مرد ہی ہوتے ہیں۔ جتنے نامور حکماء۔ فلاسفر۔ سائنسدان مصنفؒ مؤلف۔ موجد۔ ڈاکٹر۔ اطبّا وغیرہ گزرے ہیں وہ مرد ہی تھے اور اب بھی ان دائروں میں عورت کا وجود اگر پایا بھی جائے تو ایسا ہے جیسے آٹے میں نمک۔ (۶) عورت کی اخلاقی کمزوری کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ آج تک قدرت نے کسی عورت کو نبی یا امام نہیں بنایا۔ (۷) قدرت نے عورت کے فرائض میں بچّوں کی پرورش کرنا اور گرہستی میں لگا رہنا قرار دیا ہے اور مرد کے فرائض میں کسبِ معاش کرنا ہے۔ زمانہ کی ناہمواری سے معاملہ اُلٹا ہو جائے تو یہ انسانی عقل کی کمزوری ہی کہا جائے گا۔ (۸) رُوحانی ترقی میں بھی عورت مرد پر فوقیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کی زندگی کے بہت سے ایام اس کو عبادت کرنے سے محروم رکھتے ہیں۔ (۹) عورت کے اختیار میں اللہ تعالیٰ نے طلاق نہیں دی اس سے بھی اس کی عقل کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔ (۱۰) سب باتوں کو جانے دو، اوقاتِ مباشرت میں عورت کی جو پوزیشن ہوتی ہے وہ اس کا ناطق فیصلہ کر دیتی ہے کہ فوقیت کس کو ہے۔

نافرمان عورتوں کے لیے قدرت نے جو سزا تجویز کی ہے وہ فطرت کے مطابق ہے پہلے اُسے سمجھانا چاہیئے کہ نافرمانی کی صورت میں اُسے کیا کیا نقصان پہنچ سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسی کج فہم اور ناعاقبت اندیش ہے کہ اپنے نفع نقصان میں تمیز نہیں کر سکتی تو پھر اس کی دوسری سزا یہ ہے کہ مرد اس کے پاس سونا چھوڑ دے تاکہ غور کرے کہ مرد سے جدا ہو کر اس کی رات کیسی بے کیف ہو جاتی ہے۔ اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو پھر آخر یہ درجہ ہے کہ اُسے ہلکی مار دے یعنی ایسی کہ اس کے بدن سے خون نہ نکلے اور اس کی ہڈی نہ ٹوٹے۔ اگر اس کے بعد اطاعت کرنے لگے تو پھر اس سے اچھا سلوک کیا جائے ورنہ بدرجہ مجبوری طلاق دے کر اُسے جدا کر دیا جائے۔ یہ سب صورتیں اس لیے رکھی گئی ہیں کہ عورت نیک چلن رہے۔ اپنی آبرو کا تحفظ کرے۔ اپنے شوہر کے لیے بلائے جان نہ بنے اس کی رسوائی اور اپنی بدنامی کا باعث نہ ہو۔ نافرمان عورت کے ساتھ ایک مرد کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور وہ دماغی الجھن میں مبتلا ہو کر اپنی صحت کھو بیٹھتا ہے اور کسبِ معاش کے قابل نہیں رہتا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

اگر تمہیں میاں بی بی کے درمیان نااتفاقی کا قوی اندیشہ ہو تو (ان کے معاملات فیصل کرانے کے لیے) ایک مرد ثالث مرد کے کنبہ سے لو اور ایک عورت کے کنبہ سے اگر یہ دونوں ثالث میل کرا دینا چاہیں تو خدا ان کے درمیان میل کرانے کا اچھا بندوبست کر دے گا۔ خدا تو بے شک واقف و خبردار ہے۔

اگر میاں بی بی میں جھگڑا ہو جائے اور وہ دونوں آپس میں مصالحت کی کوئی صورت نہ نکال سکتے ہوں تو پھر یہ صورت اختیار کی جائے گی کہ ایک شخص مرد کے کنبہ سے بطور ثالث لیا جائے اور ایک عورت کے کنبہ سے۔ یہ دونوں مل کر بیٹھیں اور مرد و عورت دونوں کی شکایتیں سُن کر اس بات کی کوشش کریں کہ ان کے درمیان صلح ہو جائے۔ اگر ثالثوں کے فیصلہ کو وہ دونوں قبول نہ کریں تو آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ طلاق یا خُلع کے ذریعہ ان دونوں میں جُدائی کر دی جائے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

اللہ کی عبادت کرو اور اس کا شریک کسی چیز کو نہ بناؤ اور احسان کرو اپنے والدین۔ رشتہ داروں و یتیموں محتاجوں۔ رشتہ دار پڑوسیوں۔ اجنبی پڑوسیوں۔ پاس بیٹھنے والوں۔ پردیسیوں اور لونڈی غلام کے ساتھ۔ بے شک اللہ اکڑ کر چلنے والوں اور شیخی بازوں کو دوست نہیں رکھتا اور ان کو جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اس کو چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب مہیّا کر رکھا ہے اور جو لوگ دکھاوے کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ خدا ان کو بھی دوست نہیں رکھتا اور جس کا ساتھی شیطان ہے وہ بہت بُرا ساتھی ہے۔

یہ آیات ان کفارِ مکہ کے بارہ میں ہیں جنہوں نے آپس میں مشورہ کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو ایک کوڑی نہ دو تاکہ یہ پریشان ہو کر حضرتؐ کا ساتھ چھوڑ دیں اور دکھاوے کے طور پر دوسروں کو دیتے تھے اور شیخی مارتے تھے کہ ہمارے پاس بڑا مال ہے اگر تم ہم سے مل جاؤ تو ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے۔ حالانکہ یہ سب مکاری اور دھوکہ بازی تھی وہ کسی کی مدد کرنے والے نہ تھے وہ پکے بخیل تھے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

بھلا کیا مصیبت ان پر آجاتی اگر وہ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ خدا نے ان کو دیا ہے اس کو راہِ خدا میں خرچ کرتے اللہ تو ان سب کا حال جاننے والا ہے اللہ تو ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر کسی نے ذرا سی نیکی بھی کی ہے تو خدا اُسے دُونا کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بڑا ثواب عطا کرتا ہے۔ یہ دُنیا میں جو چاہیں کریں لیکن اس وقت اُن کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر گروہ کے گواہ طلب کریں گے اور اے رسول تم کو ان سب پر گواہ کی حیثیت سے بُلائیں گے اس دن جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور رسول کی نافرمانی کی ہے یہ آرزو کریں گے کہ کاش ہم پیوندِ خاک ہو جاتے اس روز یہ لوگ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا ۔ کی تفسیر میں وارد ہے کہ روز قیامت اللہ ہر امت کو اس کے رسول کے ساتھ بلائے گا اور رسول سے پوچھے گا تم نے ہمارے تمام احکام اپنی امت کو پہنچا دیئے تھے یا نہیں۔ وہ عرض کریں گے ہم نے تمام احکام بے کم و کاست ان لوگوں کو بتا دیئے تھے۔ اس وقت بہت سے لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے ہم تک کوئی حکم نہیں پہنچا۔ تب بطور گواہ سرکار حضرت رسولِ خدا کو بُلا کر پوچھا جائے گا آپ تصدیق کریں گے کہ ضرور پہنچائے تھے یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہی مصلحت تھی کہ خدا نے نورِ محمدیؐ کو ہر رسول کے ساتھ رکھا تاکہ وہ بحیثیت عینی گواہ کے گواہی دیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

اے ایمان والو نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک جو تم کہتے ہو اس کے سمجھنے کا ہوش نہ ہو اور نہ بحالت جنابت بغیر غسل کیے۔ مگر راہ میں رواروی میں جب غسل ممکن نہ ہو یا تم مریض ہو اور غسل کر نا نقصان دے یا سفر میں ہو یا پاخانہ نکل آئے یا عورتوں سے صحبت کی ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی پر تیمم کرلو۔

صلوٰۃ سے بعض لوگوں نے نماز مراد لی ہے اور بعض نے مقامِ نماز یعنی مسجد۔
اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ ۔ بحالتِ جنابت اس طرح مسجدوں سے گزرنا جیسے انسان راستہ سے گزرتا ہے ناجائز نہیں لیکن مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ سے اس طرح گزرنا بھی جنب پر حرام ہے۔ البتہ اس حکم سے حضرت رسولؐ خدا اور اُن کے اہلبیت مستثنیٰ ہیں۔ جیسا کہ حدیثِ رسولؐ سے ثابت ہے اور باتفاق فریقین ثابت ہے کہ تمام اصحابِ رسولؐ کے دروازے جو مسجدِ رسولؐ کی طرف کھلے ہوئے تھے بند کر دئے گئے تھے صرف حضرت علیؑ کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا۔
(مشکوٰۃ صہ ۲۹۶ سطر ۱۰ مطبوعہ نولکشور مع شرح مظاہر الحق)

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اور تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے منہ اور ہاتھوں پر مٹی بھرا ہاتھ پھیر لو بے شک خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

کیاتم نے ان لوگوں کے حال پر نظر کی جنہیں کتاب خدا کا کچھ حصّہ دیا گیا مگر وہ لوگ ہدایت کے بدلہ میں گمراہی خریدنے لگے ان کی خواہش یہ ہے کہ تم بھی راہِ راست سے بہک جاؤ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور دوستی کے لیے بس خدا کافی ہے۔ اے رسول یہود میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو باتوں میں ان کے محل وموقع سے ہیر پھیر ڈال دیتے ہیں اور اپنی زبان کو مروڑ کر اور دین پر طعنہ زنی کی راہ سے تم سے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (ہم نے سُنا اور نافرمانی کی) اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (تم میری سنو اور خدا تم کو نہ سنوائے) اور رَاعِنَا (میرا خیال کرو میرے چرواہے) کہا کرتے ہیں اگر وہ اس کے بدلے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سُنا اور مانا) اور اِسْمَعْ (میری سُنو) اور رَاعِنَا کے عوض اُنْظُرْنَا (ہم پر نگاہ رکھو) کہتے تو ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا اور بالکل سیدھی بات ہے مگر ان پر ان کے کفر کی وجہ سے خدا کی پھٹکار ہے چند لوگوں کے سوا وہ ایمان نہ لائیں گے۔

یہودی سب سے زیادہ اسلام کے دشمن تھے۔ شرارت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی وہ حضرتؐ کی خدمت میں آتے تو ایسے الفاظ بولتے جن کے دو معنی ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں ان سے کہا جاتا تو کہتے سَمِعْنَا (ہم نے سُنا) عَصَيْنَا (مگر ہم مانتے نہیں) پھر کہتے اِسْمَعْ یعنی ہم جو کہتے ہیں اس کو بھی تو سنئے پھر غَيْرَ مُسْمَعٍ کہتے، جس کے معنی ہیں خدا ہم کو نہ سنوائے۔ ایک معنی تو یہ ہوئے کہ تمہاری کوئی بُری بات سننے میں آئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ۔ اس طرح رَاعِنَا کو زبان سے اس طرح نکالتے کہ رَاعِیْنَا ہو جاتا یعنی اے ہمارے چرواہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے اہلِ کتاب (یہودی) جو کتاب ہم نے نازل کی ہے وہ تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے پس اس پر اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم تمہارے چہرے بگاڑ کر ان کو پشت کی طرف پھیر دیں یا ان پر اس طرح ہم لعنت کریں جیسے سبت والے یہودیوں پر ہم نے لعنت کی تھی اور خُدا کا حکم تو کیا ہوا ہی سمجھو۔

یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآن پر کیوں ایمان لائیں جبکہ اس کے احکام ہماری توریت کے خلاف ہیں ان سے کہا جارہا ہے کہ قرآن توریت کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس توریت کی نہیں جو تم لیے پھرتے ہو، تم نے تو اس میں بہت سے تصرفات کر لیے ہیں اس لیے قرآن ان سے کیسے موافقت کر سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع

خدا شرک کا گناہ کبھی نہیں بخشے گا ہاں اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔ جس نے شرک باللہ کیا اس نے افترا پردازی کر کے بہت بڑا گناہ کیا۔ اے رسول کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو بڑے مقدس بنے پھرتے ہیں (اس سے کیا ہوتا ہے) بلکہ خدا جسے چاہتا ہے مقدس بناتا ہے اور ظلم تو کسی پر بال برابر بھی نہ ہوگا۔ اے رسول ذرا دیکھو تو یہ لوگ خدا پر کیسے جھوٹ کے طوفان جوڑتے ہیں اور کھلم کھلا گناہ کے لیے یہی کافی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ۭ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾

اے رسولؐ تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا پھر بھی وہ شیطان اور بتوں پر ایمان لے آئے وہ کافروں سے کہتے ہیں جو لوگ قرآن پر ایمان لاتے ہیں ان سے زیادہ اچھا راستہ تو یہی ہے (جو ہم اختیار کیے ہوئے ہیں) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو اس کا تم مددگار کسی کو پاؤ گے ہی نہیں۔ کیا اس دنیا کی سلطنت میں کچھ دن ہی ان کا حصہ ہے وہ تو لوگوں کو پھوسی بھی نہ دیں گے۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ اُحد کی لڑائی کے بعد کعب بن اشرف یہودی ستر سواروں کے ساتھ رسول اللہؐ سے عہد شکنی کر کے کفارِ قریش کو آپؐ کے مقابلہ پر آمادہ کرنے کے لیے مکہ میں آیا۔ ابوسفیان نے اُسے کہا تم اور محمدؐ دونوں اہلِ کتاب ہو جب تک تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو گے ہمیں تم میں سے کسی کا اعتبار نہیں۔ کعب نے جبت اور طاغوت کو سجدہ کیا۔ پھر ابوسفیان نے کہا ہم حاجیوں کو اونٹوں پر چڑھا کر بھیجتے ہیں، ان کو کھانا پانی دیتے ہیں، حرم کی حرمت کرتے ہیں، بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ بھلا یہ بتاؤ ہمارا دین بہتر ہے یا محمدؐ کا۔ کعب نے خوشامد میں کہا کہ تمہارا ہی دین بہتر ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہودیوں کو یہ جلن کھائے جا رہی تھی کہ نبوت اولادِ اسحاقؑ سے ہٹ کر اولادِ اسمٰعیلؑ میں کیوں چلی گئی۔ (ماخوذ از ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب)۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

کیا یہ لوگ اُن سے حسد کرتے ہیں جن کو ہم نے اپنے فضل سے عطا کیا ہے ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت دی اور ہم نے ان کو ملکِ عظیم عطا فرمایا پس ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس پر ایمان لے آئے اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس سے رُک گئے پس ان کے لیے جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

شیعی تفاسیر میں بالاتفاق امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس آیت میں النّاس سے مراد ہم اہلبیت ہیں جن سے لوگوں نے حسد کیا۔ صواعق محرقہ میں بھی امام کا یہ قول نقل ہے۔

اخلاق ذمیمہ میں سب سے بُری عادت حسد کی ہے۔ خدا نے حاسدوں کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اہلبیتؑ رسولؐ کمالاتِ رُوحانی اور عطیاتِ یزدانی کی بنا پر ہمیشہ محسودِ خلائق رہے چونکہ لوگ ان کے مراتب کے کسی پایہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے لہٰذا حسد کی آگ میں جل کر انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیمؑ پر اگرچہ اپنی بیشمار نعمتیں نازل کیں لیکن اُن میں سب سے زیادہ نعمتوں کا نزول آلِ رسولؐ پر ہوا۔ اسی وجہ سے آلِ ابراہیمؑ میں ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔

اس آیت میں سب سے پہلی نعمت جس پر لوگوں کو حسد ہوا وہ کتاب کا ملنا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے آلِ ابراہیمؑ پر جو نسلِ جنابِ اسحاقؑ سے تھے توریتؑ زبور و انجیل جیسی کتابوں کے علاوہ اور بہت سے صحیفے بھی آئے۔ مگر نسلِ جنابِ اسمٰعیلؑ میں حضرت رسولِ خداؐ پر جو کتاب نازل ہوئی اس کو اپنی خصوصیات کی بنا پر سابق میں نازل ہونے والی کتابوں پر فوقیت و برتری حاصل ہوئی۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کے سوا کسی کتاب سے تحدی نہیں کی گئی یعنی کسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ نہیں تھا کہ ایسی کتاب اگر تم میں قدرت ہے تو لا کر دکھاؤ۔ پوری کتاب نہیں تو دس ہی سورے بنا کر دکھاؤ۔ یہ بھی نہیں تو کم سے کم ایک سورہ لے آؤ۔ دوسرے یہ کہ اس کے احکام بلاتغیر و تبدّل قیامت تک باقی رہنے والے ہیں پس کتنا صاحبِ فضیلت ہے وہ شخص جس کے سینہ میں پوری کتاب کا علم ہو جو اس کا حافظ و نگہبان ہو۔ جس کی مثل اُمتِ محمدیؐ میں بلحاظ عالمِ کتاب ہونے کے پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ فضیلت خدا نے علی علیہ السلام کو عطا فرمائی۔ اور اس فضیلت کی بنا پر وہ محسودِ خلائق ہوئے۔

دوسری چیز جو خدا نے آلِ ابراہیمؑ کو دی وہ حکمت ہے جس میں حکمتِ نظری اور عملی دونوں شامل ہیں۔ خدا فرماتا ہے وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ اس فضیلت میں بھی کوئی حضرت علیؑ کا ہمسر نظر نہیں آتا جس کا ثبوت یہ ہے کہ علیؑ کے سوا کسی کے لیے رسولؐ نے یہ نہیں فرمایا اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا (یعنی میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ دروازہ ہیں)۔ حکمتِ نظری میں عدیم المثال ہونے کا ثبوت آپ کے وہ خطبات ہیں جن کا مثل آج تک کسی عالم سے نہ بن پڑا۔ خدا کے کلام کے بعد اگر حکمتِ نظری سے فیض یاب ہونے کی کسی کو خواہش ہو تو وہ امیر المومنینؑ کے خطبات کو غائرانہ نظر سے پڑھے۔ حکمتِ عملی کی علمائے اخلاق نے فضائل چہارگانہ کے تحت جو انواع لکھی ہیں وہ سب فضائل حضرت علیؑ کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اور قرآن میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "اہلبیتؑ و منازلِ روحانیت" میں تفصیل سے ان کا ذکر کر دیا ہے۔

اب رہا ملکِ عظیم پر حکومت کرنے والا، اولادِ جناب اسحاقؑ میں جناب یوسفؑ، جناب داؤدؑ، جناب سلیمانؑ کو جو سلطنتیں ملیں وہ محدود تھیں جن کو ملکِ عظیم نہیں کہا جا سکتا۔ ان سے کہیں بڑی سلطنتیں آج دنیا میں موجود ہیں۔ ملکِ عظیم کا اطلاق تو اس سلطنت پر ہوگا جو مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیلی ہوئی ہو اور ہر خطۂ زمین پر ایک ہی حکمران کا حکم چلتا ہو اور ساری دنیا میں ایک ہی دین ہو۔ اس عظیم الشان سلطنت کے مالک اولادِ ابراہیمؑ میں ہمارے امام آخر الزمان حضرت حجت عجل اللہ فرجہ ہوں گے جو روئے زمین کو عدل و داد سے اس طرح پُر کر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔
یہی ہیں وہ محسودِ خلائق لوگ جن کی محبت کو خدا نے واجب کر دیا ہے جو ان کی امامتؑ و ولایت کو تسلیم نہ کریگا اسکی سزا جہنم ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۵۸﴾

جنہوں نے ہماری بات سے انکار کیا ہم عنقریب انہیں جہنم میں جھونک دیں گے۔ جب ان کی کھالیں آگ کی تپش سے گل جائیں گی تو ہم دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ اچھی طرح عذاب کا مزہ چکھ لیں بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اچھے اچھے کام کیے ہیں ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ وہاں اُن کے لیے صاف ستھری بیبیاں ہوں گی اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں لے جا کر رکھیں گے۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے مالکوں کے سپرد کر دو اور جب لوگوں کے فیصلہ کرنے والے بنو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ اللہ تم کو اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں صاحبانِ حکومت ہوں ان کی۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ و رسول کی طرف رجوع کرو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

اس بارہ میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اولی الامر سے مراد کون ہیں۔ کوئی کہتا ہے بادشاہانِ وقت مراد ہیں کوئی کہتا ہے امرائے سرایا مراد ہیں۔ کوئی کہتا ہے علمائے وقت مراد ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے وہ معصوم ہستیاں مراد ہیں جو اہلبیت رسولؐ کہلاتی ہیں لہٰذا ہم اس پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ اس آیت میں لفظ اطیعوا دو جگہ لایا گیا ہے۔ پہلے سے مراد اللہ کی اطاعت ہے دوسرے اطیعوا کے تحت میں دو اطاعتیں ہیں۔ ایک رسولؐ کی دوسرے اولی الامرؑ کی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسولؐ کی اطاعت، اطاعتِ مطلقہ ہے یعنی ہر امر میں ان کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ دنیوی معاملات ہوں یا دینی اسی طرح اولی الامر کی اطاعت ہے۔

۲۔ اولی الامر کی اطاعت اس وقت تک اطاعتِ مطلقہ نہیں ہو سکتی جب تک وہ رسولؐ کی طرح معصوم نہ ہوں کیونکہ غیر معصوم کی اطاعت باعثِ فتنہ و فساد ہو گی۔

۳۔ اصحابِ رسولؐ میں سے سوائے اہلبیتِ رسولؐ نہ کسی نے خود معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے نہ کسی کو اُمت نے بنایا ہے۔

۴۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت وقتی نہیں کسی ایک جماعت سے مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک باقی رہے گی۔ آپس میں جھگڑے ہمیشہ ہوتے رہیں گے لہٰذا اگر رسولؐ موجود نہ ہوں تو اولی الامر میں سے کم از کم ایک شخص ہر زمانہ میں ضرور موجود رہنا چاہیئے تاکہ عدل و انصاف سے بے غرض ہو کر ہر نزاع کا فیصلہ کرے۔

۵۔ دینی مسائل میں اگر اختلافی صورت پیدا ہو تو اس کا فیصلہ یا تو رسولؐ کر سکتے تھے یا پھر اولی الامر۔ یہ کام علماء کے بوتے کا نہیں کیونکہ ان کے درمیان تو ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور رہے گا۔

۶۔ اگر اولی الامر سے مراد بادشاہانِ وقت ہوں تو اسلام کا بیڑا غرق ہو جائے گا کیونکہ کہیں عیسائی بادشاہ ہے کہیں بودھ کہیں ہندو کہیں مسلمان۔ ایسی صورت میں کس کی اطاعتِ مطلقہ کی جائے گی اور اگر سب کی اطاعت کی جائے تو یہ ناممکن۔

۷ - اگر کہا جائے کہ صرف مسلمان بادشاہوں کی اطاعت کی جائے تو مسلمان بادشاہ ظالم۔ فاسق۔ فاجر ہر قسم کے ہوئے ہیں ایسی صورت میں ان کی اطاعتِ مطلقہ کیسے ہوسکتی ہے۔

۸ - رہے امرائے سرایا تو وہ بھی معصوم نہ تھے۔ ان سے بار بار غلطیاں ہوئی تھیں۔ فوجیوں کو ان سے شکایات رہتی تھیں وہ لوگوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ غارتگری کرتے تھے۔ زناکاری کرتے تھے۔ اس صورت میں ان کی اطاعتِ مطلقہ کا حکم کیسے دیا جاسکتا تھا۔

۹ - رہے علماء تو ان حضرات کی مہربانی سے ایک دین تہتر فرقوں میں تقسیم ہوا اور رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا بہتر دوزخ میں جائیں گے اس صورت میں کس فرقہ کے علماؑ کی اطاعت تمام مسلمان کریں گے۔ اس مصیبت سے بچانے کے لیے رسولؐ اللہ نے صاف لفظوں میں اپنی امت کو بتادیا کہ میرے اہلبیتؑ کی مثال سفینہ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا نجات پاگیا اور جس نے رُوگردانی کی ڈوب گیا اور ہلاک ہوگیا۔

۱۰ - رسولؐ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مرگیا کہ اُس نے اپنے امامِ زمانہ کو نہ پہچانا وہ کفر کی موت مرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے اور اس کی معرفت اُس زمانہ کے لوگوں پر واجب ہے۔ نیز یہی ولی امر کہلاتا ہے ہر شب قدر ملائکہ احکامِ الٰہی اس کے پاس لے کر آتے ہیں جو نہیں مانتے وہ بتائیں کہ شب قدر جو ہر سال آتی ہے اس میں ملائکہ کس پر نازل ہوتے ہیں۔ رسولؐ کے بعد سے اب تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ غیر معصوم کے پاس ملائکہ آتے ہی نہیں اور نہ وہ اس کا اہل ہے کہ احکامِ الٰہی اس پر نازل ہوں۔

۱۱ - آیت بتاتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں نزاعی شکل پیدا ہو تو اس میں اللہ کی طرف رجوع کرو یا رسولؐ کی طرف یعنی کتابؐ سنت کی طرف۔ لیکن کتاب و سنت یعنی احادیث خاموش ہیں۔ ان سے ہر شخص اپنے مقصد کے مطابق دلیل لاتا ہے۔ جب دونوں فریق قرآن و حدیث سے اپنی اپنی دلیلیں پیش کر رہے ہوں تو اس کا فیصلہ کون کرے کہ حق کس طرف ہے۔ عقلی فیصلہ یہی ہوگا کہ ان کے درمیان حق فیصلہ کرنے والا وہی ہوگا جو معصوم ہو اور قرآن و حدیث کا سب سے بڑا عالم ہو۔ اور رسولؐ نے جس کو اپنے بعد ایسے مسائل حل کرنے کا ذمہ دار بنایا ہو۔ جس کا فیصلہ ہر اَمر میں ناطق ہو۔ یعنی فیصلہ میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ پس ایسا شخص اہلبیت رسولؐ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان کا علم وہبی تھا اکتسابی نہ تھا۔ وہبی علم میں غلطی واقع نہیں ہوتی۔ سامنے کی مثال ہے کہ حضرت علیؑ نے ہزارہا فیصلے عہدِ رسالت سے لے کر اپنی سلطنت کے آخر تک کیے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت نہ کیا گیا حالانکہ ان کے دشمن اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کوئی غلط فیصلہ ان سے صادر ہو۔

۱۲ - ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کی اطاعت نہ کرنے سے کوئی کافر نہیں ہوسکتا لیکن امام زمانہؑ کی اطاعت نہ کرنے والا کفر کی موت مرتا ہے۔ جیساکہ حدیث مَنْ مَاتَ سے ظاہر ہے۔

۱۳ - خدا فرماتا ہے اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (اے رسول تم ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے)۔ لہٰذا اُس ہادی کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہونی چاہیئے۔

۱۴ - اہلبیتؑ رسولؐ کا معصوم ہونا آیتِ تطہیر سے ظاہر ہے بس جب وہ طہارت میں شریکِ رسولؐ ہیں تو رسولؐ کی طرح معصوم ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اطاعت رسولؐ کی سی اطاعت ہے۔

۱۵ - اولی الامر کا اطلاق بارہ اماموں پر ہوتا ہے جن کے نام ایک ایک کرکے آنحضرتؐ نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ کو بتادیئے تھے۔

۱۶ - کوئی یہ نہ کہے کہ جب ان کی اطاعت مثل اطاعتِ رسولؐ امت پر واجب تھی تو ان کے نام کیوں نہ ذکر کیے تو جواب ہے کہ جہاں ذکر کیا تھا وہ کب رہ گئے جو یہ رہ جاتے دوسرے قرآن میں تو بہت سی چیزیں ذکر نہیں کی گئیں جیسے رکعات نماز۔ زکوٰۃ کا نصاب۔ مناسکِ حج۔ پس جیسے ان باتوں کو رسولؐ سے پوچھا گیا اسی طرح اولی الامر کو بھی معلوم کرنا امت کا فرض تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲

اے رسول تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی نظر کی جن کا گمان یہ ہے کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل ہوچکی ہیں لیکن چاہتے یہ ہیں کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں اچھی طرح گمراہ کردے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو ذرا ان منافقوں کو دیکھو کس طرح تم سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور جب ان کے کرتوتوں سے کوئی مصیبت ان پر آن پڑتی ہے تو کیسے تمہارے پاس خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو میل ملاپ کے سوا کچھ نہ تھا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں جو کچھ ہے خدا اس کو جانتا ہے پس اے رسول تم ان سے درگزر کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان سے ان کے دل میں اثر کرنے والی بات کہو ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے جن لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اگر تمہارے پاس چلے آتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور اے رسول تم بھی ان کی مغفرت چاہتے تو بے شک وہ لوگ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

ایک بار دس بارہ آدمیوں نے نفاق پر اتفاق کیا خدا نے اپنے رسولؐ کو اس کی خبر دے دی آپؐ نے ان سب کو بلایا اور فرمایا تم میں سے جن بارہ آدمیوں نے نفاق پر اتفاق کیا اگر وہ اٹھ کر آئیں اور اپنی مغفرت چاہیں تو میں ان کے لیے خدا سے سفارش کروں مگر وہ لوگ نہ اٹھے اور اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ حضرتؐ نے فرمایا تم یہ جانتے ہو کہ میں تمہارے ناموں سے بے خبر ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک ایک کے نام بتا دئے اور وہ ذلیل و رسوا ہوئے اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ آیت نمبر ۶۰ سے لے کر نمبر ۶۴ تک منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے یہ بظاہر مسلمان تھے لیکن حقیقتاً یہ اسلام کے لیے مارِ آستین بنے ہوئے تھے۔ یہ دشمنانِ اسلام سے مل کر اسلام کی برائیاں کرتے تھے اور جب ان کی پردہ دری ہوتی تھی تو جھوٹی قسمیں کھاتے تھے۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ رسول اللہؐ سے جا کر کہو وہ تمہارے لیے استغفار کریں تو راضی نہ ہوتے تھے۔ لوگوں کو اسلام لانے سے روکتے تھے۔ غرض ان منافقوں نے اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِــيْمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْھُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰھُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مؤمن نہ ہوں گے تا وقتیکہ آپس کے جھگڑوں میں تمہیں اپنا حاکم نہ بنائیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں بلکہ بخوشی اس کو مان لیں۔ اگر ہم بنی اسرائیل کی طرح ان پر یہ حکم جاری کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کر ڈالو یا شہر بدر ہو جاؤ تو چند آدمیوں کے سوا یہ لوگ اس کو کرتے ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ اس بات پر عمل کرتے جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور پوری طرح ثابت قدم رہتے تو اس صورت میں ہم بھی اپنی طرف سے جو عطیہ عطا کرتے اور سیدھے راستے کی طرف ان کو ہدایت کرتے۔

منافقوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی سے جھگڑا کرتے تو یہ دکھانے کے لیے کہ ہم سچے مسلمان ہیں اور اپنے معاملات کا فیصلہ رسولؐ سے چاہتے ہیں حضرتؐ کی خدمت میں آکر اپنا مقدمہ پیش کرتے اور جب اپنے خلاف فیصلہ سنتے تو آزردہ خاطر ہوتے اور آپس میں کہتے رسولؐ نے ہمارے حق میں غلط فیصلہ دیا ہے۔ اور اسے ماننے پر ان کا دل راضی نہ ہوتا۔ اگر مجبوراً اس پر عمل کرنا پڑتا تو بہت کچھ منہ بناتے اور اظہارِ ناخوشی کرتے۔ بنی اسرائیل کی طرح اگر ان کو سخت احکام پر عمل کرنے کے لیے کہا جاتا تو یہ منافق ان کو کبھی نہ مانتے اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتے۔ غرض یہ ہے کہ اسلام نے ان کے دلوں میں جگہ پکڑی ہی نہیں۔ یہ تو اپنے کسی فائدہ کے پیشِ نظر بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

جواللہ ورسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کو اللہ نے اپنی نعمتیں دی ہیں - یعنی انبیاء - صدیقین - شہید اور صالحین - اور یہ کیسے اچھے ساتھی ہوں گے یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ جاننے کے لیے کافی ہے -

خصوصیت سے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں نازل کیں وہ چار گروہ ہیں - ان میں سے پہلے حضرات انبیاءؑ ہیں - اگرچہ مادی ساز و سامان اور آرائش و زیبائش، راحت و آرام سے ان حضرات کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن روحانی مدارج و مراتب حاصل کرنے میں یہ سب سے آگے ہوتے ہیں -
دوسرا درجہ صدیقوں کا ہے جو انبیاء کی صدق دل سے تصدیق کرتے ہیں - تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو راہ خدا میں شہید ہوتے ہیں - چوتھا درجہ خدا کے ان نیک بندوں کا ہے جن کی ساری زندگی اعمالِ خیر بجالانے میں بسر ہوتی ہے -
ایک حدیث میں ہے کہ اس آیت میں نبیین سے مراد حضرت رسولِ خداؐ ہیں اور صدیقین سے مراد حضرت علیؑ ہیں اور شہداء سے مراد حسنین علیہما السلام ہیں اور صالحین سے مراد باقی ائمہ ہیں - جمع کے صیغے بلحاظ تعظیم لائے گئے ہیں -
کسی نبی یا رسول کا گھرانہ ایسا نہیں ملتا جس میں نعمت پانے والوں کی یہ سب اصناف موجود ہوں - سوائے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس گھر میں صرف نبی ہی نہیں سیّد الانبیاءؑ تھے - صدیق ہی نہیں بلکہ صدیق اکبرؑ تھے - شہید نہیں بلکہ سیّد الشہداءؑ تھے - صالح نہیں بلکہ صالح المؤمنین تھے -
صواعق محرقہ میں ہے کہ صدیق تین ہیں - مومن آل فرعون حزقیلؑ جو حضرت موسیٰؑ پر سب سے پہلے ایمان لائے - حبیبؓ النجار جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے - اور حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام جو حضرت رسولِ خداؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے - اسی لیے حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے اَنَا عَبْدُ اللّٰهِ اَنَا اَخُوْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ لَا يَقُوْلُهَا بَعْدِيْ اِلَّا كَاذِبٌ مُّفْتَرٍ - (میں خدا کا بندہ ہوں میں رسولؐ اللہ کا بھائی ہوں میں سب سے بڑا صدیق ہوں اور میرے بعد اس کا دعویٰ نہ کرے گا مگر جھوٹا افتراپرداز)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

اے ایمان والو، جہاد کے وقت اپنی حفاظت کی صورتیں سوچ لو پھر چاہے تھوڑے تھوڑے ہو کر لڑو یا سب مل کر تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جہاد سے پیچھے ہٹیں گے - اگر تم پر کوئی مصیبت آپڑی تو لگے کہنے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان مسلمانوں کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کامیابی ہوئی اور دشمن پر غالب آئے تو اس طرح اجنبی بن گئے گویا تم میں اور اس میں کبھی محبت ہی نہ تھی کہنے لگا کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا پس ان لوگوں کو راہِ خدا میں جہاد کرنا چاہیئے جو آخرت کے لیے اپنی جان تک راہِ خدا میں دے ڈالتے ہیں - جس نے راہِ خدا میں جہاد کیا تو وہ شہید ہوا یا غالب آیا ہر حالت میں ہم اس کو اجرِ عظیم عطا کریں گے -

خدا کے نزدیک شہید کا اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور کیوں نہ ہو جبکہ وہ جان جیسی عزیز تر چیز راہِ خدا میں اور دینِ خدا کی حفاظت میں بخوشی خاطر قربان کر دیتا ہے - اس کے خون کے ہر قطرہ کی قیمت جنت ہے اور اس کے زخمی بدن کی ہر تڑپ پر رحمتِ الٰہی اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور مرضئ الٰہی اس کی ہر سانس کی قیمت بن جاتی ہے - منافق ان کا مرتبہ سمجھتے ہی نہ تھے وہ تو مالِ غنیمت کے بھوکے تھے -

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾

اے مسلمانو، تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں کمزور مردوں اور عورتوں اور بچّوں کو کفّار کے مظالم سے بچانے کے لیے جہاد نہیں کرتے (جو حالتِ مجبوری میں) کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور کسی کو اپنی طرف سے ہمارا مددگار بنا۔ جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو اور یہ سمجھ کر لڑو کہ شیطان کا داؤ بہت کمزور ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے ہجرت کرکے مدینہ آنے کے بعد جو مسلمان مرد عورتیں اور بچے مکّہ میں رہ گئے تھے کفّار ان کو ہر طرح سے ستاتے تھے اور وہ بیچارے رات دن خدا سے دُعائیں کیا کرتے تھے کہ ہمارے پروردگار ہمیں ان ظالموں کے ظلم سے نجات دے ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ منجملہ ان کے میں اور میری ماں بھی تھیں یہ ہر وقت دعا کرتے رہتے تھے اس پر اللہ نے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ آخر خدا نے ہماری دعائیں قبول کیں اور کچھ لوگوں کے لیے ہجرت کی راہیں کھل گئیں اور جو باقی رہ گئے تھے روزِ فتح مکّہ حضرتؐ نے ان کی دل دہی کی۔ اور عتابؓ بن اسعد کو مکّہ کا حاکم بنایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

اے رسول تم نے ان کی حالت پر نظر نہیں کی جو جہاد کی آرزو کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ابھی ہاتھ روکے رکھو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو لیکن جب ان پر جہاد واجب کیا گیا تو ان میں سے ایک فریق لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسا کہ خدا سے ڈرنا چاہیئے بلکہ اس سے زیادہ ڈرا۔ اور کہنے لگے اے ہمارے رب تو نے ہم پر جہاد کو کیوں واجب کیا۔ ہمیں کچھ دنوں کی اور مہلت کیوں نہ دی۔ ان سے کہہ دو دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے اس کے لیے آخرت سب سے بہتر چیز ہے اور ان پر وبال ریشہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آیات ان لوگوں کی شان میں نازل ہوئیں کہ جب تک جہاد واجب نہ ہوا تھا بڑی ڈینگیں مارا کرتے تھے اور اپنی بہادری اور لڑائی کی خواہش کو خوب خوب اُچھالا کرتے تھے لیکن جب جہاد واجب ہوا تو لگے بغلیں جھانکنے کبھی تو کوئی حیلہ حوالہ کرکے میدانِ جنگ میں جانے سے رُک جاتے اور اگر شرما شرمی چلے جاتے تو ایسے الگ تھلگ رہتے کہ دُور کے تیر سے بھی بچے رہیں۔ نہ کسی کو مارتے نہ اپنے بدن پر ہلکا سا چرکا لیتے۔ جب خیریت سے واپس آتے تو اپنی بہادری کے افسانے عورتوں اور بچّوں کے سامنے بیان کرتے۔ میں نے وہ جنگ کی کہ دشمن کے چھکّے چھوٹ گئے۔ بس میدانِ جنگ میں میرا ہی بول بالا تھا۔ میں تو دشمن کے پیچھے بھاگا چلا جاتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی زخم نہ کھایا اور دشمنوں کے خون سے زمین لال کر دی۔ لشکرِ رسولؐ میں یہ منافقین محض اس لیے شامل ہوتے تھے کہ مالِ غنیمت میں سے بھرپور حصہ لیں گے۔ چنانچہ جب شکست کے آثار نظر آتے اور مالِ غنیمت ملنے کی اُمید نظر نہ آتی، تو تنکا توڑ کر بھاگ نکلتے اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھتے۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ؗ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۷۹﴾ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ﴿۸۰﴾ؕ

(یاد رکھو) تم چاہے کیسے ہی مضبوط برجوں کے اندر ہو موت تم کو پکڑ ہی لے گی۔ اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تب تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو شرارت سے کہتے ہیں اے رسول یہ تمہاری طرف سے ہے۔ تم ان سے کہہ دو جو کچھ ہے سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات نہیں سمجھتے (حقیقت یہ ہے) کہ جو بھلائی تم کو پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ خود تمہارے نفس کی طرف سے ہے۔ اور ہم نے تم کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور خدا کی گواہی کافی ہے جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو اے رسول ہم نے تم کو ان کا کچھ نگہبان بنا کر تو بھیجا نہیں۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس زمانہ میں سالہائے گزشتہ کے مطابق مدینہ میں میوہ زیادہ پیدا نہ ہوا اور غلّہ کا بھاؤ بھی بڑھ گیا۔ یہودیوں کو شرارت سوجھی، کہنے لگے یہ سب محمدؐ کے یہاں آنے کے سبب سے ہے خدا نے ان کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے یہ آیت نازل کی اور مسلمانوں کو بتایا، کہ ان یہودیوں کا یہ حال ہے کہ جب غلّہ کی فراوانی ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ سب اللہ کا فضل ہے اور جب قحط اور تنگدستی کا سامنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں اے محمدؐ، یہ تمہاری وجہ سے ہے۔ اے رسولؐ تم ان سے کہہ دو ارزانی ہو یا گرانی، تونگری ہو یا مفلسی، سب خدا کی مشیت کے تحت ہے کسی کو اس میں مداخلت نہیں۔

یہ یہودی بے وقوف ہیں، بات کو سمجھتے نہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان کو جو آرام و آسائش حاصل ہوتی

ہے یہ اس پر خدا کا فضل ہوتا ہے۔ خدا ہر قسم کا آرام و آسائش بغیر کسی استحقاق کے دیتا ہے۔ کیونکہ انسان جو عبادت کرتا ہے وہ خدا کی نعمتوں کے برابر نہیں اور جو مصیبت پہنچتی ہے وہ انسان کی بداعمالی اور بدنفسی کی وجہ سے پہنچتی ہے۔

واضح ہو کہ خدا نے پہلے اس تعلیم کو مجملاً بیان فرمایا ہے کہ کُل خدا کی جانب سے ہے لیکن بعد میں اس کی وضاحت یُوں کی کہ جملہ حسنات خدا کے فضل پر موقوف ہیں اور تمام برائیاں شامتِ اعمال کا نتیجہ ہیں یعنی ہر برائی یا بھلائی خدا کی طرف سے تو ضرور ہے مگر اتنا فرق ہے کہ بھلائی اس کے فضل و کرم سے ہوتی ہے اور برائی بندوں کے گناہ کے عوض اس لیے حضرت رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ کسی مومن کو رنج نہیں پہنچتا یہاں تک کہ بدن میں کانٹا تک نہیں چبھتا۔ اور جُوتے کا تسمہ تک نہیں ٹوٹتا جب تک کہ معصیت کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے اگر وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے گا تو فضلِ خدا شاملِ حال رہے گا۔ نافرمانی کرے گا تو اس کی سزا ملے گی۔ اگرچہ معصیت کا نزول خدا کی طرف سے ہے لیکن اس کا سبب خود انسان ہے نہ برائی کرتا نہ بلا میں مبتلا ہوتا۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ بھلائی بُرائی سے بندوں کے افعال مراد نہیں بلکہ زحمت و رحمت آرام و تکلیف مراد ہیں جو انسان کے اختیار و قابو سے باہر ہے۔

یہ لوگوں کی سمجھ کا پھیر ہے کہ بداعمالی تو خود کرتے ہیں اور جب اس کی سزا ملتی ہے تو کہتے ہیں ہماری تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ اگر مدینہ کے غلّہ میں کمی ہوئی یا میوہ دار درخت کم پھل لائے تو یہ اہلِ مدینہ کی نافرمانی اور کفر پرستی کی سزا تھی اور ان کی نیّت کا فتور تھا۔

کسی نبیؑ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ دو شخصوں نے برابر باغ لگائے۔ ایک باغ کے درخت خوب پھلے پھولے دُوسرے کے باغ میں جو پھل لگے تھے وہ بھی گر گئے۔ اس نے اُن نبیؑ سے شکایت کی کہ ہم دونوں تو آپ کے دین میں ہیں، کیا وجہ کہ فلاں کا باغ تو خوب پھل لایا اور میرے باغ میں کچھ بھی نہ آیا۔ نبیؑ نے دُوسرے شخص کو بھی بُلایا اور فرمایا تو نے کیا نیت کی تھی۔ اس نے کہا میری نیت یہ تھی کہ اگر میرا باغ خوب پھلے گا تو میں اس کا پھل فروخت کر کے آدھی رقم تو اپنے خرچ میں لاؤں گا اور آدھی راہِ خدا میں اپنے غریب بھائیوں کو دوں گا۔ دُوسرے سے پوچھا، تیری کیا نیت تھی۔ سچ سچ بتا۔ اس نے کہا میری نیت یہ تھی کہ جو پھلوں کی قیمت حاصل ہو گی اس کا روپیہ سُود پر چلاؤں گا۔ اور اس طرح غریبوں کی کمائی سے اپنے شہر کا متموّل آدمی بن جاؤں گا۔ نبیؑ نے فرمایا بس یہی وجہ تھی کہ تیرے باغ میں پھل نہ لگا۔ تیری نیت خراب تھی، پھر خدا تیرے اُوپر اپنا فضل و کرم کیوں نازل کرتا۔ پس ان آیات کا تعلق افعالِ عباد سے نہیں بلکہ ان تفضلات سے ہے جو نیکی کرنے والوں سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کا رُک جانا اس کی دلیل ہوتا ہے کہ اس شخص کی نیت میں بدی ہے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ زفَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ط وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ج فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ط وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ط وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ط وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

وہ لوگ جب تمہارے سامنے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم فرمانبردار ہیں اور جب تمہارے پاس سے جاتے ہیں تو راتوں کو اپنے گروہ کے لوگوں سے جو کچھ تم سے کہہ گئے تھے اس کے خلاف مشورہ کرتے ہیں اللہ لکھ لیتا ہے ان کے راتوں کی باتوں کو۔ ان سے درگزر کرو اور اللہ پر توکل کرو اللہ تمہاری وکالت کے لیے کافی ہے کیا یہ لوگ قرآن کے متعلق اتنا نہیں سوچتے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے بیان میں بڑا اختلاف پاتے۔ جب ان مسلمانوں کے پاس کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اُسے فوراً مشہور کر دیتے ہیں۔ اگر اس امر میں وہ رسول اور اولی الامر کی طرف رجوع کرتے تو جو لوگ اس کی تحقیق کرنے والے ہیں (رسول و اولی الامر) تو وہ اس کو سمجھ لیتے۔ اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب سوائے چند آدمیوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

شانِ نزول یہ ہے کہ جب حضرت رسولِ خداؐ نے جنگِ بدرِ صغریٰ کا قصد کیا تو نعیم نے مسلمانوں کو ابوسفیان کے لشکر کی کثرت سے ڈرا دیا اور مسلمانوں کے دل پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اکثر لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔

آخر بمشکل ستر آدمی آپؐ کے ساتھ ہوئے اور آپؐ توکل بخدا روانہ ہوئے خدا نے اس مٹھی بھر جماعت کا ایسا رعب ابوسفیان کے دل پر بٹھایا کہ وہ مکہ کو واپس چلا گیا۔ اللہ اللہ وہ کیسا وقت تھا کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کو تنِ تنہا ہزاروں سے جہاد کرنے کا حکم دیا اگر کوئی بھی آپؐ کا ساتھ نہ دیتا تو بھی آپؐ ضرور جاتے اور یقیناً فتحیاب ہوتے۔

تفسیر صافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ استنباط کرنے والے ائمہ معصومین ہیں یہی اولی الامر ہیں۔ اور حضرت نے یہ بھی فرمایا۔ جس نے خدا کی ولایت اور اللہ تعالیٰ کے علم سے استنباط کرنے والوں کو انبیاء کے گھروں کے سوا کسی اور جگہ قرار دیا۔ اس نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی اور جاہلوں کو اولی الامر سمجھا جو خود ہدایت یافتہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

مقدمات کو ترتیب دے کر صحیح نتیجہ وہی نکال سکتا ہے جس کا علم نقصان سے بری ہو اور یہ لوگ نہیں ہو سکتے ان لوگوں کے سوا جن کا علم وہبی ہو۔

مذکورہ بالا واقعہ میں ایک شخص نے غلط افواہ پھیلا کر مسلمانوں کے قلوب کو کیسا مرعوب کیا۔ اگر اس کی خبر سُن کر سننے والے رسولؐ یا حضرت علیؑ کے پاس چلے آتے تو یہ افراتفری نہ ہوتی مگر انہوں نے تو آپس میں ایک دوسرے سے چُپ چاپ تذکرہ کر کے ہل چل مچا دی۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اولی الامر کون ہیں۔ منافقوں کی یہ عادت تھی کہ ہر اس خبر کو جس سے مسلمان خائف ہو جائیں چپکے چپکے پھیلانا شروع کر دیتے۔ مسلمان بے چارے اس کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے اسلام سے بددل ہو جاتے اور جہاد پر جانے سے پہلوتہی کرنے لگتے۔ سننے والوں کو چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ خبر سنتے ہی سیدھے یا تو رسولؐ کے پاس آتے یا اولی الامر یعنی حضرت علیؑ کے پاس جاتے اور ان سے بیان کرتے کہ ہم نے ایسا ایسا سُنا ہے۔ چونکہ ان حضرات کو خدا نے عقلِ صحیح عطا فرمائی تھی اور معصوم تھے لہٰذا وہ اس کی جانچ پڑتال کرتے۔ خبر لانے والے کی شخصیت پر غور کرتے کہ کیسا آدمی ہے۔ اُس نے جس سے سُنا ہے وہ کیسا ہے۔ جھوٹا ہے یا صادق القول ہے۔ مومن ہے یا منافق۔ اس کا توڑ کیسے کرنا چاہیئے۔ اس کی مدافعت کی کیا صورت ہو۔ جب پُوری تیاری کر لیتے تب اس کو دوسروں سے بیان کرتے اس صورت میں دشمن سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔

کسی بد خبر کو سُن کر اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہوتا۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی خبر کے سنتے ہی مرعوب ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی پُوری ذمہ داری یا تو رسول پر عاید ہوتی ہے یا اس شخص پر جو رسول جیسا صاحبِ علم و فہم ہو اور جس کا علم وہبی ہو اکتسابی نہ ہو جس میں وہم و قیاس کو دخل نہ ہو اور حقیقت تک اس کی رسائی ہو سکے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع

اے رسول تم راہِ خدا میں جہاد کرو۔ تم اپنی ذات کے سوا اور کسی کے ذمہ دار نہیں ہو۔ مومنین کو جہاد کی ترغیب دو عنقریب خدا کافروں کی ہیبت کو روک دے گا، خدا کی ہیبت سب سے زیادہ ہے اور اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ جو شخص اچھے کام کی سفارش کرے تو اس کو بھی اس کام میں کچھ حصہ ملے گا اور جو بُرے کام کی سفارش کرے گا تو اس کی سزا میں کچھ حصہ اس کو بھی ملے گا اور اللہ تو ہر چیز پر نگہبان ہے۔ جب کوئی تمہیں سلام کرے تو تم اس کو اس سے بہتر طریقہ سے سلام کرو یا وہی لفظ جواب میں کہہ دو، خدا تو ہر شے کا حساب کرنے والا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس میں شک نہیں کہ وہ قیامت کے دن سب کو جمع کر دے گا اور اس سے بڑھ کر بات میں سچا کون ہے۔

سلام میں اگرچہ سلام کرنا سنّت ہے مگر اس کا جواب دینا واجب ہے۔ سلام کرنے والے کا ثواب زیادہ ہے اور جواب دینے والے کا کم اور اگر جواب نہ دے تو گناہ ہے اسلامی تہذیب یہ ہے کہ کم لوگ زیادہ والوں کو سلام کریں، سوار پیدل کو، خچر کا سوار گدھے کے سوار کو، چھوٹا بڑے کو اور سلام بلند آواز سے کرے کہ وہ سُن لے۔ بت پرست، شراب خور، شطرنج اور چوسر کھیلنے والے شوہر دار عورتوں پر جھوٹی تہمت لگانے والے، ہیجڑے، شاعرانِ لغو گو، سود خوار، علانیہ بدکاری کرنے والے کو سلام نہ کرنا چاہیئے۔ اور جو کہ نماز میں مشغول ہو اُسے سلام نہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر کرے تو نمازی کو صرف سلام علیکم کہنا چاہیئے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

مسلمانو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارہ میں دو فریق ہو گئے ہو (ایک مخالف دوسرا موافق) حالانکہ خدا نے خود ان کے کرتوتوں کی بدولت ان کی عقلوں کو اُلٹ پُلٹ کر دیا ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جس کو خدا نے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے تم اُسے راہِ راست پر لے آؤ اور جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑا ہے اس کو تم میں سے کوئی شخص صحیح راستہ پر لگا ہی نہیں سکتا۔ لوگوں کی خواہش تو یہ ہے کہ جس طرح وہ کافر ہو گئے ہیں تم بھی کافر ہو جاؤ اور تم ان کی برابر ہو جاؤ۔ پس جب تک وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ کریں تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ۔ اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو انہیں گرفتار کر لو اور جہاں پاؤ انہیں قتل کر دو۔ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ کچھ لوگ مکہ سے مدینہ آئے اور اپنے کو مسلمان ظاہر کیا۔ کچھ دنوں بعد پھر مکہ بھاگ گئے اور اپنے شرک و کفر کا اعلان کر کے بیمار چلے گئے۔ جب حضورؐ نے اُن سے لڑنا چاہا تو بعض مسلمانوں کو جنگ کرنے میں تامّل ہُوا کیونکہ وہ بحالتِ اسلام ان کے دوست بن چکے تھے۔ ان ہی کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا جب تک وہ ہجرت کر کے مدینہ نہ آئیں اور اپنا اسلام ظاہر نہ کریں ہرگز انہیں اپنا دوست نہ سمجھو اگر اسلام قبول کر لیں تو خیر ورنہ جہاں انہیں پاؤ قتل کر دو۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

مگر جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملے ہوں کہ تم میں اور ان میں صُلح کا عہد و پیمان ہو چکا ہے یا تم سے جنگ کرنے یا اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے دل تنگ ہو کر تمہارے پاس آ گئے ہوں تو انہیں آزار نہ پہنچاؤ۔ اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر غلبہ دیتا تو وُہ تم سے ضرور لڑ پڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور نہ لڑیں اور تمہارے پاس صلح کا پیغام بھیجیں تو پھر تمہارے لیے ان لوگوں کو آزار پہنچانے کی خدا نے کوئی سبیل نہیں نکالی۔

فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ الخ یہ اُس زمانہ کا حکم ہے کہ حضرت رسولِ خدا کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ جو تم سے لڑے تم بھی لڑو اور جو نہ لڑے تم بھی اُس سے نہ لڑو مگر سورۂ براءت نازل ہونے کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اور تمام مشرکین سے جہاد کا حکم ہُوا۔ مگر جس نے بروز فتح مکہ حضرتؐ سے عہد و پیمان کر لیا تھا وہ مستثنیٰ تھے۔

جن قوموں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو جاتا تھا حضورؐ اُس معاہدہ پر سختی سے قائم رہتے۔ لیکن جب ان میں کوئی قوم معاہدہ کو توڑتی تو پھر ان سے جنگ کرنا لازم ہو جاتا۔ اور جو لوگ حضورؐ سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور حضورؐ کے خلاف جنگ کرنے والوں کے ساتھ بھی رہنا نہیں چاہتے تھے تو ان کے لیے یہ حکم تھا کہ ان سے نہ لڑو۔ یا جو صلح چاہتے ہوں اُن سے جنگ کرنے سے بھی روکا گیا۔ اسلام کسی قوم پر جارحانہ حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن جب کوئی قوم درپئے آزار ہوتی یا حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی اور چڑھ کر آ جاتی تو پھر اُس کا دفاع لازم ہو جاتا۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَإِن لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿٩١﴾

اور عنقریب تم کچھ ایسے لوگوں کو بھی پاؤ گے کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی ملے جلے رہیں مگر جب کبھی جھگڑے کی طرف بُلائے گئے تو اوندھے منہ گر پڑے پس اگر وُہ تم سے نہ تو کنارہ کشی کریں اور نہ صلح کا پیغام دیں اور نہ لڑائی سے اپنے ہاتھ روکیں تو ان کو پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کرو یہی لوگ ہیں جن پر ہم نے تم کو صریحی غلبہ عطا فرما دیا ہے۔

عرب کے بعض قبائل نے یہ دو رُخی پالیسی اختیار کی تھی کہ اپنی قوم سے بباطن ملے ہوئے تھے اور ان پر ظاہر کرتے تھے کہ اگر مسلمانوں سے جنگ ہو گی تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب مدینہ میں آتے تو مسلمانوں سے بڑی چکنی چپڑی باتیں کرتے اور کہتے اگر مشرکین سے تمہاری جنگ ہو گی تو ہم تمہارے ساتھ رہ کر ان سے جنگ کریں گے۔ بعض سیدھے سادے مسلمان ان کے دامِ فریب میں آ جاتے تھے اور سچا مسلمان سمجھ کر ان کو اپنا دوست بنا لیتے تھے لیکن جب جنگ کا وقت آتا تو یہ فریبی صاف کترا جاتے اور اپنی قوم سے جا ملتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو کیونکہ یہ گروہ بہت خطرناک ہے۔

جا بجا ایسے منافقوں کی قرآن میں مذمت وارد ہوئی ہے۔ درحقیقت یہ آستین کے سانپ تھے جن کا ظاہر کچھ اور تھا اور باطن کچھ اور انہوں نے اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

اور کسی ایماندار کو یہ جائز نہیں کہ کسی مومن کو جان سے مار ڈالے مگر دھوکہ سے قتل کیا ہو تو دوسری بات ہے اور جو کوئی کسی مومن کو دھوکہ سے مار ڈالے تو اس پر ایک ایماندار غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے قرابتداروں کو خون بہا دینا لازم ہے مگر جب وہ لوگ معاف کر دیں - اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جو تمہارے دشمن کافر حربی ہیں اور خود قاتل مومن ہے تو پھر صرف ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا ہے اور اگر مقتول ان کافروں میں سے ہو جن سے تمہارا عہد و پیمان ہو چکا ہے تو قاتل وارثانِ مقتول کو خون بہا دے گا اور ایک بندۂ مومن کا آزاد کرنا واجب ہے -

اسلام میں مومن کے خون کی بڑی قیمت رکھی گئی ہے - اگر کسی مومن کو قصداً قتل کیا جائے گا تو پھر قاتل کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کہیں نہیں لیکن اگر قاتل نے سہواً قتل کیا ہے تو قتل سے بچ جائے گا اور اس کو ایک غلام آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا لازم ہوگا - افسوس ہے کہ اسلامی حکومتوں نے اس قانونِ قدرت کو بھلا دیا ہے - اگر کسی قاتل کو پھانسی دے دی گئی یا عمر قید کی سزا دی گئی تو مقتول کے ورثا کو اپنے کسی عزیز کے خون کا کیا بدلا ملا - ایک عورت بیوہ ہو گئی ایک بچہ یتیم ہو گیا - قاتل جیل خانہ چلا گیا لیکن ان بے چاروں کی زندگی بسر کرنے میں دُنیوی قانون کیا مدد کرتا ہے -

---

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اور جو غلام آزاد نہ کر سکے تو اس کا کفارہ خدا کی طرف سے دو مہینے لگاتار روزے رکھنا ہے - اور سب باتوں کا جاننے والا اور حکمت والا ہے اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعن ہوگی اور اس کے لیے سخت عذاب مہیا ہوگا اے ایمان والو جب تم راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکلو تو کسی کے قتل کرنے میں جلدی نہ کیا کرو خوب تحقیق کر لو اور جو کوئی اظہارِ اسلام کی غرض سے تم کو سلام کرے تو اس سے یہ نہ کہو کہ تُو مومن نہیں - تم دنیوی اثاثہ ملنے کی تمنا رکھتے ہو - (اور اس لیے کسی بے گناہ کو قتل کرتے ہو) اور یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ کے یہاں بہت نعمتیں ہیں (ان کے خواہشمند بنو) - اے مسلمانو، تم اسلام سے پہلے ایسے ہی تھے پھر بے کھٹکے مسلمان ہو گئے - اللہ نے یہ تم پر احسان کیا - بہر حال خوب تحقیق کر لو (تب کسی کو قتل کرو) - جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے -

اس آیت کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت رسولِ خدا نے چند مسلمانوں کو کسی قبیلہ سے لڑنے کے لیے بھیجا جوں ہی ان لوگوں کو پتہ چلا سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے - ان میں ایک شخص مرداس نامی مسلمان تھا وہ مال و اسباب کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ گیا تھا - جب اہلِ اسلام کا لشکر وہاں پہنچا اور ان کی تکبیر کی آوازیں بلند ہوئیں تو مرداس مطمئن ہو کر نیچے اُتر آیا اور سلام علیکم کے بعد کلمۂ شہادت زبان پر لایا - اسامہ بن زید بے رحم نے اس کے کہنے کا اعتبار نہ کیا اور مرداس کو کافر سمجھ کر مار ڈالا اور اس کا مال و اسباب لُوٹ لیا - جب حضرتؐ کو خبر پہنچی تو آپ بہت غمگین ہوئے اور فرمایا اُسامہ تو نے بڑا غضب کیا کہ جو خدا کی وحدانیت کا مقر تھا اُسے تو نے قتل کیا - اسامہ پشیمان ہو کر کہنے لگا میں نے یہ

سمجھا کہ وہ جان کے خوف سے کلمہ پڑھ رہا ہے۔ فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ وہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ (منقول از قرآن ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

معذور لوگوں کے سوا جہاد سے منہ چھپا کر بیٹھنے والے مومنین اور اپنے مالوں اور جانوں سے راہِ خدا میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے بلکہ اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو گھر بیٹھنے والوں پر خدا نے درجہ کے اعتبار سے بڑی فضیلت دی ہے۔ اگرچہ اللہ نے سب ایمانداروں سے (جہاد کریں یا نہ کریں) بھلائی کا وعدہ کر لیا ہے مگر اللہ نے مجاہدوں کو گھر میں بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں بڑی فضیلت دی ہے یعنی انہیں اپنی طرف سے بڑے بڑے درجے بخشے گا اور رحمت عطا فرمائے گا۔ اور خدا تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جنگِ تبوک کے وقت کعب بن مالک، رادہ بن الربیع اور ہلال بن امیہ وغیرہ جان چرا کر گھر میں بیٹھ رہے اور جہاد میں جانے سے جی چھوڑ بیٹھے مگر عبداللہ بن مکتوم نے اپنی نابینائی کا عذر کیا۔ انہی منافقوں نے حضرت علی علیہ السلام پر یہ طعنہ زنی کی تھی کہ حضرت رسولِ خدا آپؑ کو اپنے ساتھ نہ لے گئے اور عورتوں اور بچوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ گئے معلوم ہوتا ہے حضورؐ کا اعتماد آپؑ پر سے اٹھ گیا۔ یہ سن کر حضرت علیؑ کو بہت رنج ہوا اور آپؑ گھوڑے پہ سوار ہو کر حضرتؐ سے ایک منزل پر جا ملے۔ حضرتؐ نے فرمایا، منافقوں کے کہنے کا خیال نہ کرو۔ تمہاری منزلت میرے نزدیک وہی ہے جو ہارونؑ کی منزلت موسیٰؑ کے ساتھ تھی۔ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿٩٧﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩٨﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾

بے شک وہ لوگ جن کو فرشتوں کی جماعت نے ایسی حالت میں قبضِ روح کیا جبکہ انہوں نے جانوں کے اوپر ظلم کیا تھا فرشتوں نے ان سے کہا تم کس حال میں تھے انہوں نے کہا ہم تو زمین میں کمزور کر دئے گئے تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ پس یہ لوگ وہ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنّم میں ہے سوائے ان کے جو مردوں عورتوں اور بچّوں میں کمزور کر دیئے گئے ہوں نہ کوئی حیلہ کر سکتے ہوں نہ نکلنے کی راہ پا سکتے ہوں بس قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے درگزر کرے اور وہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ اور جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی جگہیں اور کشادگی پائے گا اور جو کوئی اپنے گھر سے خدا اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتا ہوا نکلے پھر اسے موت آجائے تو یقیناً اس کا اجر اللہ پر واجب ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر صافی میں ہے کہ جب ہجرت کی آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے جس کا نام جندب تھا اور ان دنوں مکہ میں مقیم تھا آیہ ہجرت کو سنا تو کہنے لگا خدا کی قسم میں وہ نہیں ہوں جس کو اللہ نے مستثنیٰ کیا ہے میں اپنے

میں ہجرت کرنے کی قوت بھی پاتا ہوں اور میں راستہ سے بھی واقف ہوں۔ وہ کسی شدید مرض میں مبتلا تھا اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا میں مکہ میں ہرگز نہیں مروں گا میں ضرور ہجرت کروں گا مجھے ڈر ہے کہ مکہ میں نہ مر جاؤں اور ہجرت کے ثواب سے محروم ہو جاؤں پس اُس کے لڑکے اسے لے کر نکلے جب مقامِ تنعیم تک پہنچے تو وہ مر گیا۔ اس کے بارہ میں یہ آیت ہے۔

ہجرت پر زور اس لیے دیا گیا ہے تاکہ مشرکوں کو ان کے ستانے اور ورغلانے کا موقع نہ ملے دوسرے یہ کہ ان پر معاشی ذرائع تنگ نہ ہوں۔ تیسرے وُہ آزادی سے وہاں عبادت نہ کر پانے کی بنا پر دل گرفتہ نہ ہوں۔ چوتھے وہ کفار کے دباؤ میں آکر پھر کفر کی طرف نہ پلٹ جائیں۔

عباس بن عبدالمطلب باوجودیکہ حضرت رسولِ خداؐ کے چچا تھے لیکن کفار کی دوستی ان پر ایسی غالب آئی کہ وُہ ہجرت کرنے پر آمادہ نہ ہُوئے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جنگِ بدر میں وُہ مشرکین کے ساتھ حضرتؐ سے لڑنے کے لیے نکلے۔ آخر میں قید ہوئے۔ اس کے بعد فدیہ دے کر پھر مکہ ہی کو گئے۔ یہی خدشہ تھا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہجرت کرنے پر زور دیا ہے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ

جب تم زمین پر سفر کرو اور یہ خوف ہو کہ اثنائے نماز میں کفار فساد برپا کریں گے تو کوئی مضائقہ نہیں نماز میں کچھ کم کر لیا کرو۔ بے شک کفار تو تمہارے کھلے دشمن ہیں اور جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور لڑائی ہو رہی ہو تو تم ان کو نماز پڑھانے لگو دو گروہ کر کے ایک کو لڑائی کے لیے چھوڑو اور ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لیے رہے پھر ایک رکعت کے بعد سجدے کر کے دوسری رکعت فرادیٰ پڑھ لیں اور تمہارے پیچھے پشت پناہ بنیں اور دوسری جماعت جو لڑ رہی تھی آئے اور دوسری رکعت میں تمہارے ساتھ نماز پڑھے وہ اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لیے رہے۔

نماز میں کم کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ چو رکعتی نمازوں میں دو رکعت کم کرو جس طرح یہاں قصر ضروری ہے اسی طرح سفر میں ضروری ہے۔ اگر بجائے دو کے چار پڑھے تو نماز باطل ہو گی۔

نمازِ خوف کی صورت یہ ہوئی کہ جب حضورؐ حدیبیہ کے ارادہ سے مکہ کو روانہ ہوئے تو کفار نے خالد بن ولید کی ماتحتی میں دو سو سوار حضرتؐ کو روکنے کے لیے روانہ کیے اثنائے راہ میں پہاڑوں پر مڈبھیڑ ہوئی۔ اتنے میں نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ آپؐ نے سب کے ساتھ نماز پڑھی۔ خالد نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہم سے بڑی غلطی ہوئی اگر ہم حالتِ نماز میں ان پر حملہ کر دیتے تو سب کو مار لیتے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی نماز کو قطع نہ کرتے۔ خیر اس کے بعد موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اس کے بعد نمازِ خوف کی صورت کا حکم آگیا۔

وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿١٠٢﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾

کفار تو یہی چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے غافل ہو جاؤ تو ایک مرتبہ ہی تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اگر تم بارش سے تکلیف میں ہو یا تم بیمار ہو جاؤ تو تم پر کوئی الزام نہیں اگر تم نماز میں اپنے ہتھیار اُتار کر رکھ دو اور اپنی حفاظت کرتے رہو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ جب تم نماز پڑھ چکو اللہ کا ذکر کھڑے ہو کر، بیٹھ کر یا لیٹ کر جس طرح ممکن ہو کرتے رہو پس جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو پوری نماز معمول کے مطابق پڑھو۔ بے شک نماز مومنین پر وقتِ معیّن کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ اے مسلمانو دشمنوں کی تلاش میں سُستی نہ کرو اگر لڑائی میں تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو انہیں بھی پہنچتی ہے۔ تم تو اللہ سے وہ وُہ امیدیں رکھتے ہو جو انہیں نصیب نہیں۔ اللہ تو بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾

ہم نے تمہارے اُوپر برحق کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے اسی طرح تم مسلمانوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنو اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ اے رسول تم ان بدکرداروں کے ساتھی بن کر لوگوں سے نہ لڑو جو اپنوں ہی سے دغابازی کرتے ہیں۔ اللہ اُس شخص کو دوست نہیں رکھتا جو بُرا خائن اور گنہگار ہو۔ وہ لوگوں سے شرارت کی باتیں چھپاتے ہیں مگر اللہ سے تو نہیں چھپا سکتے جو اُس وقت بھی اُن کے پاس ہوتا ہے جب وہ راتوں کو ایسی باتیں کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں اور خدا کا علم ان کے سب کرتوتوں کو گھیرے ہوئے ہے۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ بنو ابیرق میں سے تین بھائی بشیر، بشر اور مبشر منافق تھے۔ ان تینوں نے قتادہ کے چچا کے مکان میں نقب لگائی اور سب سامان لے گئے اور ایک یہودی کے گھر چھپا کر رکھ آئے۔ ایک مرد دیندار لبید بن سہل ان کا رازدار تھا۔ قتادہ نے ان سب کی شکایت رسولؐ سے کی۔ بشیر وغیرہ نے اس کا ملزم لبید کو قرار دیا۔ جب لبید کو یہ خبر ہوئی تو وہ تلوار لے کر گھر سے نکلا اور کہا اے بنو ابیرق چوری کرو تم اور نام لگاؤ میرا حالانکہ تم پکے منافق ہو تم رسول اللہ کی ہجو کیا کرتے ہو اور قریش کی طرف منسوب کرتے ہو اگر میں نے چوری کی ہے تو ثابت کرو ورنہ اس تلوار سے تمہارے سر اڑا دوں گا۔ وہ لوگ یہ سن کر اس سے دب گئے اور صلح کر لی اور الزام سے بری کر دیا۔ اس کے بعد وہ لوگ اسید بن حروہ کے پاس پہنچے جو اُن کا ہم قبیلہ اور بڑا لسّان تھا اس کو وکیل بنا کر حضرت رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے کہا قتادہ نے بڑا ہنگامہ بپا رکھا ہے ایسے عالی خاندان لوگوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے یہ سن کر آپؐ کو رنج ہوا اور قتادہ کو بُلا کر تنبیہ فرمائی۔ قتادہ کو اپنے جھوٹے بننے اور حضرتؐ کے غصہ ہونے کا سخت ملال ہوا، اس کے چچا نے اس کو تسلی دی کہ خدا ہمارا مددگار ہے۔ اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان لوگوں کی چوری کا حال سب پر کھل گیا اور قتادہ کی بے گناہی ثابت ہو گئی۔

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾ وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١١٠﴾ وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿١١٢﴾

اے مسلمانو تم دنیاوی زندگی کے ذرا سے معاملہ میں تو ان کے طرفدار بن کر لڑنے کو کھڑے ہو گئے بھلا قیامت کے دن ان کا طرفدار ہو کر اللہ سے کون لڑے گا یا ان کا وکیل بن کر کون کھڑا ہو گا۔ جو شخص بُرائی کرتا ہے یا اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے پھر خدا سے معافی مانگ لے تو اللہ بڑا غفور و رحیم ہے جو کوئی گناہ کرتا ہے وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اللہ تو سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے جو کوئی بُرا کام کرتا ہے یا کوئی گناہ کرتا ہے اور کسی بے گناہ کے سر تھوپ کر اپنے کو بری کرنا چاہتا ہے تو اُس نے بڑا افترا کیا اور صریحی گناہ اپنے ذمہ لے لیا۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ ۖ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِن شَيْءٍ ۚ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿١١٣﴾ لَّا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾

اگر تم پر خدا کا فضل و کرم اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو ان بدمعاشوں کا ایک گروہ تم کو گمراہ کرنے کا ضرور قصد کرتا حالانکہ وہ لوگ اپنے ہی کو گمراہ کر رہے ہیں اور یہ لوگ تم کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے تم پر اپنی کتاب

اور حکمت نازل کی اور جو باتیں تم نہیں جانتے تھے وُہ سب سکھا دیں اور خدا کا تم پر بڑا فضل ہے۔ اے رسول ان لوگوں کی راز کی باتوں میں سے اکثر میں تو بھلائی کا نام تک نہیں مگر ہاں جو شخص کسی کو صدقہ دینے یا اچھے کام کرنے یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے تو البتہ ٹھیک ہے اور جو کوئی شخص خدا کی خوشنودی میں یہ کام کرے گا تو ہم عنقریب اُسے اچھا بدلہ دیں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ سے فرمایا ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس کی صفت یہ ہے کہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی اس میں ہر شے کا بیان ہے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ تم کو حکمت بھی دی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت کتاب سے الگ ایک چیز ہے اور وہ نہیں ہو سکتی مگر رسولؐ کی نظری اور عملی قوت یعنی ہر معاملہ میں گہری نظر ڈالنا اور پھر پوری قوت سے ہر عمل کو صحیح طریقہ سے انجام دینا۔ اس کے بعد فرماتا ہے جو کچھ تم نہیں جانتے تھے وہ سب کا سب تمہیں سکھا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب و حکمت سے علیٰحدہ کوئی چیز ہے جس کو اس نے فضلِ عظیم قرار دیا ہے۔ یہ اسرارِ الٰہیہ ہیں جو خصوصیت کے ساتھ رسولؐ کو عطا کیے گئے ہیں۔ یہ علوم ذاتِ رسولؐ میں داخل ہیں یعنی عالمِ نور ہی میں ان علوم کی تعلیم رسولؐ کو دے دی گئی تھی۔ آدمؑ کے وجود سے قبل حضرتؐ کو نبوت کا عطا ہونا بغیر علم کیسے ممکن تھا۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علمِ غیب بھی اس تعلیم میں داخل ہے پس یہ کہنا کہ قبلِ بعثت رسولؐ اُمّی محض تھے ذاتِ رسولؐ پر کس قدر ظلم ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ

اس کے بعد بھی کہ راہِ راست واضح ہو چکی ہے جو کوئی رسولؐ سے سرکشی کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چلے گا تو وہ جدھر پھر گیا ہے ہم بھی اس کو اسی طرف پھیر دیں گے اور جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ خدا شرک کا گناہ نہیں بخشے گا اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا اور جس نے کسی کو اللہ کا شریک بنایا تو وہ ٹھیک راستہ سے بہت دُور جا پڑا۔ یہ مشرکین اللہ کو چھوڑ کر بس عورتوں ہی کی پرستش کرتے ہیں وہ درحقیقت ان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ سرکش شیطان کی کرتے ہیں جس پر خدا نے لعن کی ہے۔

مومنین کے راستہ سے مراد وہ راستہ نہیں جو مسلمانوں نے بعد رسولؐ خود بنا لیا ہو۔ پبلک کے بنائے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے ہوتے ہیں ان کو سرکاری سڑک نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں مراد وہ راستہ ہے جو مومنین کے لیے بنایا گیا ہے۔ جس کا نام اسلام یا شریعتِ محمدیؐ ہے۔

مشرکین نے اپنے بتوں کے نام عورتوں کے نام رکھے ہُوئے تھے۔ جیسے نائلہ۔ لات۔ منات۔ جس طرح ہندو کالی۔ سیتلا۔ بھوانی اور سیتا کی پوجا کرتے ہیں اسی طرح جاہلیت کے عرب کیا کرتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک نیا بُت تھا۔ تمام قبائل کے بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ تھی۔ ایک قبیلہ کے بُت کی پوجا دوسرا قبیلہ نہیں کرتا تھا۔ چونکہ یہ سب کرشمے شیطان کے تھے بعض وقت وہ ان میں حلول بھی کر جاتا تھا۔ اس لیے شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

اس شیطان نے ابتدا ہی میں خدا سے کہہ دیا تھا میں تیرے بندوں میں کچھ بندوں کو اپنی طرف ضرور لے لوں گا اور انہیں بُری بُری باتوں کی امیدیں بھی ضرور دلاؤں گا اور ان کو بُرے کاموں کا حکم بھی دُوں گا اور وہ بتوں کے واسطے جانوروں کے کان ضرور چیر دیا کریں گے اور میں ان سے کہہ دوں گا کہ میری تعلیم کے موافق خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کو ضرور بدل دیں۔ پس یاد رہے جو شیطان کو اپنا ولی اور سرپرست بنائے گا تو وہ سخت گھاٹے میں رہے گا — شیطان ان سے وعدے بھی کرتا ہے اور بڑی بڑی امیدیں بھی دلاتا ہے مگر اس کے سارے وعدے دھوکا ہی دھوکا ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جہاں سے بھاگنے کے لیے کوئی جگہ انہیں نظر نہ آئے گی۔

مشرکوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جب اپنے بتوں پر کوئی جانور چڑھاتے تو اس کے دونوں کان پھاڑ دیتے تاکہ یہ نشان ہو اس بات کا کہ یہ بتوں پر چڑھایا ہُوا ہے۔ ہندوؤں میں ایک یہ رسم ہے کہ کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کر کے ان میں لٹو ڈال دیتے ہیں شیطان نے یہ پٹی بھی پڑھائی تھی کہ مشرکین کی عورتیں اپنے ہاتھوں کے اوپر اور بازوؤں پر، پیروں پہ گُدوا کر ان میں نیل بھرواتی تھیں۔ ہندو عورتیں بھی ایسا کرتی ہیں۔ یہ سب شیطان کے سکھائے ہوئے عمل ہیں۔ وُہ چاہتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی مخلوق کو عیب دار بنا دے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے کام کیے ہیں ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ خُدا کا وعدہ سچّا ہے۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے قول میں کون سچّا ہے۔ نہ تم لوگوں کی آرزوؤں سے کوئی کام چل سکتا ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں سے۔ جو کوئی بُرا کام کرے گا اس کو ویسا ہی بدلہ ملے گا اور وُہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا ولی اور مددگار نہ پائے گا۔ جو کوئی نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو تو ایسے لوگوں کو جنّت میں داخلہ ملے گا اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ دین میں اس سے بہتر کون ہو گا جس نے خدا کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا اور وُہ نیکوکار بھی ہے اور جس نے ابراہیم کے دین کا اتباع کیا جو باطل سے کترا کر چلے تھے اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنا لیا۔

دنیا میں جو چھوٹا یا بڑا عمل کسی نے کیا اس کا بدلہ اُسے ضرور خدا کے یہاں سے ملے گا۔ اچھا ہے تو اچھا بدلہ اور بُرا ہے تو بُرا بدلہ۔ ہلکے ہلکے عملِ بد کی سزا یہاں بھی مل جاتی ہے جیسے بیمار ہو جانا کسی صدمہ سے رنجیدہ ہونا یا کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانا۔

حضرت ابراہیمؑ کے خلیل بنائے جانے کے متعلق مفسرین نے ایک روایت لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپؑ مہمانوں کے واسطے آٹا لانے کے لیے اپنے ایک مصری دوست کے پاس گئے اُس نے انکار کیا تو آپؑ نے شرم کے مارے ریت کو بوری میں بھر لیا خدا نے اُسے آٹا بنا دیا جب گھر پہنچے تو جناب سارہؑ اپنی بی بی سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا آپ یقیناً خلیلِ خدا ہیں۔ خدا نے اس کو پسند فرما کر اپنے کلامِ پاک میں داخل کر لیا۔ ایک روایت ہے کہ ذبحِ اسمٰعیلؑ کے بعد یہ خطاب ملا۔ یہ تو روایتیں ہیں باقی خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ

جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے سب خدا ہی کا ہے اور اللہ کا علم ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لوگ تم سے یتیم لڑکیوں کے (نکاح کے) بارہ میں پوچھتے ہیں تم ان سے کہہ دو اللہ تم کو ان سے نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہے اور جو حکم قرآن میں تمہیں پہلے سُنایا جا چکا ہے وہ ان لڑکیوں کے بارہ میں تھا جنہیں تم ان کا معیّن حق نہیں دیتے اور چاہتے ہو کہ یوں ہی ان سے نکاح کر لو اور کمزور بچوں کے بارہ میں جو حکم سُنانا ہے وہ یہ ہے کہ تم یتیموں کے حق کے معاملہ میں انصاف پر قائم رہو اور جو کچھ تم نیکی کرو گے خدا اس سے ضرور واقف ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی بے توجہی سے (طلاق کا) خوف رکھتی ہے تو میاں بی بی اگر باہم مِل کر میل ملاپ کر لیں تو ان میں سے کسی پر کوئی الزام نہیں۔

خولہ نامی ایک عورت مسلمہ بن رافع کی زوجہ تھی۔ جب وہ بوڑھی ہوئی تو شوہر نے دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہا۔ خولہ نے کہا تُو مجھے طلاق نہ دے میں اپنی باری بخشے دیتی ہوں۔ وہ نہ مانا۔ عورت نے اس کی شکایت حضورؐ سے کی۔ اس کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿١٣٠﴾

اور صلح بہرحال بہتر ہے اور ہر طبیعت سے بخل قریب ہے اگر تم نیکی کرو اور اللہ سے ڈرو تو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے لیکن تم اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ متعدد بی بیوں میں پورا پورا انصاف کر سکو مگر ایسا بھی نہ کرو کہ ایک ہی کی طرف ہمہ تن اتنا مائل ہو جاؤ کہ دوسری کو اُدھر میں لٹکا چھوڑ دو۔ اگر تم صلح کر لو اور زیادتی سے بچے رہو تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے اور دونو طلاق سے جُدا ہی ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ سے فارغ البالی عطا کر کے ایک کو دوسرے سے بے نیاز کر دے گا اور خدا تو بڑی گنجائش والا اور حکیم ہے۔

مرد کے فرائض میں ہے کہ سب بی بیوں کو برابر روٹی کپڑا باری باری دے۔ باری باری ہر ایک کے پاس سوئے طبیعت کا رجحان برابر ہر ایک کی طرف رہے چونکہ ایسا انصاف قوتِ بشری سے باہر تھا لہٰذا خدا نے رعایت کر کے فرمایا۔ اگر تم پورا انصاف نہیں کر سکتے تو ظاہری باتوں میں تو فرق نہ کرو۔ حضرت رسولِ خدا بحالت بیماری بھی کسی ایک بی بی کے گھر میں نہ رہتے تھے اور حضرت علیؑ کا قاعدہ تھا کہ جس بی بی کی باری ہوتی آپؑ اس کے غیر کے گھر میں وضو بھی نہ کرتے۔ معاذ بن جبل کی دو بی بیاں مرگئیں تو انہوں نے قرعہ ڈالا کہ پہلے کس کو غسل دوں۔

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَمِيدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿١٣٢﴾ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ﴿١٣٣﴾

اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے خدا ہی کا ہے جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ان کو اور تم کو بھی ہم نے وصیت کی تھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر کہیں تم نے کفر اختیار کر لیا تو یاد رہے کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے اور خدا کارسازی کے لیے کافی ہے اگر خدا چاہے تو تم کو دُنیا سے بالکل ہی اُٹھا لے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لا بسائے اور خدا اس پر قدرت رکھتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿١٣٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

جو شخص صرف دُنیا ہی میں بدلہ چاہتا ہے تو اللہ کے نزدیک دُنیا و آخرت دونو کا اجر ہے اور اللہ ہر بات کا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اے ایمان والو، انصاف پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو چاہے وہ تمہارے لیے یا تمہارے باپ یا رشتہ داروں کے لیے مُضر ہی کیوں نہ ہو مالدار ہو یا محتاج کیونکہ خدا تو بہ نسبت تمہارے ان پر زیادہ مہربان ہے۔ اور حق سے بچنے کے لیے خواہشات کی پیروی نہ کرو اور اگر گھما پھرا کے گواہی دو گے یا بالکل انکار کر دو گے تو یاد رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

اس زمانہ میں جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا ایک معمولی بات سمجھا جاتا ہے بلکہ سچ بولنے والے سچی گواہی دینے والوں کو لوگ احمق سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جھوٹی گواہیوں کی بدولت بے جرم و قصور لوگ جیل میں چلے جاتے ہیں اور مجرم بے قصور ثابت ہو کر دندناتے پھرتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں سب سے بڑی خرابی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ سوسائٹی میں ایسے لوگوں کو کوئی ناپسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ ان کو ملامت نہیں کرتا۔ ان سے ترکِ تعلق نہیں کرتا بلکہ ان کو سمجھایا بجھایا تک نہیں جاتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا

لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم سبیلا ﴿۱۳۷﴾ بشر المنٰفقین بان لھم عذابا الیما ﴿۱۳۸﴾ الذین یتخذون الکٰفرین اولیاء من دون المؤمنین ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعا ﴿۱۳۹﴾

اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ان کتابوں پر جو اللہ نے اس سے پہلے نازل کیں اور جو شخص اللہ. اس کے ملائکہ. اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن کا انکار کرے گا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک کر بہت دُور جا پڑا۔ جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ان کا کفر بڑھتا ہی چلا گیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور نہ ان کو راہِ حق کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔ منافقوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے جو لوگ مومنین کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرتے ہیں تو کیا وُہ ان کے پاس رہ کر عزّت چاہتے ہیں، عزت تو بس ساری خدا ہی کے پاس ہے۔

ایمان والوں سے تم یہ کہنا کہ تم ایمان لے آؤ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی دو صورتیں ہیں، ایک تو اوپری دل سے ایمان لانا دوسرے سچے دل سے ایمان لانا۔ پس جو لوگ اوپری دل سے ایمان لاتے ہیں ان سے کہا جا رہا ہے کہ سچے دل سے ایمان کو قبول کرو۔

جو لوگ ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے۔ پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے بارہ میں سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔ بلکہ لوگوں کی دیکھا دیکھی یا کسی فائدہ کے پیشِ نظر مسلمان ہو گئے پھر کافروں نے ذرا بہکایا تو کافر بن گئے پھر مسلمانوں نے ذرا سرزنش کی اور غیرت دلائی تو مسلمان ہو گئے۔ پھر کافروں نے بُرا بھلا کہا تو پھر کافر ہو گئے اور اس کے بعد ان کا کفر بڑھتا ہی گیا یعنی پہلے تو کافر ہی تھے پھر دوسروں کو بھی کافر بنانے لگے۔ جو لوگ کافروں سے میل جول کر کے عزت و آبرو کے خواہاں ہیں وہ دھوکہ میں ہیں کیونکہ اصلی عزت تو خدا کے پاس ہے جو عزت وہ دیتا ہے درحقیقت اصلی عزت وہی ہے۔ بندوں کی دی ہوئی عزت چھن جاتی ہے لیکن خدا کی دی ہوئی عزت کو کوئی نہیں چھین سکتا۔

وقد نزل علیکم فی الکتٰب ان اذا سمعتم اٰیٰت اللہ یکفر بھا ویستھزا بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ انکم اذا مثلھم ان اللہ

جامع المنٰفقین والکٰفرین فی جھنم جمیعا ﴿۱۴۰﴾ الذین یتربصون بکم فان کان لکم فتح من اللہ قالوا الم نکن معکم وان کان للکٰفرین نصیب قالوا الم نستحوذ علیکم ونمنعکم من المؤمنین فاللہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ ولن یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین سبیلا ﴿۱۴۱﴾

اور اللہ اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم کچھ لوگوں کو آیات خدا سے انکار کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے سنو تو ان کے پاس مت بیٹھو تاکہ وُہ کسی اور معاملہ میں بات چیت کرنے لگیں ورنہ تم ان کی مثل ہی قرار پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں دونوں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے جو منافقین تمہارے مآلِ کار کو دیکھنے کے منتظر ہیں کہ فتح ہوتی ہے یا شکست، پس اگر تمہیں خدا کی طرف سے فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو فتح ہوتی ہے تو کافروں کے طرفدار بن کر کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہ آ گئے تھے (مگر قصداً تمہیں چھوڑ دیا) اور کیا مومنین کے ہاتھوں سے ہم نے تمہیں بچایا نہیں تھا۔ پس اللہ روزِ قیامت تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ قرار نہیں دی۔

منافقوں کی یہ عادت تھی کہ جب ایمان والوں کے پاس بیٹھتے تو آیاتِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگتے لہٰذا ایمان والوں سے کہا گیا کہ جب وہ کوئی تذکرہ ایسا چھیڑیں تو تم فوراً وہاں سے اُٹھ کھڑے ہو تاکہ وہ کچھ اور باتیں کرنے لگیں اور منافق جو کافروں سے ملے ہوئے تھے ان کا یہ حال تھا کہ جب مسلمانوں کو فتح ہوتی تو ڈینگیں مارنے لگتے کہ اس فتح میں ہم بھی تو تمہارے ساتھ شریک ہیں اور جب کافروں کو غلبہ ہوتا تو ان کے پاس جا کر کہتے کہ یار لوگو، ہمیں تم پر غلبہ جب ہوا تھا تو ہم نے مومنوں کو حسنِ تدبیر سے تم پر حملہ کرنے سے روک دیا اور تم کو فتح حاصل ہو گئی لہٰذا اس فتح میں ہم بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں غرض چت اور پٹ دونوں صورتوں میں اپنے کو خیر خواہ ظاہر کرتے رہتے تھے۔

ان المنٰفقین یخٰدعون اللہ وھو خادعھم واذا قاموا الی الصلٰوۃ قاموا کسالٰی یراءون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا ﴿۱۴۲﴾ مذبذبین بین ذٰلک

لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

منافقین اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ خود انہیں دھوکا میں رکھتا ہے۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو الکسائے ہوئے بیدلی سے اور لوگوں کو دکھاوے کے لیے۔ اللہ کی یاد بہت تھوڑی دیر کرتے ہیں کفروایمان کے بیچ میں پڑے اُدھر میں جھول رہے ہیں نہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے۔ اور اللہ جسے گمراہی میں چھوڑ دے تو پھر تم اُسے صحیح راستہ پر لگا ہوا پاؤ گے ہی نہیں۔

منافق چونکہ صحیح دل سے ایمان لائے ہوئے ہی نہ تھے اس لیے وُہ نماز پڑھتے تھے مگر جلدی جلدی بے دلی سے تاکہ لوگ یہ دیکھ لیں کہ ہم نمازی ہیں۔ ان کے دِل کبھی کفر کی طرف مائل ہو جاتے تھے اور کبھی اسلام کی طرف، یہ عجیب زندگی تھی جس میں ان کو یکسوئی حاصل نہ تھی۔ بھلا ایسے لوگ کیا صحیح راستہ پر آسکتے ہیں خدا کے سامنے ان کا دھوکا کہاں چل سکتا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اے ایمان والو مومنین کو چھوڑ کر تم کافروں کو اپنا دوست بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا کا صریحی الزام اپنے اوپر لے لو منافق تو جہنم کے آخری طبقہ میں ہوں گے اور تم وہاں اُن کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنی اِصلاح کر لی اور خدا ہی سے لگے لپٹے رہے اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لیے رکھا تو ایسے لوگ روز قیامت ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنین کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا اور اگر تم نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس پر ایمان لے آئے تو خدا تم پر عذاب کر کے کیا کرے گا۔ اللہ تو شکر کا قدر دان اور ہر بات کا جاننے والا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی کُھلم کُھلا برائی کی جائے ہاں جس پر ظلم کیا گیا ہے وُہ ظالم کی بُرائی کر سکتا ہے اور اللہ بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے (مظلوم ہونے کی صُورت میں اگرچہ تمہیں بُرائی کرنے کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو تو اللہ بڑا معاف کرنے والا اور قدرت والا ہے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہیں اور کفر و ایمان کے درمیان ایک نیا راستہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ سب سچے کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے وُہ سزا رکھی ہے جو انہیں ذلیل کرنے والی ہوگی۔

یعنی جو لوگ کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں اس کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سب رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان کے درجوں کی تفریق کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس صورت میں جن رسولوں کو نہ مانے جائے گا ان کی توہین ہوگی اور اللہ کا انتخاب غلط ثابت ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسْـَٔــلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہیں وہ لوگ ہیں جن کو ان کا اجر دیا جائے گا اور اللہ تو غفور رحیم ہے۔ اہلِ کتاب تم سے سوال کرتے ہیں کہ ان پر کوئی کتاب آسمان سے نازل کرائیے (تو تم اس کا خیال نہ کرو) موسیٰ سے تو اس سے کہیں بڑا سوال انہوں نے کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو ظاہر بظاہر دکھائیے۔

الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

تب ان کو شرارت کی وجہ سے بجلی نے لے ڈالا۔ پھر باوجود روشن دلیلیں آنے کے انہوں نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا ہم نے اس خطا کو بھی معاف کیا اور موسیٰ کو ہم نے کھلا ہوا غلبہ عطا فرمایا۔ اور ہم نے ان کے خلاف عہد کرنے پر ان کے سر پر کوہِ طور بلند کر دیا اور ہم نے ان سے کہا شہر کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور ہم نے یہ بھی کہا کہ تم ہفتہ کے دن ہمارے حکم سے تجاوز نہ کرنا اور ہم نے ان سے پکا عہد لے لیا تھا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ

شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

(مگر انہوں نے ایک بات نہ مانی) بس ان کے عہد توڑ دینے کی وجہ سے اور آیاتِ خدا سے انکار کرنے کی بنا پر اور ناحق انبیاء کو قتل کر دینے کی وجہ سے اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (ایسا تو نہ تھا) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی پس ان میں سے تھوڑے آدمی ایمان لائے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ انہوں نے مریم پر بڑا جھوٹا الزام لگایا اور اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا (ان پر ہمارا عذاب آیا) انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں اور نہ اُن کو سُولی دی بلکہ انہیں شبہ ہو گیا۔ جن لوگوں نے ان کے بارہ میں اختلاف کیا وہ شبہ میں پڑ گئے۔ ان کو اس واقعہ کا علم ہی نہیں بلکہ نفس کی پیروی کر رہے ہیں (اور من گھڑت باتیں کر رہے ہیں) انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اِن آیات میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ یہودیوں نے بار بار خدا کی نافرمانی کی جس کا ذکر آیت میں ہے۔

خدا کو ظاہر بظاہر دیکھنے کی خواہش۔ گئوسالہ کی پرستش۔ دروازہ میں داخلہ کے وقت بجائے حطہ کے حنطہ کہنا۔ حکم السبت کی مخالفت کرنا۔ بار بار خدا سے عہد کر کے توڑنا۔ انبیاء کو بے گناہ قتل کرنا۔ ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ حضرت مریمؑ پر زنا کی تہمت لگائی۔ حضرت عیسیٰؑ کو زنازادہ بتایا۔

۲۔ یہودیوں پر اس قدر جہالت سوار تھی کہ جو عقیدے اور رسم و رواج ان کے باپ دادا سے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان سے بال برابر ہٹنا چاہتے ہی نہ تھے۔ انبیاء علیہم السلام انہیں کتنا ہی سمجھاتے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ انبیاء و مرسلین کی صداقت کا یقین تو رکھتے تھے لیکن یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کی بدکاریوں پر انہیں ٹوکیں چونکہ انبیاء علیہم السلام کا کام ہی ہدایت کرنا تھا لہٰذا وہ کیسے رُک سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انبیاءؑ کے دشمن ہو گئے۔ اور ان کے قتل کرنے پر کمر کس لی۔ چنانچہ ایک دو نہیں جو نبی آ رہا وہ اس کو قتل کرتے رہے۔ حضرت ذکریاؑ۔ حضرت یحییٰؑ حضرت ارمیا وغیرہ انبیاء کو اتنی بات پر قتل کیا گیا کہ وہ ان کی بدکاریوں کو دیکھ کر خاموش کیوں نہیں رہتے تھے اور ان کی مرضی کے خلاف فتویٰ کیوں دیتے تھے۔

رہا حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور قتل کا واقعہ، تو پیدائش کے سلسلہ میں وہ حضرت عیسیٰؑ کی غیر معمولی شخصیت کے معترف

تھے۔ پیدائش کے وقت ان کا کلام کرنا اور پھر کئی معجزات کا ان سے ظاہر ہونا معمولی بات نہ تھی کہ یہودیوں کے دل پر اثر نہ ہوتا مگر جب انہوں نے ایک کنواری لڑکی کی گود میں بچہ دیکھا تو ان میں یکایک غصہ کی لہر دوڑ گئی اور بے شمار لوگ حضرت مریمؑ کے گرد جمع ہو گئے اور سوالات کی بھرمار کر دی لیکن جب حضرت عیسٰیؑ نے آغوشِ مادر ہی میں کلام کیا اور فرمایا، میں اللہ کا بندہ ہوں خدا نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ تب اُن کی سمجھ میں آیا کہ یہ ولادت معجزہ سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ یہودیوں نے زبانِ طعن کھولی تھی۔

لیکن جب حضرت عیسٰیؑ تیس سال کے ہوئے اور انہوں نے کارِ رسالت کا آغاز کیا اور یہودیوں کی بدکاریوں پر سختی سے ٹوکا، ان کے علماء کو ان کی ریاکاریوں اور غلط فتوے دینے پر جھڑکا تو وہ سب حضرتؑ کے خلاف ہو گئے اور جو بات تیس سال کے اندر نہ کہی تھی وہ کہنے لگے یعنی حضرت مریمؑ کو زانیہ اور حضرت عیسٰیؑ کو معاذ اللہ ولد الزنا کہنا شروع کر دیا اور علماء ان کے قتل کے فتوے دینے لگے۔ قوم کے سرداروں نے پبلک کے سامنے پرجوش تقریریں کر کے ان کی مخالفت پر اکسایا۔ ان کی جہالت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ انبیاء کے قتل کو فخریہ بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ چونکہ وہ ہماری برائیوں پر ٹوکتے تھے اور ہم کو جہنم کا ایندھن کہتے تھے لہٰذا ہم نے ان کو قتل کر دیا۔ چونکہ مسیح نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے لہٰذا ہم ان کو بھی چھوڑنے والے نہیں قتل کریں گے اور سُولی پر چڑھائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بادشاہ ہیرودیس کو بھڑکا کر ان کے قتل کی اجازت حاصل کر لی۔

۳۔ جب بادشاہ کا حکم حاصل کر لیا گیا تو اب حضرت عیسٰیؑ کے قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کی تیاری شروع ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰیؑ کو اُٹھا لیا۔

۴۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ مسیح نے صلیب پر جان دی۔ یہودیوں نے جس شخص کو سُولی پہ چڑھایا وہ حضرت عیسٰیؑ نہ تھے بلکہ وہ یہودی تھا جو آپؑ کا ہمشکل بقدرتِ خدا بن گیا تھا۔ اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا گیا، اس کے منہ پر تھوکا گیا۔ یہودی اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے مسیحؑ کو صلیب پر چڑھا کر ان کی جان لے لی۔ عیسائیوں کے اقوال اس بارہ میں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے جو صلیب پر چڑھا وہ مسیح نہ تھا بلکہ ان کی شکل کا کوئی اور تھا مسیح تو وہیں کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا کوئی کہتا ہے صلیب پر چڑھائے تو گئے مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی۔ کوئی کہتا ہے صلیب پر وفات پائی اور پھر جی اُٹھے اور اپنے حواریوں سے باتیں کیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں یہودی ہوں یا عیسائی شک و شبہ میں دونوں پڑے ہوئے ہیں۔

۵۔ قرآن نے دونوں کے خیالات کی تردید کر دی اور صاف لفظوں میں بتا دیا کہ نہ ان کو قتل کیا گیا تھا نہ صلیب دی گئی تھی بلکہ اللہ نے ان کو زمین سے اُٹھا لیا۔

۶۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ رفع روحانی تھا نہ کہ جسمانی۔ مرنے کے بعد تو ہر شخص کی رُوح اُوپر ہی جاتی ہے پھر حضرت عیسٰیؑ کی کیا تخصیص ہوئی۔ عام آدمیوں کی رُوحیں انبیاء و مرسلین کی ارواحِ مقدسہ کا رفع تو ضرور ہوتا ہے پھر قرآن میں خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسٰیؑ کے رفع کا ذکر کیوں کیا گیا۔ اگر صرف رُوح کا رفع ہوا ہوتا تو جہاں ان کا جسم سپردِ خاک کیا گیا ہوتا، وہ عیسائیوں کی زیارت گاہ ہوتا۔ ان کا مقبرہ سونے چاندی سے بنایا جاتا۔ قادیانیوں کا کہنا کہ اُن کی قبر کشمیر میں ہے دروغِ بے فروغ ہے جو شخص کشمیر میں آیا ہی نہیں اس کی قبر کشمیر میں کیسے بن گئی۔ ممکن ہے اس نام کا کوئی اور شخص ہو۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہو گا جو حضرت عیسٰیؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آیا ہو گا اور روزِ قیامت وہ ان پر گواہی دے گا۔ یہودیوں کے اس ظالمانہ رویہ کی بنا پر کہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں سود لیتے ہیں ناجائز مال کھاتے ہیں۔ ہم نے بہت سی پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان پر حلال تھیں اور جو ان میں کافر ہیں ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی موت سے پہلے تمام یہودی ایمان لے آئیں گے لیکن اب تک چونکہ ایسا نہیں ہوا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسٰیؑ کی موت واقع نہیں ہوئی نہ ان کو سُولی دی گئی اور نہ ان کو قتل کیا گیا۔ جب ظہورِ امام مہدی آخر الزمان کے وقت وہ آسمان سے اُتریں گے اس وقت تمام یہودی جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ایمان لے آئیں گے۔ اس وقت تمام مذاہب کے لوگ ایک ہی مذہب پر ہوں گے۔ سوائے دینِ اسلام کوئی دین باقی نہ رہے گا۔ حضرت عیسٰیؑ حضرت امام مہدیؑ آخر الزمان کی اقتداء میں آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چونکہ وہ زمانہ حضرت رسولِ خدا کی نبوت میں داخل ہو گا لہٰذا اُن کے نائب و جانشین ہی کا حق ہو گا کہ وہ فرائضِ امامت انجام دیں۔

یہودیوں کی پے در پے شرارتوں اور بہ کثرت نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کئی حلال چیزیں حرام کر دی گئی تھیں۔

ان آیات میں ان کی تین مذموم صفتیں بیان کی گئی ہیں اوّل یہ کہ لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے۔ دوسرے کم بخت سود در سود لیتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے لوگ تباہ ہو گئے۔ جب ان کا قرضہ سُود در سُود کی لپیٹ میں آ کر بہت بڑھ جاتا تھا اور لوگ دینے کے قابل نہ رہتے تھے تو وہ ان کی عورتوں اور بچوں کو ضمانت میں لے لیتے تھے اور ان سے لونڈی غلاموں کی طرح کام لیتے تھے۔ تیسرے حیلہ اور مکر سے لوگوں کا مال کھاتے تھے جو ان پر حرام تھا۔ مشرکوں کی طرح یہ بھی مسلمانوں کے پکے دشمن تھے اور ان کی نسلیں بھی آج تک اُسی ڈگر پر چلی آ رہی ہیں۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

لیکن اے رسول ان یہودیوں میں بھی جو پایہ کے عالم ہیں اور دوسرے ایمان لانے والے جو ایمان لائے ہیں اس پر جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے اور باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تو ایسے لوگوں کو ہم اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

یہودیوں میں جہاں جہالت کے لفافوں میں لپٹے ہوئے لوگ تھے وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے آسمانی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے ان میں کئی شخص تو کھلم کھلا مسلمان ہو گئے تھے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

ہم نے تم پر اے رسول اس طرح وحی بھیجی جیسے نوح پر اور ان کے بعد آنے والے نبیوں پر بھیجی تھی اور ہم نے وحی کی تھی ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب و اسباط و عیسٰی و ایوب و یونس و ہارون و سلیمان کو۔ اور ہم نے داؤد کو زبور دی اور ہم نے تم کو بھی ایسا ہی رسول مقرر کیا جیسا اور رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے پہلے ہی بیان کر دیا ہے اور ان رسولوں کو بھی بھیجا جن کا حال ہم نے تم سے نہیں بیان کیا اور اللہ نے موسٰی سے باتیں بھی کیں اور ہم نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھی بھیجے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کی کوئی حجت خدا پر باقی نہ رہے اللہ تو بڑا زبردست حکیم ہے۔

زبور حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی اس میں مناجاتیں ہیں دعائیں ہیں جو جناب داؤدؑ پڑھا کرتے تھے۔ عمل توریت ہی کے احکام پر ہوتا تھا۔ توریت کی مانند یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی طرف سے بھی کچھ چیزیں داخل کر دی ہیں جن کو نغموں یا راگوں کی طرح گایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو بڑی دلکش آواز دی تھی۔ جب پہاڑوں کے درمیان علی الصبح ان مناجاتوں کو پڑھتے تھے تو درندے چرندے پرندے آپؑ کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور آپؑ کی خوش الحانی میں ایسے محو ہوتے کہ درندہ کے پاس چرندہ اور باز کے پاس کبوتر بیٹھا رہتا مگر کسی کو کسی کی خبر نہ رہتی۔

خداوندِ عالم نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے بروایت مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو بھیجا۔ ان میں سے کچھ کے قصے تو قرآن میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور اکثر کے حالات کو پردۂ خفا میں رکھا گیا ہے۔ ہر رسول صاحبِ وحی ہوتا ہے۔ انبیائے سابقین پر وحی کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ فضا میں ایک آواز پیدا ہوتی جس کو نبی ہی سمجھ سکتا تھا۔ یا خواب میں کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی فرشتے آ کر خدا کا حکم بیان کر دیتے تھے یا کوئی خوشخبری سناتے تھے۔ سب سے پہلے وہ رسول جس سے خدا نے اس طرح باتیں کیں جس طرح آمنے سامنے بیٹھ کر دو آدمی باتیں کرتے ہیں وہ حضرت موسٰیؑ تھے۔ کبھی ایسا مکالمہ وادی مقدس میں ہوا اور کبھی طور پر۔ حضرت رسولِ خدا کے لیے وحی کی جتنی صورتیں تھیں وہ سب مخصوص ہو گئیں۔ آپؐ کے قلبِ اقدس پر القاء بھی ہوتا تھا۔ فرشتہ بھی آ کر احکامِ الٰہی سناتا تھا۔ خواب میں بھی آپؐ کو بتایا جاتا تھا۔

ہر رسول بشارت دینے والا ہوتا تھا ان لوگوں کے لیے جو خدا کے نیک بندے ہوتے تھے اور احکامِ الٰہی پر بطیبِ خاطر عمل کرتے تھے۔ یہ خوشخبری کبھی تو داخلۂ جنت کے متعلق ہوتی تھی کبھی خوشنودیٔ خدا کے بتانے کے لیے اور کبھی کافروں پر فتح پانے کے لیے۔ اور جو لوگ خدا کے نافرمان بندے ہوتے تھے ان کو عذابِ آخرت سے ڈرایا جاتا تھا۔ دنیا میں ان کی ذلت و رسوائی کی خبر دی جاتی تھی۔ اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیج کر حجت تمام کر دی اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے پاس تیرے احکام کا بتانے والا کوئی آیا ہی نہ تھا۔ ہر خطۂ زمین پر انبیاء کے ذریعہ سے ہدایت کو پہنچا دیا گیا تھا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ ۙ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

اللہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے اپنے علم و حکمت کی بنا پر نازل کیا ہے اور ملائکہ بھی

اس کے گواہ ہیں اور اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکا وہ گمراہی میں بہت دُور جا پڑے جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور نہ ان کو راہِ راست تک پہنچانے والا، مگر ہاں ان کو جہنم کا راستہ دکھائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے رسول دینِ حق لے کر آئے ہیں پس ایمان لاؤ اور اگر تم انکار کرو گے تو (کچھ پروا نہیں) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ تو بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اے اہلِ کتاب دین کے معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کے بارہ میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ مسیح عیسٰی بن مریم اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا اور عیسٰی اس کی رُوح ہیں پس تم اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین خدا کے قائل نہ ہو اپنی بھلائی کا قصد کرو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ ایک ہی ہے وہ اس سے پاک و منزّہ ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ تو سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہے (پھر اسے بی بی بیٹے کی کیا ضرورت) ۔ خدا کی کارسازی کافی ہے۔

اہلِ کتاب میں یہود و نصارٰی اپنے غلو کی بنا پر حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ یہودیوں کا جرم یہ تھا کہ وہ مسیحؑ کو رسول ہی نہیں مانتے تھے اور عیسائیوں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے مسیحؑ کو افراطِ محبت میں خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ دونوں عقیدے غلط ہیں۔ یہودی اس لیے کہ خدا نے جس طرح آدمؑ کو بے ماں باپ کے پیدا کیا اسی طرح عیسٰیؑ کو بے باپ کے پیدا کر دیا۔ جب آدمؑ کی پیدائش اس کے لیے دشوار نہ تھی تو عیسٰیؑ کی پیدائش کیوں دشوار ہوتی۔ عیسائیوں کو اس طرح خاموش کیا کہ جب تمام آسمان و زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُس کا ہے تو اسے بیٹے کی کیا ضرورت تھی۔ باپ کو بیٹے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں وہ اس کا مددگار ہوگا لیکن خدا جب کسی چیز کا محتاج ہی نہیں تو اُسے اولاد کی کیا ضرورت ہے۔ باپ ہو یا بیٹا سب ان چیزوں کے محتاج ہیں جو خدا نے اپنی قدرت سے پیدا کی ہیں تو پھر جو اس کی مخلوق کا محتاج ہو وہ اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰیؑ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے پس وہ حادث ہوئے اور جو حادث ہو وہ قدیم کا نہ شریک ہو سکتا ہے نہ اس کی اولاد کہلا سکتا ہے۔

روح اور کلمہ کو رحم مریمؑ میں کس طرح ڈالا اس کو نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ اس کے سمجھنے کی ضرورت۔ اُس نے بے شمار مخلوق پیدا کی ہے انسان ان میں سے کسی کے رازِ خلقت کو بھی نہ سمجھ سکا ہے نہ سمجھے گا۔ ایک دانہ جو زمین میں بو یا جاتا ہے قوّتِ نامیہ کس طرح اس کے اندر داخل ہوتی ہے اور کیا کیا کام کرتی ہے کسی علمِ نباتات کے ماہر کی طاقت نہیں کہ اس راز کی نقاب کشائی کر سکے۔

عیسائیوں نے خدا کے سوا دو خدا اور شامل کر لیے ایک روح القدس اور ایک مسیح۔ اور عقیدہ یہ بنایا کہ تینوں مل کر ایک ہیں اور ایک میں تینوں ہیں۔ کوئی پوچھے کہ اگر خدا کو اپنے کام انجام دینے میں دو کی اور ضرورت تھی تو وہ محتاج الی الغیر ہو گیا۔ اور جو دوسروں کا محتاج ہو وہ قدیم بالذات نہیں ہو سکتا اور اسے احتیاج نہ تھی تو ان غیر ضروری اجزا کو اپنی الوہیت سے چپکا یا کیوں۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

نہ تو مسیح خدا کا بندہ ہونے میں عار رکھ سکتے ہیں اور نہ ملائکہ مقربین اور جو کوئی خدا کی عبادت سے عار رکھے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ان کو عنقریب ہی اپنی طرف اُٹھا لے گا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے تو پیدا ہوتے ہی اس کا اقرار کر لیا تھا کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔ رہے ملائکہ تو انہوں نے پیدائش آدم علیہ السلام کے وقت ہی اس کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ خدا کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ پھر وہ عبادتِ خدا سے کیسے عار رکھ سکتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٣﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ
فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٥﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا
نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا
الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٧٦﴾

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے اچھے کام کیے ہیں ہم ان کو بھرپور بدلہ دیں گے اور ان کے فضل کو زیادہ کریں گے
اور جنہوں نے ہماری عبادت کو عار سمجھا اور تکبر کیا ان کو دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور وہ خدا کے
علاوہ کسی کو اپنا سرپرست اور مددگار نہ پائیں گے۔ لوگو، تمہارے رب کی طرف سے حق کی دلیل آچکی اور ہم
تمہاری طرف ایک چمکتا ہوا نور بھی نازل کر چکے پس جو لوگ ایمان لے آئے اور اس سے لپٹے رہے تو اللہ عنقریب
ہی ان کو اپنی رحمت و فضل کے باغوں میں پہنچا دے گا اور ان کو اپنی حضوری کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔
اے رسول لوگ تم سے فتویٰ طلب کرتے ہیں تم ان سے کہہ دو کلالہ (بھائی بہن) کے بارہ میں خدا خود تمہیں فتویٰ دیتا
ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص مر جائے کہ اس کے نہ کوئی لڑکا ہو (نہ ماں باپ) صرف ایک بہن ہو تو اس کو ترکہ کا آدھا
ملے گا اور اگر یہ بھی مر جائے اور اس کے اولاد نہ ہو (نہ ماں باپ) تو اس کا وارث صرف یہی بھائی ہوگا اور اگر دو بہنیں
(یا زیادہ) ہوں تو ان کو بھائی کے ترکہ سے دو تہائیاں ملیں گی اور کسی کے ورثہ میں بھائی بہن دونوں ملے جلے ہوں

تو مرد کو عورت کے حصہ کا دوگنا ملے گا تم لوگوں کے بھٹکنے کے خیال سے خدا اپنے احکام بہت واضح طور سے
بیان کرتا ہے اور خدا تو ہر چیز سے واقف ہے۔

تفسیر صافی میں مروی ہے کہ ایک بار جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے آنحضرتؐ ان کی عیادت کو
تشریف لے گئے انہوں نے پوچھا میرا ایک سوال یہ ہے کہ میں اپنے مال میں کس طرح عمل کروں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔
لَهٗۤ اُخْتٌ کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہاں اخت سے مراد عام نہیں ہے خواہ ماں باپ
دونوں کی طرف سے ہو یا صرف باپ کی طرف سے جسے علاتی کہتے ہیں۔

(۵) سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى
عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ﴿١﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ
اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ
فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾

اے ایمان والو، اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ تمہارے لیے چوپائے جانور اور وہ جو تم کو پڑھ کر سناتے جائیں گے
حلال کر دیئے گئے۔ مگر جب تم حالتِ احرام میں ہو تو شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے

اے ایمان والو، نہ تو خدا کی نشانیوں کی بے توقیری کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ قربانی اور نہ پٹے والے جانوروں کی (جو نذرِ خدا کے لیے نشان دے کر منیٰ میں لائے جاتے ہیں) اور نہ خانہ کعبہ کی زیارت کا قصد کرنے والوں کی جو خدا کی خوشنودی کے جویا ہیں۔ اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو۔ کسی قبیلہ کی یہ عداوت کہ تمہیں ان لوگوں نے خانہ کعبہ میں جانے سے روکا تھا، اس جُرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو اور تمہارا فرض تو یہ ہے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

جانوروں کی حِلّت و حرمت کے متعلق یہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ یہ کیوں حلال ہیں وہ کیوں حرام ہے۔ حلال اس لیے ہے کہ ہمارے خالق و مالک نے اُسے حلال کیا اور حرام اس لیے ہے کہ ہمارے خالق و مالک نے اسے حرام کیا ہے۔ اَنعام کا لفظ اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ لیکن بھیمہ کا لفظ ہر چرندے پر بولا جاتا ہے جس کے منہ میں کیلے نہیں ہوتے اور گوشت نہیں کھاتا لہٰذا بھیمہ کہنے سے ہرن، نیل گائے، پاڑھے وغیرہ بھی حلال سمجھے جائیں گے۔

شعائر اللہ کے معنی خدا کی نشانیاں ہیں جیسے صفا و مروہ۔ قربانی کا اونٹ، خدا نے کسی اہم واقعہ کو باقی رکھنے کے لیے اپنی نشانی قرار دیا ہے پس کسی کو ان کی توہین کرنے کا حق نہیں۔ کسی حکومت کا جھنڈا اس حکومت کی عزت و وقعت کا نشان ہوتا ہے اگر کوئی اس کی توہین کرتا ہے تو حکومت کے نزدیک وہ گنہ گار قرار پاتا ہے لہٰذا جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا وہ اس کے دل کے تقوے کا ثبوت ہوگا۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کسی کی دشمنی تمہیں حد سے آگے نہ بڑھا دے۔ حطم بن منذر خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا آپؐ کس بات کی دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا اللہ کی توحید اپنی نبوت اور نماز و زکوٰۃ کی۔ وہ کہنے لگا اپنی قوم سے مشورہ کے بعد عرض کروں گا۔ وہ بدبخت راستہ میں چند اونٹ جو صدقے کے تھے ہنکا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ حضرتؐ عمرہ کے لیے جب مکہ میں پہنچے تو دیکھا وہ انہی اونٹوں کو تہرے پٹے ڈال کر لایا ہے۔ صحابہؓ نے چاہا کہ اسے قتل کر کے اونٹ چھین لیں۔ حضرتؐ نے منع فرمایا کہ یہ اس کے حق میں زیادتی ہوگی۔ اسی کے متعلق یہ آیت ہے۔

مطلب یہ کہ حقیقتاً جتنا ظلم کسی نے تم پر کیا ہے بدلہ میں اس سے زیادہ نہ بڑھو۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا

ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ط ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ط فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ لا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣﴾

تم پر حرام کر دیا گیا ہے مُردار، خون، سؤر کا گوشت اور جو اللہ کا نام لیے بغیر ذبح کیا جائے اور گردن مروڑا ہوا اور چوٹ کھا کر مرا ہوا۔ کنوئیں میں گر کر مرا ہوا، سینگ مارنے سے مرا ہوا، جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو مگر جسے تم نے مرنے سے پہلے ذبح کر لیا ہو اور جو جانور بتوں کے تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جائے اور جسے تم پانسے کے تیروں سے باہم حصہ بانٹو یہ سب گناہ کی بات ہے مسلمانو اب تو کفار تمہارے دین سے پھر جانے سے مایوس ہو گئے بس تم ان سے ڈرو ہی نہیں مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ لیکن جو شخص بھوک سے مضطر ہو جائے اور گناہ کی طرف مائل نہ ہو اور (حرام چیزوں میں سے کوئی چیز) کھا لے تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کا مقدم و موخر آیات سے کیا ربط ہے۔ ابتدا میں جو ذکر حرام چیزوں کا تھا آخر میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ اس سلسلہ کی ایک چیز ہے۔ آیہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ کو اس سے کوئی ربط ہی نہیں اگر یہ آیت بیچ میں سے نکال لی جائے تو سلسلہ کلام میں کوئی بے ربطی پیدا نہ ہوگی بلکہ مربوط ہو جاتا ہے۔

۲۔ تمام مفسّرین نے اس آیت کی شانِ نزول مقامِ غدیرِ خم ہی لکھی ہے۔ جب حضورؐ حجِ آخر سے واپس آ رہے تھے۔ اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے کی آیات کو بھی وہیں نازل ہونا چاہیئے لیکن ایسا کسی نے نہیں لکھا۔ سورۂ مائدہ تو اگر یہ آیات آیہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ کے ساتھ ضم کی جائیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۲۳ سال تک مسلمانوں کو یہی نہیں بتایا گیا تھا کہ کون سے جانور تم پر حلال ہیں اور کون سے حرام۔ اگر ایسا نہیں تو ماننا پڑے گا کہ آیہ اکملت سے بہت پہلے اوّل و آخر والا مضمون نازل ہو چکا تھا۔

۳۔ کسی مصلحت کے تحت آیت تطہیر کی طرح اسے بھی بیچ میں لا کر رکھ دیا ہے تاکہ حضرت علیؑ کی خلافت کے اثبات میں اس آیت کو کوئی پیش نہ کر سکے۔

۴۔ یہ بھی تو غور کیا جائے کہ حرام جانوروں کے بیان کو تکمیلِ دین سے کیا تعلق ہے۔ تکمیلِ دین تو اصولوں کی تکمیل

سے ہوتی ہے نہ کہ فروعی مسائل سے۔

۵۔ حرام جانوروں کے بیان کے بعد کفار کو مایوسی اس خیال کے تحت کیوں ہوئی کہ اب مسلمان اپنے دین سے نہ پھریں گے کیا حلال گوشت کھانے والے مرتد نہیں ہو گئے تھے۔

۶۔ لفظ الیوم بتاتا ہے کہ اس سے پہلے دین کامل نہ ہوا تھا پس حلال و حرام جانور کی تمیز ہوتے ہی دین کامل ہو گیا تھا۔ کیا مزہ کی بات ہے۔

۷۔ کیا حلال و حرام جانوروں کی آیت کے بعد پھر کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ اگر ہوا تو دین میں کچھ نقص رہ گیا تھا جو بعد کو پورا ہوا۔

۸۔ کفار کو مایوسی تو اس بنا پر ہونی چاہیئے تھی کہ دینِ اسلام کی جڑیں اب ایسی مضبوط ہو گئیں کہ قیامت تک کوئی اُسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے احکام کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ہو گیا ہو۔

۹۔ اس کے بعد ہم اس آیت کی صحیح شانِ نزول تفسیر دُرِ منثور سیوطی جلد ۴ صفحہ ۲۰۹ سطر ۴ مطبوعہ مصر سے تحریر کرتے ہیں :

جب رسُولِ خدا حجِ آخر سے فارغ ہو کر مدینہ کو واپس چلے تو راستہ میں ۱۸ ذی الحجہ کو مقام غدیرخم میں یہ تاکیدی حکم نازل ہوا کہ اے رسول تم لوگوں کی مخالفت سے نہ ڈرو اور جو حکم میں نے تمہارے پاس بھیجا ہے اُسے اپنی امت کو پہنچا دو آپؐ نے فوراً لوگوں کو روکا اور مجمع کثیر کے سامنے ایک طولانی خطبہ کے بعد حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَہٗ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَہٗ (میں جس کا حاکم ہوں اس کا علی بھی حاکم ہے یا اللہ جو اسے دوست رکھے اُسے تو بھی دوست رکھ جو اس کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر جو اسے ذلیل کرے تو بھی اسے ذلیل کر) اس کے بعد لوگوں نے مبارکباد دی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بھی کہا "اے علیؑ مبارک ہو کہ تم میرے اور کل مومنین و مومنات کے حاکم ہو گئے"۔

غدیرخم میں حضرت علیؑ کی خلافت

۱۰۔ مولانا مودودی صاحب نے بھی تفہیم القرآن میں آیہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ کا روزِ غدیر نازل ہونا تسلیم کیا ہے۔ بس جبکہ آخری آیت ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کا تعلق واقعہ غدیر سے نہ ہو اور یہ نہ سمجھا جائے کہ خلافتِ علیؑ کے اعلان کے بعد دینِ اسلام اپنے اصول کے لحاظ سے مکمل ہو گیا۔ اور خدا کی نعمت یعنی ہدایت کے لیے جو چیزیں ضروری تھیں وُہ سب پُوری ہو گئیں ۔ الیوم کا لفظ بتاتا ہے کہ آج دین کامل ہوا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا اور یہ کہ آج نعمتیں پوری ہو گئیں اس سے پہلے نہ تھیں اور یہ کہ آج خدا نے مسلمانوں کے لیے دینِ اسلام کو پسند فرما لیا اس سے پہلے نہیں ۔ جو دین قیامت تک جانے والا تھا اگر اس کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست ہوتا تو وہ اپنے تمام شرائط و احکام کے ساتھ باقی کیسے رہتا۔ جب اس دین کے تہتر فرقے ہو جانے تھے تو ضرور ان میں ناجی فرقہ تو ایک ہی ہو سکتا تھا پس ایسے فرقہ کی بقا ہر زمانہ میں ضروری تھی اور بقا کی اگر صورت نہیں ہو سکتی مگر جبکہ ہر زمانہ میں ایک منصوص من اللہ امام اس کے ساتھ چلتا ہے۔ اس سلسلہ کے پہلے امام حضرت علیؑ معین ہوئے اور ان کے بعد اپنے اپنے دور کے امام آتے رہے ۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ ط قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ لا وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ز فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝۴ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ط وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ص وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ ز

اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کون کون سی چیز ان کے لیے حلال کی گئی ہے کہدو تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور جو شکاری جانور تم نے پال رکھے ہیں اور تم نے ان کو وہ طریقے سکھا رکھے ہیں جو خدا نے تم کو بتا دیے ہیں یہ شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بے تامل کھاؤ اور جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ آج تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں اور اہلِ کتاب کی خشک چیزیں (غلہ وغیرہ) بھی تمہارے لیے حلال ہیں۔ اور تمہاری خشک چیزیں ان کے لیے بھی حلال ہیں ۔

اس آیت سے جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا چھوا ہوا تر کھانا حلال ہے انہوں نے غلط سمجھا ہے۔ جب بمصداق آیہ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ۔ مشرک نجس ہیں اور نجس العین ہیں تو ان کا بنایا ہوا یا پکایا ہوا تر کھانا بھی ضرور نجس ہوگا پس اس آیت میں طعام سے مراد میوے۔ پھل پھلاری اور غلہ ہے۔ شانِ نزول یہ ہے کہ جس طرح ہندوؤں سے ہندوستان کے مسلمانوں کا میل جول ہے اسی طرح عرب کے مسلمانوں کا بُت پرستوں سے میل جول تھا اور یہود و نصاریٰ سے ان کے تعلقات میں کشیدگی تھی۔ وہ بُت پرستوں کے تو ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے ہوئے تھے اور اہلِ کتاب سے اس درجہ عداوت رکھتے تھے کہ تر چیزوں کا کیا ذکر وہ بسلسلۂ تجارت جو خشک میوے اور غلے بیچنے کو لاتے تھے ان کو بھی نہ خریدتے تھے اور نجس سمجھتے تھے۔ اس بنا پر اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے خشک چیزیں خرید کر کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔

طعام کے سلسلہ میں اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھانا بھی جائز نہیں کیونکہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح نہیں کرتے۔ مفسرین عام نے ان کے ساتھ کھانا پینا اور ان کی پکائی ہوئی ہر شے کھانا اس شرط سے جائز رکھا ہے کہ اگر شراب یا سؤر کے گوشت کی آمیزش نہ ہو۔ لیکن یہ تو زبردستی ہے جب مشرک نجس العین ہے جو چیز اس سے متصل ہوگی وہ ناپاک قرار پائے گی۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٥ ع

اور وُہ آزاد پاکدامن عورتیں حلال ہیں ان لوگوں کی آزاد پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے جب تم ان کو ان کے مہر دے دو پاکدامنی کے ارادہ سے نہ کھلم کھلا زناکاری اور نہ چوری چھپے آشنائی کے لیے ۔ اور جس شخص نے ایمان سے انکار کیا تو اس کا سب کیا دھرا اکارت ہوگیا اور وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔

مطلب ان آیات کا یہ ہے کہ جو پاکدامن عورتیں خواہ یہودی ہوں یا نصرانی ایمان لے آئی ہیں ان سے نکاح جائز ہے اور پاکدامن عورتیں جو اہلِ کتاب سے ہوں ان سے بہ ادائے مہر متعہ کر سکتے ہو۔ نکاح دائمی نہیں کیونکہ بدوں ایمان لائے ان سے نکاحِ دائمی کی اجازت نہیں دی گئی جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (مشرکہ عورتوں سے جب تک ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو ۔ رہا متعہ تو اس کی صورت عیاشی کی نہ ہو بلکہ ایک شرعی اور فطری ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے ہو۔ نکاح دائمی میں یہ اندیشہ ہے کہ درصورت مسلمان نہ ہونے کے اگر وہ کوئی سازش کر بیٹھی تو یہ نقصان دہ ہوگا۔ متعہ میں اگر سازش کا پتہ چلے تو چند روز بعد اس کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ نکاح کی صورت میں مہر کے متعلق جھگڑے کا اندیشہ ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦

اے ایمان والو، جب تم نماز کے لیے آمادہ ہو تو اپنا منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں کا مسح کر لیا کرو اور اگر حالتِ جنابت میں ہو تو غسل کر لو۔ ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کسی کو پاخانہ نکل آئے یا عورتوں سے ہم بستری کی ہو اور تم کو پانی نہ مل سکے تو پاک خاک سے تیمم کر لو یعنی مٹی یا خاک پر اپنے دونوں ہاتھ مار کر اس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو (دیکھو خدا نے کیسی آسانی کر دی ہے) خدا یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی قسم کی تنگی کرے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ پاک و پاکیزہ کر دے اور تم پر اپنی نعمت پُوری کر دے تاکہ تم شکرگزار بن جاؤ۔

شیعوں کے نزدیک وضو کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں تین چلو پانی کا استعمال کرے ایک چلو سے منہ دھوئے دوسرے سے داہاں ہاتھ اور تیسرے سے بایاں پھر وضو کی بقیہ تری سے سر اور پاؤں کا مسح کرے۔ منہ کو اس طریقہ سے دھوئے کہ اوپر سے نیچے کو دھوتا ہوا آئے نیچے سے اوپر کو نہیں ورنہ وضو باطل ہوگا، کیونکہ یہ دھونے کا اُلٹا طریقہ ہوگا۔ دوسرے داہنے ہاتھ سے منہ پر چلو ڈالے اور اس کو کھینچتا ہوا آخر تک لائے۔ کیونکہ جو کام ایک ہاتھ سے ہو سکتا ہے اس میں دوسرے ہاتھ کو شامل کرنا فعلِ عبث ہے۔ ہاتھوں کو دھونے کی ابتدا کہنی سے کرے اور ہاتھ پھیرتا ہوا انگلیوں کے سرے تک لائے۔ نیچے سے دھوتا ہوا کہنی تک نہ لے جائے کیونکہ دھونے کا یہ بھی الٹا طریقہ ہے ۔
سر اور پیر دونوں کا مسح ہے۔ پیر کا دھونا وضو میں شامل نہ کیا جائے۔ سر کا مسح قُبّہ سر سے لے کر بال اُگنے کی جگہ تک ہو۔ سارے سر اور کانوں کو شامل نہ کیا جائے۔ اگر پیروں کا دھونا واجب ہو تو کمی آب کی صورت میں انسان وضو نہ کر پائے گا۔ ہمارے ائمہ طاہرین سے یہی منقول ہے۔ باقی مسائل کتبِ فقیہہ میں دیکھنے چاہئیں۔ تیمم اگر بعوض غسل ہو تو دوبار ہاتھوں کو خاک پر مارے ایک بار چہرہ کا مسح کرے دوبارہ ہاتھ مار کر ہاتھوں کا۔ اگر بعوض وضو ہے تو صرف ایک ضرب کے بعد دونوں جگہوں کا مسح کرے۔ طریقہ غسل و تیمم و وضو کتبِ فقیہہ میں دیکھیے ۔
اتنی بات ضرور سمجھ لینی چاہیئے کہ آیہ وضو کے دو حصے ہیں :
فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ ۔ فاغسلوا فعل کے تحت چہرے اور ہاتھوں کو دھونا چاہیئے۔ دوسرا حصہ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ میں امسحوا فعل کے تحت سر اور پیر کا مسح ہونا چاہیئے۔ ارجلکم میں زبر لگا دیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ فاغسلوا کا مفعول ہے لیکن بیچ میں وامسحوا برءوسکم کا فصل اجنبی آنے سے یہ تعلق صحیح نہیں ہوتا جب ایک فعل قریب موجود ہے تو دُور کے فعل سے کیوں تعلق پیدا کیا جائے ـــــ چونکہ یہ کتاب مناظرہ کی نہیں لہٰذا اسی پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ شیعی طریقہ کی صحت پر بیشمار دلائل ہیں ۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑦ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑧

جو احسانات اللہ نے تم پر کیے ہیں ان کو اور جو تم پکا اقرار خدا سے کر چکے ہو ان کو یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سُنا اور دل سے مان لیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ دل کے اندر کی باتوں تک کو جانتا ہے۔ اے ایمان والو، خدا کی خوشنودی کے لیے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے تیار رہو کسی قوم کی عداوت تمہیں اس جرم میں نہ پھنسا دے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔ انصاف سے کام لو وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب کر دینے والا ہے۔ اللہ سے ڈرو جو تم کرتے ہو بے شک اللہ اس سے خبردار ہے۔

تمدنی یا معاشرتی نظام میں اگر لوگ عدل و انصاف سے کام نہ لیں اور ناانصافی کا دور دورہ ہو تو وہاں امن و سکون کی برکتیں اُٹھ جاتی ہیں دنیا میں جتنے جھگڑے پیدا ہوتے محض اس بنا پر کہ ایک دوسرے کے معاملہ میں انصاف سے کام نہیں لیتا۔ اور اپنا فائدہ آگے رکھتا ہے۔ جب تک انسان عدل سے کام نہ لے گا تقویٰ کے قریب نہیں ہو سکتا۔ چاہے اپنا ذاتی معاملہ ہو یا اپنے کسی رشتہ دار کا یا کسی غیر کا۔ خدا سے ڈرنے والا انصاف سے کام لیتا ہے۔ چونکہ نظامِ حیات اور نظامِ کائنات میں عدل کو سب سے زیادہ دخل ہے اس لیے شیعوں نے توحید کے بعد دوسری اصل عدل کو قرار دیا ہے۔ کسی اور صفت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس قدر اہتمام نہیں کیا جتنا عدل کے متعلق کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ (آل عمران ع، آیت ۹) "اللہ گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ملائکہ اور علم والے اس پر گواہ ہیں کہ وہ انصاف کرنے والا ہے۔" جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا انبیاء تک کے قاتل کو بخش سکتا ہے تو پھر عدل کہاں قائم رہا۔ اگر خدا کے یہاں بھی قاتل و مقتول کے درمیان انصاف نہ ہو تو پھر کہاں ہوگا۔ جب وہ اپنے بندوں کو ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے تو خود کیوں نہ انصاف کرے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨ وَالَّذِيْنَ

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ ع

جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے ان سے اللہ نے بخشنے اور اجرِ عظیم عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ جہنمی ہیں۔ اے ایمان والو، جو احسان اللہ نے تم پر کیے ہیں ان کو یاد کرو۔ وہ وقت بھی یاد کرو جب ایک قبیلہ نے تم پر حملہ کا قصد کیا تھا تو اللہ نے ان کی دست درازی کو تم سے روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو چاہیئے کہ وہ بس اللہ ہی پر توکل کریں۔

— اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ غطفان کی لڑائی میں بنی ثعلبہ کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ لوگ اپنے سردار دعثور کے ساتھ قلعہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ حضورؐ اپنے لشکر سے علیحدہ ہو کر ایک درخت کے نیچے تکیہ لگا کر جا بیٹھے اور پسینہ سے تر کپڑوں کو سکھانے کے لیے درخت پر ڈال دیا آپؐ کو تنہا پا کر دعثور برہنہ تلوار لے کر آپؐ کے پاس آیا اور گستاخانہ انداز میں کہنے لگا اس وقت تم کو میری تلوار سے کون بچائے گا فرمایا، خدا۔ اسی وقت جبریلؑ نازل ہوئے اور اس زور سے اس کے سینہ پر ہاتھ مارا کہ اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی۔ آپؐ نے فوراً اس کی تلوار اُٹھالی اور فرمایا بتا اب تجھے میری زد سے کون بچا سکتا ہے اس نے کہا بے شک آپؐ کو کوئی ہلاک نہیں کر سکتا۔ آپؐ نے اس سے درگزر کی وہ فوراً مسلمان ہو گیا اور اپنی قوم سے کہا تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ج وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ⑫ فَبِمَا

نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ لَعَنّٰهُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَهُمۡ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنۡهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاصۡفَحۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾

اللہ نے بنی اسرائیل سے ایمان لانے کا عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار بنائے اور اللہ نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں بشرطیکہ تم نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرتے رہو اور اللہ کی خوشنودی کے لیے لوگوں کو قرضِ حسنہ دو تو میں تمہارے گناہ معاف کر دوں گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کے بعد جو کوئی تم میں سے کفر کرے گا تو وہ یقیناً سیدھے راستہ سے بھٹک گیا پس ہم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اُن پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو گویا ہم نے خود سخت بنا دیا۔ وہ ہمارے کلمات کو اصلی معنی سے ہٹا کر دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور جن جن باتوں کی نصیحت کی تھی ان میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے ہیں۔ اے رسول تم ان میں سے چند آدمیوں کے سوا ایک نہ ایک کی خیانت پر ضرور مطلع ہوتے رہتے ہو پس انہیں معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل کو مصر کی سلطنت ملی تو حکم ہوا ارضِ مقدس میں عمالقہ سے جا کر لڑو۔ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر عوج بن عوق کا واقعہ یوں تحریر فرمایا ہے :

"اگر ان سے لڑو گے تو تم کو ہزار شہر ایسے ملیں گے کہ ہر ایک میں ایک ایک ہزار باغات ہوں گے۔ غرض حضرت موسیٰؑ نے بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص کو سردار بنا کر کوچ کیا۔ وہ بارہ سردار عمالقہ کی تلاش میں جا رہے تھے کہ ان میں سے ایک شخص عوج بن عوق سے ملاقات ہوئی۔ جس کا قد تین ہزار تین سو تین گز تھا۔ اور بروایتے تین لاکھ ۳۳ ہزار ۳ ۲ گز کا تھا اور ابر سے بھی اس کا سر و سینہ باہر نکلا رہتا تھا ابر سے پانی نچوڑ کر استعمال کرتا تھا۔ سمندروں سے مچھلی نکال کر آفتاب سے بھون لیتا۔ طوفانِ نوح کا پانی جو پہاڑوں سے چار سو گز اونچا تھا اس کی پنڈلی تک آیا اور اس کی عمر تین ہزار برس تھی۔
غرض جب اس نے ان لوگوں کو دیکھا تو باوجودیکہ یہ لوگ بھی چالیس گز کے تھے مگر ان کی پستیٔ قد پر اس کو سخت تعجب ہوا اور اس نے ان لوگوں کو اپنے دامن میں رکھ کر کمر سے باندھ لیا اور اپنی ماں کے پاس ڈال دیا جس کا نام عوق تھا اور اس کی ایک ایک انگلی تین تین گز کی تھی اور کہنے لگا دیکھو یہ لوگ ہم سے لڑنے آئے ہیں۔ اس کی

ماں نے کہا ان کو مارو نہیں بلکہ چھوڑ دو تاکہ ہمارا حال اپنے لشکر سے جا کر بیان کریں اور اُلٹے پاؤں پھر جائیں جب یہ لوگ باغ میں گئے تو ایک ایک انار اتنا بڑا دیکھا کہ اس کے چھلکے میں پانچ آدمی سما سکیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے اور سارا قصہ چپکے سے بیان کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کو لڑنے کی ترغیب دی اور لشکر لے کر پہنچ گئے۔ جب عوج نے سُنا تو پہاڑ کا ایک ٹکڑا اپنے سر پر لے کر سارے لشکر کو تباہ کر دینے کے ارادہ سے چلا۔ خدا کی شان ایک جانور نے ہیرے کے ٹکڑے سے پتھر میں سوراخ کر دیا اور پتھر اس کے گلے میں طوق ہو گیا اور کسی طرح نہ نکل سکا۔ حضرت موسیٰؑ یہ دیکھ کر جوش میں بڑھے اور اچھل کر ایک عصا مارا۔ باوجودیکہ حضرت موسیٰؑ خود چالیس گز کے تھے اور چالیس گز کا عصا تھا اور چالیس گز اچھلے اس پر بھی اس کے ٹخنے تک پہنچے۔ غرض وہ گرا اور بنی اسرائیل نے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے ہر چند ہمت دلائی مگر بنی اسرائیل کی بزدلی نے آگے نہ بڑھنے دیا اور اپنے ملک کو واپس آئے۔ ایک روایت میں ہے کہ تین ہزار برس تک دریائے نیل پر اس کے پاؤں کی ہڈی کا پُل بنا رہا۔"

جناب مولانا مرحوم اگر اس روایت کو قرآن جیسی مقدس کتاب کے حاشیہ پر جگہ نہ دیتے تو اچھا ہوتا۔ قرآن میں تو کہیں اس عجیب و غریب قصہ کی طرف اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ تو طلسم ہوش رُبا کی سی کہانی معلوم ہوتی ہے جو احمقوں کا دل بہلانے کے لیے لکھی گئی ہے — اوّل سے آخر تک اس روایت کی ہر چُول ڈھیلی ہے۔ کچھ پتہ نہیں اتنی دراز قد قوم کس خطۂ زمین پر رہتی تھی اور ان کے مکانات کتنے اُونچے ہوتے تھے یا وہ یونہی کھلے آسمان کے نیچے شب و روز بسر کرتے تھے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ تین لاکھ ۳۳ ہزار ۳۳ گز کے آدمی بھی کبھی اس دُنیا میں بستے تھے۔ طوفان کا پانی جس نے اُونچے اونچے پہاڑوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ ان کے سردار کی پنڈلی تک آیا تھا۔ اور ابر سے اس کا سر و سینہ باہر نکلا رہتا تھا۔ راوی نے کیا مزہ دار بات لکھی ہے کہ ابر سے پانی نچوڑ کر پی لیتا تھا گویا ابر ایک کپڑا تھا۔ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ حضرات اس کو پڑھ کر اسلامی روایات کے متعلق کیا کہیں گے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ آفتاب سے مچھلی بھون کر کھا جاتا تھا۔ گویا تین لاکھ گز پر حدّتِ آفتاب اتنی ہو جاتی تھی کہ مچھلی بھُن جاتی تھی۔ چاند تک اُڑ جانے والے کیسے صحیح سالم آ گئے۔ فضا میں تیرنے والے جل بھُن کر نہ گرے۔ پھر باغ میں ایسے انار بھی تھے جن کے چھلکوں میں ۵ آدمی ایسے گھُس بیٹھتے تھے جن کے قد چالیس گز لمبے ہوتے تھے اسی لحاظ سے ان کی موٹائی بھی ہو گی۔ پھر موسیٰؑ چالیس گز لمبے تھے، چالیس گز لمبا عصا پھر چالیس گز اچھلے تب ایک سو بیس گز کی بلندی پر مارنے کے لیے عوج کا ٹخنہ ملا۔ یعنی اس کا پاؤں ایک سو بیس گز اونچا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ راوی نے روایت کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ اس کے پیر کی ہڈی کا پُل دریائے نیل پر تین ہزار برس تک بنا رہا اور اس پر آدمی مویشی گھوڑے گاڑیاں سب چلتے رہے۔ اگر پاؤں فولاد کے بنے ہوئے بھی ہوتے تو بھی اتنی مدت میں ناکارہ ہو جاتے مگر عوج کا پاؤں خدا جانے کس دھات کا بنا ہوا تھا کہ اس کی ہڈی نہ گلی نہ سڑی۔

پھر حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں نسلِ آدم میں یہ تغیر یکایک کیسے پیدا ہو گیا کہ چالیس چالیس گز کے قد ہونے لگے۔ کسی حدیث سے عہدِ موسیٰؑ کے انسانوں کے قد کا اتنے لمبے ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ قصہ کہانیوں کی کتابوں میں ایسی کہانیاں بہت سی ملتی ہیں۔ افسوس ہے تو اس کا کہ قرآن مجید کے پاک حاشیوں پر اس کذب و دروغ کی گندی سیاہی کو کیوں ملایا گیا۔

بنی اسرائیل نے نہ معلوم کتنی بار حضرت موسیٰؑ سے عہد و پیمان کیے مگر بار بار انہیں توڑتے رہے اور توریت کی عبارتوں میں لفظی و معنوی ہر طرح کا تصرف کرتے رہے۔ جب عمالقہ سے حضرت موسیٰؑ لڑنے کے لیے چلے تو بنی اسرائیل نے اقرار کیا کہ ہم جم کر لڑیں گے لیکن جب محاذ پر پہنچے تو ڈھیلے پڑ گئے اور لڑنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ یہ قوم بڑی جبار ہے ہم ان سے ہرگز نہ لڑیں گے۔ آپ اور آپ کا رب ان سے جا کر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ ان آیات میں ایسے ہی وعدے توڑنے اور ان پر خدا کی پھٹکار پڑنے کا ذکر ہے۔
ان کے دلوں کو سخت بنانے کا جو ذکر آیت میں آیا ہے تو خدا نے اس لحاظ سے ان کے دلوں کی سختی کو اپنی طرف نسبت دی ہے کہ جب اس کے علم میں یہ تھا کہ کسی طرح ایمان لانے والے ہی نہیں تو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور اپنی توفیقات کو ان سے روک دیا ورنہ خدا تو یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک بندہ ہدایت حاصل کرے اور اس پر ایمان لائے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ⑭ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ⑮ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ⑯

(یہودیوں کے علاوہ) جن سے ہم نے عہد لیا تھا وہ لوگ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا مگر جو کچھ انہیں سکھایا گیا تھا اس کا بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا۔ آخر ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے آپس میں دشمنی اور بغض کا بیج بو دیا اور جو کچھ وہ دنیا میں کر رہے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے کرتوتوں سے تمہیں آگاہ کر دیں گے۔ اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا جو کتابِ الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جایا کرتے تھے۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور روشن کتاب، جو لوگ خدا کی خوشنودی کے پابند ہیں تو اللہ اس کتاب کے ذریعے سے راہِ نجات کی ہدایت کرتا ہے اور تاریکی

سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف پہنچا دیتا ہے۔

نصاریٰ نے چونکہ معاہدہ الٰہی کی خلاف ورزی کی لہٰذا ان کو یہ سزا دی گئی کہ قدرت نے ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی، جو قیامت تک رہے گی۔ نصاریٰ کی جتنی سلطنتیں دنیا میں تھیں اور اب ہیں ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں اور ہمیشہ ان میں چلتی رہتی ہے۔ امریکہ روس انگلینڈ جرمنی فرانس وغیرہ تمام ممالک ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔
علمائے یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل کی بہت سی عبارتیں چھپالی تھیں اور عام لوگوں کو نہیں بتاتے تھے مگر جب حضرت رسولِ خداؐ کا ظہور ہوا تو آپؐ نے ان سب کی قلعی کھول دی۔ یہودیوں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے دو چیزیں بھیجی ہیں ایک ہادی کا نام نور رکھا ہے اور دوسرے کا روشن دلائل والی کتاب۔ تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نور سے مراد جناب ختمی مرتبتؐ ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ پہلے ہمیں اس پر بحث کرنی ہے کہ نور کیا ہے۔
مفسرین نے نور کی تعریف میں خدا جانے کیا کیا کہا ہے ہماری سمجھ میں غور و خوض کے بعد جو کچھ آیا ہے وہ یہ ہے کہ نور اس چیز کا نام ہے جو تاریکی سے روشنی میں لانے والا ہو یعنی گم گشتہ کو راستہ دکھانے والا خواہ ظاہری طور سے یا باطنی طور سے۔ مثلاً آفتاب ماہتاب ستارے چراغ۔ بجلی کے بلب تاریکی کو دور کر کے ہماری مادی آنکھوں کو ہر وہ چیز دکھا دیتے ہیں جو ہم کو تاریکی میں نظر نہیں آتی۔ روشنی کی ہدایت کی یہ ظاہری صورت ہے۔ اب رہی باطنی رہنمائی جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ (ہم نے تم پر توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس بظاہر کتاب توریت میں کوئی روشنی نہیں لیکن باطناً ہدایت کی روشنی ہے اس روشنی کا تعلق دل کی آنکھوں سے ہے جس کو بصیرت کہتے ہیں۔ اسی طرح انجیل کے متعلق وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ اسی طرح علم کے لیے اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَاۗءُ (حدیث) "علم نور ہے اللہ اسے جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔" علم بھی انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔
دوسرے یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ نے دو ہادی بیان فرمائے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کتاب ہدایت کے لیے کافی نہیں کیونکہ وہ صامت ہے لہٰذا اس کے ساتھ ایک نورِ باطن بھی ہونا چاہیئے۔ چونکہ یہ حکم صرف عہدِ رسالت ہی سے مخصوص نہیں تھا بلکہ ہر زمانہ والوں کے لیے ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ میں کتابِ خدا کے ساتھ ایک نور رہنا چاہیئے، ورنہ ہدایت کافی نہ ہوگی اور رسولؐ کے بعد ان کی امت کو یہ شکایت کا موقع ملے گا کہ عہدِ رسالت کے مسلمانوں کے لیے کیا خصوصیت تھی کہ ان کے لیے دو ہادی تھے ایک ناطق دوسرا صامت اور ہمارے لیے صرف ایک ہی رہا وہ بھی صامت۔ اگر ہماری سمجھ میں کوئی بات نہ آئے تو کس سے پوچھیں حضرت رسولِ خداؐ نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ حدیثِ ثقلین میں فرمایا۔ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابُ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ وَاِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ (لوگو میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب ہے دوسرے میری عترت میرے اہلبیت، جب تک تم ان سے تعلق رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوضِ کوثر پر نہ پہنچیں۔)

پس جس کو اللہ نے نُور فرمایا ہے رسولؐ نے ان کو اہلبیتؑ فرمایا ہے۔ کیونکہ وہ نورِ رسولؐ کے جزو ہیں جیسا کہ فرمایا ہے خُلِقْتُ اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ (میں اور علی ایک نور سے پیدا کیے گئے ہیں)۔ حدیث صحیح وہی ہوتی ہے جو قرآن کے مطابق و موافق ہو لہٰذا اس حدیث کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کیونکہ آیت میں بھی دو ہادی ہیں۔ اور حدیث میں بھی دو ہیں۔

رسولؐ نورِ اوّل ہیں۔ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ اور اس نورِ اوّل میں بارہ اور شریک ہیں۔ انہی انوارِ مقدسہ سے تمام کائنات بنی ہے یہ کہنا غلط ہے کہ مادہ قدیم ہے اور تمام دنیا اس مادہ سے بنی ہے۔ جدید سائنس دانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ نور سے بنا ہے نہ کہ نور مادہ سے۔ چنانچہ مادہ کے چھوٹے سے چھوٹے جز کو جسے یونانیوں نے جزوِ لایتجزیٰ سے تعبیر کیا تھا اور جدید سائنس میں اس کو ایٹم کہتے ہیں، جب جدید آلات سے توڑا گیا تو اس میں سے دو شعاعیں نکلیں اور اس جزوِ لایتجزیٰ کا وجود ختم ہو گیا لہٰذا پتہ چلا کہ نور کی دو شعاعوں سے جو الیکٹرون و پروٹون کہلاتی ہیں مادہ کا وہ ذرہ بنا تھا جسے ایٹم کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ نور کی ایک شعاع سے مادہ نہیں بنا بلکہ دو شعاعوں نے مل کر بنایا ہے۔ رسولؐ اللہ نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا کہ فرمایا: میں اور علی ایک نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا مادہ کے اجزاء بنانے والے محمدؐ و علیؑ کے نور تھے۔ پھر مادہ کے اجزاء بننے لگے اور ان کے بننے سے اجسامِ کائنات کی تخلیق ہوتی گئی۔ اس لیے تمام کائنات پر نورِ محمدؐ و علیؑ کا احسان ہے اور ان انوارِ مقدسہ کی تعظیم سب پر واجب ہے اور سب اُن کے زیرِ فرمان ہیں۔

سورہ النساء آیت ۱۷۴ میں اس مضمون کو پھر یوں بیان کیا گیا ہے:
يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا (لوگو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل آچکی ہے اور ظاہر بظاہر ایک نور بھی آچکا ہے۔ یعنی بُرہان میں ہدایتِ خفی ہے اور نُور میں ہدایت جلی ہے۔ دونوں ہادی تمہارے رب کی طرف سے آچکے۔ اگر اب بھی تم ایمان نہ لاؤ تو یہ تمہاری حماقت کی دلیل ہوگی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾

کافر ہیں وہ لوگ جنہوں نے مسیح ابن مریم کو خدا کہا ان سے کہو اگر اللہ مسیح بن مریم اور ان کی ماں کو اور رُوئے زمین کے تمام باشندوں کو ہلاک کر دے تو اُسے کون روکے گا۔ آسمانوں اور زمین میں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا ملک ہے جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ تو ہر شے پر قادر ہے۔ یہودی اور نصرانی کہتے ہیں ہم تو اللہ کی اولاد ہیں اور اس کے احباب ہیں۔ اے رسول تم ان سے کہو اگر ایسا ہے تو وُہ تمہارے گناہوں کی سزا میں تم کو عذاب کیوں دیتا ہے۔ (تمہارا یہ خیال لغو ہے) بلکہ اس کی مخلوقات میں سے تم بھی ایک مخلوق ہو وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب اللہ ہی کا ملک ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے۔

یہودی اور نصرانی اس خبط میں مبتلا تھے کہ چونکہ وہ اللہ کی اولاد اور اس کے دوست ہیں لہٰذا وہ ان کو جہنم میں ڈالے گا ہی نہیں۔ یہودیوں کا تو یہ گمان اس بنا پر تھا کہ حضرت یعقوبؑ کو خدا نے یہ وحی کی تھی کہ تیرے فرزند میرے فرزند ہیں اور تیرے احباب میرے احباب ہیں میں ان کو چالیس روز سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھوں گا وہ بھی اس لیے کہ ان کے گناہ جل جائیں اور وہ پاک صاف ہو کر وہاں سے نکل آئیں اور نصاریٰ اس خیالِ باطل میں جھوم رہے تھے کہ مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں پس کیسے ممکن ہے کہ اللہ اپنے پیارے بیٹے کے ماننے والوں کو آتشِ جہنم میں جھونک دے۔ نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مسیحؑ نے سُولی پر چڑھ کر اپنی تمام اُمت کا گناہ اپنے سر لے لیا پھر کیوں خدا اس کی امت کو داخلِ دوزخ کرے گا۔ لہٰذا خدا نے ان دونو باطل خیالوں کی تردید ان آیات میں فرمادی کہ جب تم اللہ کی اولاد ہو اس کے رشتہ دار ہو تو پھر وہ تم کو طرح طرح کے عذاب میں کیوں مبتلا کرتا ہے۔ مسیحؑ ہی پر کیا منحصر ہے خدا نے آسمان و زمین کے درمیان بہت سی عجیب و غریب مخلوق بنائی ہے پھر تم ان کو بھی خدا کہنے لگو آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے اللہ کا بنایا ہُوا کارخانہ ہے وہ تو صاحبِ قدرت و اختیار ہے جیسا جسے چاہے بنا دے کوئی اس کی سزا کو روکنے والا نہیں وہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے سزا دیدے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٩﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠﴾

اے اہلِ کتاب جب پیغمبروں کی آمد میں بہت رکاوٹ ہوئی تو پھر ہمارا رسول تمہارے پاس آیا جو کہ احکامِ خدا کو صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی بشارت دینے والا آیا تھا نہ کوئی ڈرانے والا بس اب تو بشیر و نذیر پیغمبر تمہارے پاس آگیا (اب کیا غور کرتے ہو) اور اللہ تو ہر شے پر قادر ہے (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اللہ نے جو احسانات تم پر کیے ہیں ان کو یاد کرو اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تم میں بادشاہ بنائے اور تمہیں وہ نعمتیں دیں جو ساری خدائی میں کسی کو بھی نہ دیں۔

آنحضرتؐ کی ولادت سے پہلے بنی اسرائیل میں متواتر انبیاءؑ مبعوث ہوتے رہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد نبوت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کے درمیان ۵۶۲ سال شمسی کا فاصلہ ہے۔ اس زمانہ کو زمانۂ فترت کہتے ہیں۔ زمانہ چونکہ حجتِ خدا سے کبھی خالی نہیں رہتا لہٰذا جو نبی یا وصی نبی اس مدت میں گزرے وہ مخفی طور پر ہدایت کرتے رہے کسی ان کو ماننا اور کسی نے نہ مانا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر بعد زوال ہوتی ہے۔ جب تک انبیاءؑ آتے رہے ان کی امتیں ان کو قتل کرتی رہیں ان کی نافرمانی پر کمربستہ رہیں خصوصاً بنی اسرائیل نے تو سب سے زیادہ انبیاء پر ظلم کیا۔ آخر یہ تماشا کب تک ہوتا رہتا۔ قدرت نے اس سلسلہ کو بند کر دیا تاکہ ان کو پتہ چلے کہ انبیاء کے نہ آنے سے ان پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوئیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ضلالت و گمراہی کا سیلاب آنا شروع ہوا جس کی رفتار روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ تمام عرب اور اس کے ملحقہ ممالک بت پرستی کی لپیٹ میں آگئے اور کوئی روک تھام کرنے والا نہ رہا۔ اسی بت پرستی کا عذاب تھا کہ ان کے درمیان اختلافات کی وہ خلیج حائل ہوئی کہ رات دن ان کے درمیان تلوار چلنی شروع ہوئی۔ معمولی معمولی بات پر چالیس چالیس سال تک ان کے قبائل کے درمیان قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور اس کے ساتھ ہی ان کے اخلاق و عادات ایسے بدلے کہ وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانوں کی صف میں داخل ہوگئے۔ لوٹ مار۔ چوری ڈکیتی۔ زناکاری۔ جوا۔ شراب خواری۔ قتلِ اولاد۔ ظلم پسندی۔ مکر و فریب، غرض کوئی عیب ایسا نہ رہا جو خوفناک حد تک ان کے درمیان نہ پایا جاتا ہو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سکون و اطمینان کی زندگی ان کے لیے ختم ہوگئی اور وہ گھبرا کر خدا سے دعائیں مانگنے لگے کہ اس نبیؐ کو جلد بھیج جس کے ظہور کی پیش گوئی توریت و انجیل میں کی گئی ہے وہ رات دن انؐ کی آمد کے منتظر تھے اور اپنی اولاد کو یہ وصیت کرتے تھے کہ جب وہ نبیؐ مبعوث ہو تو سب اس کی اطاعت کرنا اور ہمارا اسلام انؐ کو پہنچا دینا۔ فترت کا زمانہ صرف اسی لیے رکھا گیا کہ ان کو نبی و رسول کی قدر ہو اور یہ سمجھیں کہ ان مقدس ہستیوں کی وجہ سے ان کی معاشی و تمدنی اور سیاسی و مذہبی فضا میں سکون رہا کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد دلایا ہے :

موسیٰؑ نے اپنی سرکش اور نافرمان قوم سے کہا اللہ نے تم پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں ان کو فراموش نہ کرو۔ تم اس پر ذرا غور نہیں کرتے کہ اس نے سب سے زیادہ انبیاء تمہاری قوم میں بھیجے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا اور اتنی نعمتیں تم کو دیں جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ دی تھیں۔

اس مقام پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے بادشاہوں کو اپنی مرضی سے بنایا تو پھر وہ منصوص من اللہ ہوگئے۔

لہٰذا نبی یا امام کے لیے یہ شرفِ منصوصیت باقی نہ رہا۔ جواب یہ ہے کہ جن کو بادشاہ بنانے کا ذکر ہے ان سے مراد وہ بادشاہ ہیں جو انبیاء میں سے تھے جیسے حضرت یوسفؑ۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نہ کہ ظالم و جابر بادشاہ۔ کیونکہ عدلِ الٰہی کے خلاف ہے کہ وہ ظالموں اور سرکشوں کو اپنے غریب بندوں پر مسلط کر دے۔

اب رہی یہ بات کہ جو کچھ بنی اسرائیل کو دیا وہ دنیا میں کسی اور کو نہیں دیا تو بے شک خدا نے بہت سے احسانات اس قوم پر ایسے کیے ہیں جو کسی اور قوم پر نہیں کیے۔ فرعون کو غرق کر کے اس کے ظلم سے بچایا۔ دریائے نیل کو ان کے لیے شگافتہ کرنا۔ من و سلویٰ کا ان پر نازل کرنا۔ پانی کے بارہ چشمے ان کے لیے نکالنا۔ عمالقہ کے ظلم سے ان کو بچانا۔ بہ کثرت انبیاء و مرسلین ان میں پیدا کرنا۔ ان کو صاحبِ کتاب و حکمت بنانا۔ ملکِ عظیم کا مالک بنانا۔ ان پر مائدہ نازل کرنا۔ ایک مدت تک مصر میں ان کی بڑی شاندار حکومت رہنا۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِىْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾

(اپنی نعمتوں کو یاد دلانے کے بعد اب بنی اسرائیل کی سرکشی اور حضرت موسیٰؑ کی نافرمانی کی داستان سناتا ہے)۔ موسیٰ نے کہا اے میری قوم ارضِ مقدس میں جاؤ جہاں کی حکومت خدا نے تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے اور دشمن کے مقابلہ میں پیچھے نہ ہٹو، ورنہ الٹا گھاٹے میں پڑ جاؤ گے۔ انہوں نے کہا اے موسیٰ اس بستی میں تو ایک بڑے سرکش اور سخت دل لوگ رہتے ہیں جب تک وہ وہاں سے نہ نکلیں گے ہم تو اس کے اندر داخل نہ ہوں گے البتہ جب وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو جائیں گے۔

ارضِ مقدس کے تعین میں مفسرین کا بہت اختلاف ہے چنانچہ کسی نے شام کسی نے فلسطین کسی نے اردن اور کسی نے زمین طور لکھا ہے۔ زیادہ اتفاق سرزمین فلسطین پر ہے۔ شانِ نزول یہ ہے کہ جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر سے نکل آئے تو خدا نے حکم دیا کہ ارضِ مقدس کو فتح کر لو۔ یہ قصہ مصر سے نکلنے کے دو سال بعد کا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کئی ہزار فوج لے کر دشتِ فاران سے جہاں خیمہ زن تھے روانہ ہوئے۔ جب چلتے چلتے شہر اردن پر پہنچے تو آگے جانے سے ڈر گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے ہر قبیلہ سے ایک نقیب یعنی سردار چنا اور ان بارہ افراد کو بطور جاسوس وہاں کے لوگوں کا حال

معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے آکر خبر دی کہ وہ بہت لمبے تڑنگے اور طاقتور لوگ ہیں۔ یہ سُن کر بنی اسرائیل گھبرا گئے اور کہنے لگے ہم تو وہاں مرنے کے لیے جائیں گے نہیں۔ ہاں جب یہ لوگ بستی سے باہر نکل جائیں گے تب ہم داخل ہو سکتے ہیں۔ کیسا احمقانہ سوال تھا۔ وہ لوگ بستی چھوڑ کر بغیر کسی دباؤ کے کیوں نکل جاتے۔ چونکہ ان کے ایمان میں کمزوری تھی لہٰذا یہ بہانہ بنا کر وہ واپس ہونے پر آمادہ ہو گئے۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ ع

(جب قومِ موسیٰؑ پر یہ بزدلی چھائی) تو ان دو آدمیوں (یوشع و کالب) نے جو خدا کا خوف رکھتے تھے اور جن پر خدا نے اپنا فضل و کرم کیا تھا کہنے لگے (ڈرتے کیوں ہو) ان پر حملہ کر کے بیت المقدس کے پھاٹک میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو وہ ایسے بودے ہیں کہ جیسے ہی تم داخل ہو گے وہ سب بھاگ کھڑے ہوں گے اور تمہاری جیت ہو جائے گی اگر تم سچے ایمان والے ہو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ (ان پر کچھ ایسا رعب چھایا تھا کہ آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔) کہنے لگے جب تک یہ لوگ اس بستی میں موجود ہیں ہم تو ہرگز اس کے اندر نہ گھسیں گے۔ تم اور تمہارا رب جا کر (ایسے زبردستوں سے) لڑے ہم تو بس یہیں بیٹھے ہیں۔ تب موسیٰ نے بارگاہِ باری میں عرض کی۔ پالنے والے مجھے صرف اپنے اور اپنے بھائی کے نفس کے سوا کسی پر قابو نہیں۔ پس یا اللہ ہمارے اور اس قومِ بدکار کے درمیان جدائی قرار دے۔ خدا نے فرمایا (ان کی سزا یہ ہے) کہ ان کو اب چالیس سال تک یہاں کی حکومت نصیب نہ ہو گی اور اس مدتِ دراز تک یہ مصر کے جنگل میں سرگرداں و پریشاں پھریں گے تم ان بدچلن لوگوں کی حالت پر افسوس نہ کرنا۔

جب قومِ موسیٰؑ پر بزدلی غالب آئی تو یوشع اور کالب نے ان کو سخت ملامت کی۔ اس پر قوم کو ان پر اتنا غصہ آیا کہ ان کو سنگسار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ آخر غضبِ الٰہی جوش میں آیا اور فیصلہ ہوا کہ اب یوشع اور کالب کے سوا کوئی بھی بالغ مردوں میں سے اس سرزمین پر داخل نہ ہو پائے گا۔ آخر کار قوم کو چالیس سال تک سرگرداں پھرنا پڑا۔ یہ وادی کُل ۱۵ میل لمبی تھی لیکن کسی طرح اس سے نکلنا ممکن نہ ہوا۔ موسیٰؑ و ہارون دونوں کا انتقال اسی وادی میں ہوا جس کا نام تیہ تھا۔ ہارونؑ، موسیٰؑ سے ایک سال پہلے مرے۔ موسیٰؑ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ موسیٰؑ کے بعد یوشع ان کے جانشین ہوئے جو موسیٰؑ کے بعد ۲۷ سال تک زندہ رہے۔ یوشع نے اریحا بستی کا جس میں داخل ہونے سے قومِ موسیٰؑ نے انکار کیا تھا چھ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا ساتویں مہینہ اس شہر میں داخل ہوئے اور قومِ عمالقہ کو قتل کرنا شروع کیا۔ شام ہو گئی سورج غروب ہو گیا حضرت یوشع نے دُعا کی۔ خدا نے دعا قبول کی سورج پلٹ آیا اور ایک گھنٹہ تک قومِ عمالقہ کے بقیہ افراد کو قتل کیا گیا اور اس طرح اریحا فتح ہو گیا اور چالیس سال بعد بنی اسرائیل کو اس میں داخلہ ملا۔ ان کو نہیں جنہوں نے سرکشی کی تھی وہ تو سب مر کھپ گئے تھے۔ داخل ہونے والی ان کی اولاد تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد دو بار پلٹا ہے ایک بار نسلِ اسحاق کی ایک فردِ خاص یوشع بن نون کے لیے اور دوسری بار اولادِ اسمٰعیلؑ میں حضرت علی علیہ السلام کے لیے جنگ خندق کے موقع پر۔ وہ وصی موسیٰ علیہ السلام تھے یہ وصی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ۔ بہت سے لوگ اس کو خلافِ عقل کہہ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ معجزہ تو وہی ہوتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ عصائے موسیٰؑ کا سانپ ہو جانا۔ دریائے نیل کا پانی بارہ شگافوں میں ہو جانا۔ یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا۔ عیسیٰؑ کا مٹی کی چڑیا بنا کر اڑا دینا۔ ٹھوکر مار کر مردہ کو زندہ کر دینا۔ حضرت رسولِؐ خدا کی انگلی کے اشارہ سے چاند میں شق پیدا ہونا۔ کیا یہ سب باتیں عقل میں آتی ہیں اگر نہیں آتیں تو سورج پلٹنے کے معاملہ میں عقل کے گھوڑے کیوں دوڑائے جاتے ہیں؟

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٧﴾ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٣٠﴾

اے رسول آدم کے دونوں بیٹوں کا سچا قصہ ان لوگوں سے بیان کر دو۔ جب دونوں نے اپنی اپنی قربانیاں بارگاہِ باری

میں پیش کیں تو ایک کی قربانی قبول ہوگئی دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی (قابیل) اس نے (اپنے بھائی ہابیل سے) کہا میں تجھے ضرور قتل کر ڈالوں گا۔ ہابیل نے کہا (میرا اس میں کیا قصور ہے) اللہ تو متقیوں کی نذر قبول کرتا ہے۔ اگر تو نے میرے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا (تو بڑھا) میں تو تیرے قتل کے لیے اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ کیونکہ میں تو رب العالمین خدا سے (کسی بے قصور کو مار ڈالنے پر) ڈرتا ہوں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اپنا اور تیرا گناہ تیرے اوپر لاد دوں تاکہ تو جہنمیوں میں سے بن جائے ظالموں کی سزا یہی ہے۔ قابیل کے نفس نے بھائی کے قتل پر اُسے آمادہ کیا اور اُس نے اُسے قتل کر دیا اور وُہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگیا۔

دنیا میں آدمؑ کا قدم آیا ہی تھا کہ ان کے دونوں بیٹوں ہابیل و قابیل میں چل پڑی اور یہ عداوت اتنی بڑھی کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ مفسرین یہ سبب بتانے میں چپ سادھ گئے ہیں کہ آخر یہ عداوت اس حد تک پہنچی کیسے۔ وہاں کون سی جائداد بٹ رہی تھی جس سے اس جھگڑے کی بنیاد پڑی۔ ایک مفسر صاحب لکھتے ہیں قابیل، ہابیل کی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہابیل راضی نہ تھا کیونکہ قابیل بلحاظ عادات و خصائل اچھا آدمی نہ تھا لیکن یہ بات تو کان کو نہیں لگتی یعنی بھائی بہن کو اپنی زوجیت میں لینا چاہتا تھا۔ بلکہ پتہ کی بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کا پیار ہابیل پر زیادہ تھا وہ اپنا جانشین اس کو بنانا چاہتے تھے۔ انبیاء کی جانشینی کا معاملہ شروع سے جھگڑے کی جھونپڑی بنا رہا۔ پہلے ہی نبی کے گھر میں یہ قضیہ چھڑ گیا۔ قابیل نے اس کو باپ کی ناانصافی پر محمول کیا اور بھائی کا جانی دشمن بن گیا۔ آدمؑ نے اس جھگڑے کو چکانے کے لیے دونوں سے کہا کہ تم اپنی اپنی قربانیاں بارگاہِ الٰہی میں پیش کرو آسمانی آگ جس کو آ کر جلا دے گی وہی میرا جانشین ہوگا کیونکہ وہ منصوص من اللہ قرار پائے گا۔ دونوں بھائی راضی ہوگئے قابیل بکریاں چراتا تھا اور ہابیل کھیتی باڑی کرتا تھا۔ قابیل نے ایک موٹا تازہ دُنبہ پہاڑ پر جا رکھا وہ اس خیال میں مست تھا کہ میری قیمتی قربانی ضرور قبول ہوگی۔ ہابیل غریب نے گیہوں کے چند پودوں کا ایک مُٹھا بنا کر پہاڑ پر رکھ دیا مگر سچی نیت کے ساتھ۔ بجلی گری تو اس نے ہابیل کی قربانی جلا دی، قابیل کے بکرے کو چھوا تک نہیں۔ اس پر قابیل کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور کہنے لگا میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے کہا بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اللہ تو متقیوں کے نذرانے قبول کرتا ہے یہ بات قابیل کے زخم پر نمک چھڑک گئی۔ اس نے تیوری چڑھا کر کہا اچھا تو آپ متقی ہیں اور میں بدمعاش، دیکھ میں اس کا کیسا مزہ چکھاتا ہوں۔ غرضکہ ایک روز ہابیل ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا کہ قابیل نے ایک پتھر سے اس کا سر کچل دیا۔ مار ڈالا، تو اب پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کی لاش چھپاؤں کہاں۔ تاکہ باپ کو پتہ ہی نہ چلے۔ لیکن نئی نئی دُنیا بسی تھی ابھی کوئی مرا ہی نہ تھا کہ قبر کھودنے کا طریقہ ایجاد ہوتا۔ یہ پہلا ہی خون تھا جو زمین نے چوسا تھا اور یہ پہلا ہی مردہ تھا جس کو سپردِ خاک کرنے کی فکر تھی۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ

مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿٣١﴾ۚۛ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿٣٢﴾

پس اللہ نے ایک کوّے کو بھیجا کہ وہ زمین کھودے اور قابیل کو دکھا دے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے قابیل نے کہا ہائے افسوس میں اس کوّے کے برابر ہونے سے بھی عاجز ہوں کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا پس وہ اپنی اس غلط کاری پر بہت پچھتایا۔ اسی وجہ سے تو ہم نے بنی اسرائیل پر واجب کر دیا تھا کہ جو کسی ایسے شخص کو ناحق قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو اور نہ کوئی فساد پھیلایا ہو تو گویا اُس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے ایک آدمی کو زندہ کیا اس نے گویا سب لوگوں کو زندہ کر لیا۔ ان کے پاس ہمارے رسول روشن معجزات لے کر آ چکے ہیں مگر اس کے بعد ان میں سے بہت سے لوگ زیادتیاں کرتے رہے۔

یہ قدرت کا قانون ہے کہ قاتل چھپتا نہیں وُہ اپنے ضمیر کی سوزش میں ایسا دیوانہ سا ہو جاتا ہے کہ اس کی مضطربانہ حرکتوں اور گھبرائی ہوئی باتوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ قاتل ہے۔ قابیل نے گڑھا کھود کر ہابیل کو مٹی میں دبا دیا تاکہ اس کا قاتل ہونا کسی پر ظاہر نہ ہو لیکن بہت جلد آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو پتہ چل گیا کہ ہابیل کا قاتل وہی ہے۔ اس زمانہ میں کوئی شریعت نہ تھی کہ اس کے مطابق سزا دی جاتی البتہ اس کو سب نے ایسی سخت سرزنش کی کہ وہ پاگل ہو کر پہاڑوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ آخر وہاں سے بھاگ کر عدن پہنچا اور وہاں باغوائے شیطانی یہ آتش پرست بن گیا۔ آتش پرستی کی بنیاد اُسی نے ڈالی۔

اس قصہ سے چند سبق ملتے ہیں :

١۔ حسد ایسی بری عادت ہے کہ انسان اپنے حقیقی بھائی تک کو قتل کر ڈالتا ہے۔

٢۔ مردہ کو قبر میں دبانا مرضئِ الٰہی کے مطابق ہے ورنہ کوّا یہ طریقہ بتانے کے لیے نہ بھیجا جاتا جو دوسرے مردہ کوّے کو دبانے کے لیے اپنی چونچ سے زمین کھود رہا تھا جو لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

٣۔ کسی نبی کی جانشینی کا تعلق صرف متقی لوگوں سے ہوتا ہے۔

٤۔ اللہ کی بارگاہ میں صرف انہی لوگوں کے نذرانے قبول ہوتے ہیں جو اس کی ذات پاک پر ایمان رکھتے ہیں اور صدقِ دل سے کوئی نذر پیش کرتے ہیں۔

۵ - بنی اسرائیل انبیاء کے قتل پر بہت جری ہو گئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کو بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص کو بے قصور قتل کر دینا گویا تمام آدمیوں کو قتل کر دینا سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کی اس ظالمانہ اور احمقانہ جرأت کی مثال کو سامنے رکھ کر دوسروں کو بھی اس کی طرف رغبت ہوتی ہے اور جب یہ وبا پھیلتی ہے تو بے شمار بے گناہ تیغ کے گھاٹ اتر جاتے ہیں پس ان سب کا قاتل وہی شخص سمجھا جاتا ہے جس نے معاشرہ میں ایسی رسمِ بد کی بنیاد رکھی اور جس نے ایک بے گناہ کی جان بچائی گویا اس نے سب کی جان بچائی کیونکہ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی مظلوموں کی جان بچانے کی طرف رغبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک توجیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جس بے گناہ کو قتل کیا گیا ہے اس سے آئندہ ہونے والی نسل کو بھی جو قیامت تک کتنی بڑی تعداد میں ہوتی گویا اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔

بنی اسرائیل سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ باوجودیکہ بہت سے انبیاء و مرسلین تمہارے پاس آئے اور طرح طرح کے معجزات انہوں نے تمہیں دکھائے مگر اس پر بھی تم راہِ راست پر نہ آئے اور تم نے نافرمانی و سرکشی کو نہ چھوڑا۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٤﴾

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو انہیں قتل کیا جائے یا سُولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں ہیر پھیر کے کاٹے جائیں (یعنی ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پیر) یا ان کو جلاوطن کیا جائے یہ تو ان کو سزا دُنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذابِ عظیم ہوگا۔ ہاں وہ لوگ جو اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو حاصل کر لو (تو ان کا گناہ بخش دیا جائے گا) بیشک اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس آیت میں ایک خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قدرت نے مختلف قسم کے مجرموں کے لیے مختلف سزائیں مقرر کی ہیں جو صرف قتل کرے اس کی سزا قتل ہے اگر قتل بھی کرے اور مال بھی لُوٹے تو اس کی سزا قتل کے بعد اس کی لاش سولی پر لٹکانا بھی ہے۔ اگر کھلے عام ڈاکہ ڈالے اور قتل نہ کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے متقابل کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے جائیں یعنی دایاں

ہاتھ تو بایاں پاؤں۔ اور اگر قتل نہ کرے نہ مال لُوٹے بلکہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلائے تو اس کی سزا ملک بدر کر دینا ہے۔ ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ دینے کا حکم اس بنا پر ہے کہ وہ بالکل بیکار نہ بن جائے بلکہ چلنے پھرنے اور کچھ کام کاج کرنے کے قابل رہے۔ مثلاً ایک طرف کا داہنا ہاتھ اور بائیں طرف کا پیر کاٹ دیا گیا تو وہ بائیں طرف بیساکھی لگا کر چل سکے گا۔ اور بائیں ہاتھ سے کچھ کھا پی سکے گا۔ اس قدرتی سزا سے لوگوں کو عبرت ہو گی۔ اگر ایک طرف کے دونوں ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے جائیں گے تو وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے گا۔ لہٰذا قدرت نے نہ چاہا کہ کسی وجود کو معطل محض بنا کر چھوڑ دے۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے سے مراد یہ ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی کے درمیان سے کاٹا جائے اور انگوٹھا بچا لیا جائے اور پاؤں کو اسی جگہ سے کاٹا جائے کہ ایڑھی بچ جائے یعنی پیر کے درمیان جو اُبھرا ہوا مقام ہے وہاں سے کاٹا جائے۔

اس کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال بنی عقبہ کے کچھ لوگ بیمار ہو کر مدینہ آئے آپؐ نے حکم دیا تا صحت یہیں ٹھہرو۔ ان لوگوں نے آب و ہوا کے ناموافق ہونے کا عذر کر کے رخصت چاہی۔ چلتے ہوئے انہوں نے جس چراگاہ میں صدقہ کے اونٹ چرتے تھے ان کے تین چرواہوں کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو اپنے ساتھ ہنکا لے گئے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو ان کے پکڑنے کے لیے بھیجا۔ آپؓ ان کو پکڑ لائے۔ یہ آیت انہی کے بارہ میں آئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٣٧﴾ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٩﴾

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور اس تک پہنچنے کے لیے کسی کو وسیلہ بناؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ تاکہ تمہارے لیے بہتری کا باعث ہو۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے اگر روزِ قیامت جو کچھ زمین میں ان کا خزانہ ہے وہ سب او

اس کی مثل اور بھی بدلہ میں دے کر عذابِ خدا سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو ان کی یہ پیشکش قبول نہ کی جائے گی اور ان کے لیے وہاں دردناک عذاب تیار ہوگا اگر وہ چاہیں گے کہ کسی طرح نارِ جہنم سے باہر نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکل سکیں گے نہیں۔ اور ان کے لیے تو دائمی عذاب ہوگا۔ چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت اس کی سزا یہ ہے کہ ان کی غلط کاری کی سزا میں ان کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالو یہ ان کی سزا خدا کی طرف سے ہے بیشک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو یہ نہیں کہا گیا کہ وسیلہ بناؤ بلکہ تلاش کرو۔ معلوم ہوا کہ وسیلہ بنانے والا اللہ ہے اور تلاش کرنا مومنین کا کام ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وسیلہ تلاش کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خدا کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ تقویٰ ہے یعنی امورِ خیر کا بجا لانا اور امورِ بد سے بچنا لیکن جب تک کوئی ہمیں امورِ خیر اور امورِ شر کی حدود نہ بتائے، حرام و حلال کو نہ سمجھائے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے آگاہ نہ کرے ہم تقویٰ کی منزلوں سے کیسے گذر سکتے ہیں۔ صرف قرآن ہماری نجات اور تقربِ ایزدی حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہوتا تو ایک دین کے تہتّر فرقے نہ ہوتے اور ان کے اصولِ دین اور فروعی مسائل اختلافی نہ ہوتے۔ لہٰذا ہماری ہدایت کے لیے سب سے بڑا وسیلہ ہمارے رسولؐ ہیں اور ان کے بعد ہمارے ائمہ ہیں۔

یہ ایک عقلی مسئلہ ہے کہ اس دُنیا میں بغیر وسائل تلاش کیے ہماری مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ ہم ہر امر میں کامیابی کے لیے کسی وسیلہ کی تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح نجاتِ آخرت ہم حاصل نہیں کرسکتے جب تک ہمارے پیشِ نظر کوئی ایسی ذات نہ ہو جس کے علم و عمل پر ہمیں پورا پورا اعتماد ہو اور رسولؐ نے اس کے ساتھ رہنے کا حکم بھی دیا ہو۔ پس ہمارے اور خدا کے درمیان وہی لوگ وسیلہ ہیں جن کو رسولؐ نے حدیثِ ثقلین میں قرآن کے ساتھ کیا ہے۔ انہی کے وسیلہ سے ہم بارگاہِ ایزدی میں تقرب حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ وہ خود مقربانِ الٰہی ہیں۔

فرقۂ شیعہ کی فقہ میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے لیکن پورا ہاتھ نہیں بلکہ ہتھیلی کے درمیان سے کاٹا جائے تاکہ اسے وضو کرنے میں دقت نہ ہو۔ کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ¼ دینار کی چوری پر ہاتھ کٹے گا۔ دینار ہو یا اس قیمت کی دوسری چیز، اس سے کم قیمت کی چوری والوں کو چور تو کہا جائے گا لیکن ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ امامؑ نے فرمایا اگر ایسا نہ ہوتا تو اکثر لوگوں کے ہاتھ کٹے ہوتے۔ کیونکہ معمولی چوری کی لوگ پرواہ نہیں کرتے۔ ایک روایت میں ہے کہ صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں انگوٹھا چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ اگر توبہ کرلے تو وضو کرنا اس کے لیے آسان ہو۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اے انسان کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین پر اللہ ہی کی حکومت ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اے رسول جو لوگ کفر کی طرف تیزی سے دوڑے جاتے ہیں تم ان کا غم نہ کھاؤ یہ تو ان لوگوں میں سے ہیں کہ منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے بعض یہودی بھی ایسے ہیں جو (جاسوسی کی غرض سے) جھوٹی باتیں بڑے شوق سے سنتے ہیں تاکہ کفار کے دوسرے گروہ کو جو ابھی تک تمہارے پاس نہیں آئے جا کر سنائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ باوجود توریت کے اصلی معنی جاننے کے اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں توریت کا حکم یہ ہے اگر محمد بھی تمہیں یہی حکم دیں تو مان لینا اور اگر یہ حکم نہ دیں تو اس سے الگ رہنا۔ اے رسول جس کو خدا خراب کرنا چاہتا ہے تو اس کے معاملہ میں خدا سے تمہارا کچھ زور نہیں چل سکتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنے کا ارادہ خدا نے کیا ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

خیبر کے یہودیوں میں سے دو شخصوں نے شوہردار عورت سے زنا کیا مگر چونکہ یہ دونوں مالدار تھے اور علمائے یہود کو ان کی رعایت کرنا منظور تھی لہٰذا باوجود اس کے کہ توریت میں اس کی سزا سنگساری تھی مگر انہوں نے سنگسار نہ کیا اور اس فکر میں رہے کہ اگر اسلام میں کوئی ہلکی سزا ہو تو مان لینا چاہیئے اس کی ٹوہ لگانے کے لیے بنی نضیر و بنی قریظہ نے جن سے مسلمانوں کی صلح تھی پتہ چلانا شروع کیا۔ زانی اور زانیہ مدینہ میں آ پہنچے۔ جب حضرتؐ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپؐ نے بھی وہی سنگساری کا حکم دیا۔ یہ سن کر وہ لوگ گھبرائے اور کہنے لگے توریت میں تو ایسا حکم نہیں ہے آخر ابن صوریا جو یہودیوں میں سب سے بڑا عالم تھا ثالث قرار پایا۔ جب وہ آیا تو حضرتؐ نے قسم دے کر پوچھا۔ اس نے اقرار کیا کہ توریت کا بھی یہی حکم ہے۔ غرض وہ دونوں زانی و زانیہ سنگسار کیے گئے۔ اس واقعہ کے متعلق یہ آیت ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

جھوٹی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں حرام کا مال کھاتے ہیں اگر تمہارے پاس (کوئی قضیہ لے کر) آئیں تو تم کو اختیار ہے خواہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے رُوگردانی کرو۔ اگر تم ان سے کنارہ کشی کرو گے تو وُہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور اگر ان کے درمیان فیصلہ ہی کرنا ٹھہرے تو انصاف سے فیصلہ کر دو کیونکہ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے جب خود ان کے پاس توریت ہے جس میں خدا کا حکم موجود ہے تو پھر وہ تم سے فیصلہ کرانے کے لیے کیوں آتے ہیں لیکن بعد میں پھر تمہارے فیصلہ سے پھر جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وُہ مومن ہی نہیں ہیں۔

اس فیصلہ کا واقعہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ کچھ یہودی ایسے تھے جو مسلمانوں سے ملے جلے رہتے تھے اور بطور جاسوس مسلمانوں کی کمزوریوں کا پتہ چلاتے تھے پھر ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے خفیہ طور پر تدبیریں کرتے تھے۔ اس قوم میں زیادہ تر لوگ سُود در سُود کھاتے تھے اور تجارتی معاملات میں بھی لوگوں کو دھوکہ دے کر حرام کا پیسہ ہضم کر جاتے تھے۔ توریت میں تصرف کرنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اور مزہ کی بات یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی تائید قرآنی احکام میں ڈھونڈتے تھے تاکہ لوگوں سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم جو حکم بیان کرتے ہیں وہی حکم قرآن دیتا ہے لیکن انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ حضورؐ کے حکم کو اپنے فتویٰ کے خلاف پاتے تو منہ بنا کر کہتے کہ ہمارے یہاں تو توریت میں اس کے خلاف حکم ہے۔ حضرتؐ فرماتے، اچھا توریت کو لا کر میرے سامنے پڑھو۔ یہ سن کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ اخلاقی معاشرتی اور تمدنی ہر اعتبار سے یہ لوگ ننگِ انسانیت تھے لیکن ڈینگ یہ مارتے تھے کہ ہم سے زیادہ احکامِ خدا پر عمل کرنے والی کوئی قوم ہی نہیں۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

ہم نے توریت کو نازل کیا جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی ہے۔ اس کے مطابق خدا کے فرماں بردار بندے انبیائے بنی اسرائیل یہودیوں کو حکم دیتے رہے اور وہ اللہ والے اور علمائے یہود بھی جو کتاب خدا کے حافظ بنائے گئے تھے اور اس پر گواہ بھی تھے۔ اے مسلمانو، تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو اور جو شخص کتابِ خدا کی ہدایت کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔ ہم نے توریت میں یہودیوں پر یہ حکم فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے ویسا ہی برابر کا زخم ہے۔ ہاں اگر مظلوم ظالم کی خطا معاف کر دے تو یہ مظلوم کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور جو کتابِ خدا کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

اس آیت میں توریت کی صفت نور بیان کی گئی ہے۔ ہم آیہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کے تحت لکھ آئے ہیں کہ نور کا اطلاق دونوں قسم کی روشنی پر ہوتا ہے ظاہری و باطنی۔ ظاہری روشنی تو یہی ہے جو تاریکی میں ہم کو ہر چیز دکھاتی ہے اور باطنی روشنی وہ ہے جو ایمان کی راہیں ہم پر کھولتی ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ انبیاءؑ سب مسلمان یعنی خدا کے فرمانبردار بندے تھے۔ یہودی اپنی غلط کاریوں اور قیاس آرائیوں کی بنا پر راہِ راست سے ہٹ گئے تھے باوجودیکہ ان کے علماء کو کتابِ خدا یعنی توریت کا نگہبان بنایا گیا تھا۔ مگر ان میں سے بہت سے حکم توریت کے حکم کے خلاف دیتے تھے معمولی جرائم پر وہ لوگوں کو خلافِ حکمِ توریت خود ہی بخش دیتے تھے کہ مظلوم اپنے بدلہ کے لیے تڑپتا رہ جاتا تھا۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ ظلم چھوٹا ہو یا بڑا اس کا بدلہ لینے کا توریت میں حکم ہے۔ جان کے بدلے جان لی جائے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ پھوڑی جائے کان کاٹنے کے بدلے کان کاٹے جائیں۔ دانت توڑنے کے بدلے دانت توڑا جائے۔ جتنا زخم کسی کے بدن پر لگایا گیا ہو زخم لگانے والے کے جسم پر ویسا ہی زخم لگایا جائے۔ ہاں اگر مظلوم اپنی نیک منشی کی بنا پر ظالم کو بخش دے تو خدا اس کا اجر اس کو دیتا

ہے اور اس عفو کو اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درگزر کرنا خدا کو کس قدر محبوب ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ
الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کے قدم بقدم عیسٰی بن مریم کو چلایا جو اس کتاب توریت کی تصدیق کرنے والے ہیں اور ہم نے ان کو انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو موجودہ توریت کی تصدیق کرنے والی ہے اور سراپا ہدایت ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت ہے انجیل والوں کو اس کے مطابق حکم کرنا جائیے جو اس کے اندر ہے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے خلاف حکم کرنے والے فاسق ہیں۔

ان آیات میں ان عیسائیوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو باوجود عالمِ انجیل ہونے کے یہودیوں کی طرح کتابِ خدا کے خلاف حکم دیتے تھے۔ چونکہ یہودی اور نصرانی علماء نے توریت و انجیل کی آیات کے مطالب اپنی رائے و قیاس کی بنا پر بیان کرنا شروع کیے لہٰذا گمراہی پھیلنی شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں میں اکہتر فرقے بن گئے اور نصارٰی میں بہتر۔ یہی مصیبت اسلام پر بھی آئی۔ جب قرآن کریم کے حقیقی وارثوں کا دامن چھوڑ کر معانی و مطالب غیر ذمہ دار لوگوں سے لینے شروع کر دیئے تو ایک دین تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا
عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ
الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً

وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ
جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ ۙ

اے رسول ہم نے تم پر کتاب برحق نازل کی جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو اس کے زمانہ میں موجود ہے اور اس کی نگہبان بھی ہے پس جو کچھ اس کتاب (قرآن) میں نازل کیا گیا ہے لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق حکم کرو پس جو حق بات خدا کی طرف سے تمہارے پاس آچکی ہے اس سے ہٹ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے (اپنی مصلحت کے مطابق) ایک شریعت اور ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا ہے اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی (شریعت والی) امت بنا دیتا مگر مختلف شریعتوں سے خدا کا مقصود یہ تھا کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہارا امتحان لے پس تم نیکیوں کے حاصل کرنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ جاؤ تم سب کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے پس جن معاملات میں تم اختلاف کر رہے ہو وہ وہاں تمہیں بتا دے گا۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ جب جا بجا اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم توریت و انجیل دونو کا مصدق ہے یعنی جو احکام ان میں ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے تو پھر ان کو منسوخ کیوں قرار دیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے کہ توریت و انجیل خدا کی نازل کردہ کتابیں ہیں نہ ان محرف توریت و انجیل کی جن میں احکامِ الٰہی کو تبدیل کر کے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ جو احکامِ الٰہی ان میں ایسے ہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہوئی، وہ قرآن میں بھی موجود ہیں لہٰذا ان احکام کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ مثلاً زنِ محصنہ سے زنا کی سزا توریت میں بھی سنگساری ہے اور قرآن میں بھی۔ قصاص کا حکم توریت میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔

۲۔ یہودیوں کی خواہش تھی کہ حضرت رسولِ خدا اپنی امت کو ان ہی احکام کا پابند بنائیں جو توریت میں نازل ہو چکے ہیں لیکن ان کی اس خواہش کو پورا کرنے سے خدا نے اپنے رسولؐ کو روک دیا کیونکہ یہودیوں نے اپنی رائے اور قیاس کو دخل دے کر احکامِ الٰہیہ کو ملیامیٹ کر دیا۔

۳۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا قانون پہلے ہی کیوں نہ بنا دیا کہ ساری امتیں اس پر عمل کرتیں۔ یہ شریعتیں بار بار کیوں بدل گئیں۔ جواب یہ ہے کہ پہلے ہمیں اس پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے اپنی مصلحت کی بنا پر کرتا ہے ہمیں اس کی مصلحت بدلوانے کا کوئی حق نہیں۔ ہر شریعت کا ماخذ ایک ہی ہے یعنی سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ اپنے بندوں کے حالات اور ان کی ضروریات اور ان کی مزاجی کیفیات سے بخوبی واقف ہے لہٰذا جس امت کے لیے اس نے جو احکام ضروری سمجھے،

اپنی کتابوں میں ویسے ہی احکام نازل کیے اور اپنے انبیاء کو انہی پر چلانے کی ہدایت کی مثلاً بنی اسرائیل کی جب سرکشی حد سے گزر گئی اور انہوں نے کھلم کھلا احکامِ خدا کی نافرمانی شروع کی یہاں تک کہ انبیاء کو بے محابا قتل کرنے لگے تو خدا نے اس سرکشی کو دبانے کے لیے اپنے احکام سخت کر دیئے۔ بہت سی حلال چیزیں ان پر حرام کر دیں۔ کبھی جہاد کا حکم دیا کبھی نہیں۔ عبادت کرنے کے لیے صرف ان کے گھروں ہی کو مسجد قرار دیا ہر جگہ نہیں دی۔ افطارِ صوم کے بعد اگر کوئی سو جاتا تو پھر کچھ کھانا اس کے لیے ممنوع تھا۔ اگر نجاست کسی کے کپڑے پر لگ جاتی تو بجائے طہارت کے اُسے کاٹ دینے کا حکم تھا۔ ماہِ صیام کی راتوں میں وہ اپنی عورتوں کے پاس نہیں جا سکتے تھے خلاصہ یہ ہے جو شریعت کے احکام اس اُمت کے حالات کے لحاظ سے نازل کیے گئے اس میں ملکوں کی حالت کو بھی دخل تھا ان کے رسم و رواج کو بھی دخل تھا۔ اللہ کسی صورت میں اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا بلکہ جو کچھ مصیبتیں اُمتوں پر آئیں وہ خود اُن کے کرتوتوں کی بدولت آئیں۔

شریعتوں کے بدلنے کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو خدا نے اس آیت میں خود بیان فرمائی ہے یعنی اس تبدیلی سے لوگوں کا امتحان مقصود تھا۔ مثلاً توریت کے بعد انجیل آئی تو یہودیوں نے اس کے احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ انجیل کے بعد قرآن آیا تو یہود و نصاریٰ نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کی کتابوں میں نبی آخر الزماںؐ کی پیش گوئی موجود تھی دوسرے وہ عناد اور تعصب کا شکار ہو کر اپنا ایمان کھو بیٹھے۔ اور قتل و غارت گری پر آمادہ ہو گئے۔

۴ - یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول اور قوانین کبھی نہیں بدلے۔ آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاءؐ تک وہی رہے۔ لہٰذا کسی نبی کی اُمت اس دائرہ سے باہر نہیں رہی ہے فروعی احکام تو ان سب کی غرض و غایت بھی ایک ہی ہے یعنی خدا کی عبادت کرنا۔ بنی نوع انسان سے حسنِ سلوک۔ دُنیا پر آخرت کو ترجیح دینا۔ اخلاقی خوبیاں حاصل کرنا وغیرہ۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں اگر کچھ اختلاف ہے تو عملی صورت میں ہے جو اہلِ ایمان ہیں وہ ہر زمانہ میں خدا کی فرمانبرداری پر نظر رکھتے تھے۔ اس کے حکم سے عمل کی جو صورت ہوتی بجالاتے تھے۔ مختلف لوگوں کے مذاق کے مطابق دسترخوانوں پر جو رنگ برنگ کے کھانے جداگانہ ہوتے ہیں ذائقہ یا رنگ اور وضع قطع میں بھی اختلاف ہوتا ہے لیکن مقصد ان سب کا شکم پُری اور صحتِ بدن کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ جن کھانوں کو تیار کیا جاتا ہے وہ سب خدا ہی کی پیدا کردہ چیزیں ہوتی ہیں۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

اے رسول جیسا اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم ان کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی نہ کرو اور ان سے بچے رہو ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ خدا کے نازل کردہ کسی حکم سے تم کو بھٹکا دیں اگر وہ تمہارے حکم سے منہ موڑ لیں تو سمجھ لو کہ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں کسی مصیبت میں پھنسا دے۔ بیشک لوگوں میں بہت سے آدمی غلط کار ہیں کیا یہ لوگ جاہلیت کے زمانہ کے حکم کی تم سے بھی امید رکھتے ہیں اور یقین کرنے والے لوگوں کے لیے خدا کے حکم سے بہتر کس کا حکم ہوگا۔

آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے کا زمانہ جو تقریباً پونے سات سو سال کا تھا۔ جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ یہ نوعِ انسان کی انتہائی پستی کا دور تھا۔ ان کے تمدن و معاشرت میں جو قوانین رائج تھے وہ قبیلہ کے سردار کا حکم تھا جو ان کے لیے ناقابلِ انکار تھا۔ آنحضرتؐ کے عہد میں جو قبائلِ عرب پائے جاتے تھے وہ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے۔ خانہ کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرتے۔ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ زناکاری کو فخر سمجھتے تھے۔ باطل اشعار کہنے کا گھر گھر چرچا تھا۔ قتل۔ غارت گری۔ جوا وغیرہ ان کے محبوب مشغلے تھے۔ جب حضورؐ نے ہدایت کا کام شروع کیا، تو وہ لوگ بہت گھبرائے۔ اپنے معمول کے خلاف کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ چاہتے تھے کہ حضرتؐ ان کی خواہشوں کے مطابق ان کے معاملات میں فیصلے کریں۔ اللہ نے اپنے رسول کو اس سے روکا اور کہہ دیا اگر نہیں مانتے تو ان کو چھوڑ دو تاکہ اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؕ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

اے ایمان والو، تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ یہ تمہارے دشمن ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے دوست

ہیں جو ان کو اپنا سرپرست بنائے گا وہ انہی میں سے ہو جائے گا بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ جن لوگوں کے دل میں نفاق کا مرض ہے تم دیکھو گے وہ انہی کافروں کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ ان لوگوں سے نہ ملنے میں ہم پر کوئی مصیبت نہ آجائے پس عنقریب خدا (مسلمانوں کی فتح یا کوئی اور بات اپنی طرف سے ظاہر کر دے گا تب یہ لوگ اپنی بدگمانی پر جو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، شرمائیں گے اور (مومنین پر) جب ان کا نفاق ظاہر ہو جائے گا تو کہیں گے یہی تو وہ لوگ ہیں جو سخت سخت قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے ہم صرف تمہارے ساتھ ہیں ان کا سب کیا کرایا اکارت ہوا اور سخت گھاٹے میں آگئے۔

چونکہ مدینہ میں یہودی بہت مالدار اور صاحبِ اقتدار تھے اس لیے مسلمان (منافق) ان سے بہت ڈرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی مخالفت میں ہمارا نقصان ہے۔ لہٰذا یہ منافق چوری چھپے ان سے ملتے رہتے اور ان پر اپنی دوستی کا اظہار کرتے رہتے۔ یہودی ان کو سلام کے خلاف بھڑکاتے اور ڈراتے کہ تمام قبائل اسلام کے خلاف ہیں وہ سب مل کر ایک نہ ایک دن اسلام کا بیڑا غرق کر دیں گے۔ لیکن جب کسی جنگ میں اسلام کو فتح ہوتی تو یہ بدبخت اپنی بدگمانی پر بہت شرماتے۔ ایمان والے ان پر طعنہ زنی کرتے کہ تم نے تو بڑی پکی قسمیں کھائی تھیں کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے۔ تم یہ کیا مضحکہ خیز ڈرامہ کھیل رہے ہو کہ بظاہر ہم سے بھی ملے ہوئے ہو اور بباطن کفار و مشرکین سے بھی۔ ان کے اس نفاق کا نتیجہ خدا نے یہ بتایا ہے کہ ان کا کیا کرایا سب ضبط کر لیا گیا۔ ان کے کسی عملِ خیر کا کوئی اجر ان کو نہیں ملے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۤٮِٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۤءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

ع ۸ / ۱۲

اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے اپنے دین (ایمان) سے پھر جائے گا تو پھر جائے (ہمیں کوئی پرواہ نہیں)۔ عنقریب (تمہاری جگہ) خدا کچھ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت

کرتے ہیں مومنین سے ملتے ہیں تو بڑی انکساری سے کفار کے مقابل ہوتے ہیں تو بڑے کرارے نظر آتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہیں کرتے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اس کے سوا نہیں کہ تمہارے سرپرست و حاکم صرف اللہ ہے اور اس کے رسول۔ اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو اپنا ولی و حاکم سمجھے گا (تو وہ لشکرِ خدا میں داخل ہو گا) اور بے شک اللہ کے لشکر میں داخل ہونے والے غالب رہیں گے۔

قرآن مجید میں جابجا ایمان والوں سے مخاطبہ کیا گیا ہے کہیں یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا (اے مسلمانو) نہیں کہا گیا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ ہمت افزائی کے لیے ہر ایک کو مومن ہی کہہ کر پکارتا ہے۔ ورنہ مسلمانوں میں تو بہت سے لوگ ایسے تھے جن کو ایمان سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مثلاً اس آیت میں جن کو مومن کہہ کر پکارا ہے وہ ایسے تھے کہ رسول کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتے تھے کہ اگر آپ نے ہمارا کہنا نہ مانا تو ہم اسلام سے دست بردار ہو کر اپنے سابق دین کی طرف پلٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان ہی کے جواب میں فرماتا ہے اگر پلٹ جاؤ گے تو ہمیں تمہاری کچھ پرواہ نہیں۔ تم کیا اور تمہارا ایمان کیا ہمارے پاس تو ایسے کامل مومن ہیں جن کی صفات یہ ہیں:

۱۔ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ ان کو۔ اللہ کی دوستی کا دعویٰ کرنے والے تو سب ہی مسلمان تھے مگر وہ تو یہاں ایسے لوگوں کا ذکر کر رہا ہے جن کو وہ خود بھی دوست رکھتا ہے۔ کتنا بلند مرتبہ ہے ان لوگوں کا۔ ایسے لوگوں میں سے ایک کی شناخت رسولؐ اللہ نے جنگِ خیبر میں کرائی۔ جب قلعۂ خیبر کسی طرح فتح ہونے میں نہ آیا تو ایک روز لشکر کی ناکامی پر حضورؐ نے فرمایا لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَدًا رَجُلًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ۔ (کل میں اپنا عَلَم ایسے مرد کو دوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا ہو گا اور بھاگ کر آنے والا نہ ہو گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہو گا اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔) دوسرے روز بوقت صبح جس کو رسولؐ نے یہ عَلَم دیا وہ امیر المومنین علی علیہ السلام تھے۔

۲۔ دوسری صفت یہ ہے کہ مومنین سے بہ انکساری پیش آنے والے ہوں گے۔ یہ صفت بھی آلِ رسولؐ سے زیادہ کسی میں نہیں پائی گئی۔ اسلامی تعلیم یہی ہے کہ مومن مومن کے ساتھ نہایت نرمی اور خُلق و مدارا سے پیش آئے۔

۳۔ تیسری صفت یہ ہے کہ کافروں کے سامنے آئے تو شجاعانہ شان سے آئے یہ صفت بھی علیؑ میں بدرجۂ اتم موجود تھی آپ نے کبھی میدانِ جنگ سے فرار نہیں کیا۔ کبھی دشمن سے شکست نہیں کھائی۔ کبھی دشمن کی طاقت کو نظر میں نہیں لائے۔

۴۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہوں گے۔ علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے مجھے تین چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہیں الاکرام الضّیف والصّوم فی الصیف والجہاد بالسّیف (مہمان کی خاطر تواضع۔ گرمی کے موسم کا روزہ اور تلوار سے راہِ خدا میں جہاد کرنا۔

ممکن ہے کہ فرداً فرداً ان صفتوں میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہوں لیکن مِنْ حَیْثُ الْمَجْمُوْع علیؑ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتیں اور ان صفات میں علی علیہ السلام نے وہ درجہ حاصل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک صفت کی تعریف کی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو یہ بتاتا ہے کہ تمہارے ولی یعنی اولیٰ بالتصرف کون کون ہیں۔

لہٰذا یہ ولایتِ مطلقہ خدا نے صرف تین ذاتوں میں محدود رکھی۔ سب سے اعلیٰ حاکم اور اولیٰ بالتصرف خدا ہے اس کے بعد رسولؐ ہیں اس کے بعد تیسرا ولیِ مطلق وہ ہے جو ایمان والا ہے نماز قائم کرنے والا ہے اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے والا ہے یعنی علی بن ابی طالبؑ۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ ولی کے معنی دوست ہیں ان کی بات کان کو نہیں لگتی۔ دوست تو انسان کے بہت سے ہوتے ہیں پھر تین میں ان کا انحصار کیوں کیا گیا۔ ہر مومن مومن کا دوست ہوتا ہے۔

غدیرِ خُم میں رسولؐ اللہ نے اس تیسری ولایت کی توضیح ان الفاظ کے ساتھ کر دی تھی جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے جس کا پورا حال آگے آ رہا ہے۔ تیسرا ولی ایسا ہے جس کی نافرمانی رسول کی نافرمانی ہے اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۵۷ وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۝۵۸ قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۵۹

اے ایمان والو جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور کھیل سمجھتے ہیں اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے اور کافروں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ اور اگر مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو۔ جب تم نماز کے لیے بلائے جاتے ہو تو وہ لوگ تمسخر کرتے ہیں اور کھلواڑ بناتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناسمجھ اور بے عقل لوگ ہیں اے اہلِ کتاب کیا تم اس لیے ہمیں عیب لگاتے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور جو ہم سے پہلے نازل ہوا ہے بے شک ان میں سے اکثر غلط کار (بدکار) لوگ ہیں۔

یعنی جو لوگ اسلام کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور کھیل کی باتیں سمجھتے ہیں مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے دوستی پیدا نہ کریں خواہ اہلِ کتاب ہوں یا کفار ان میں کوئی بھی دوستی کے لائق نہیں کیونکہ اس سے اسلام کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے یہ لوگ دوستی کے پیرایہ میں اپنی متعصبانہ کارروائیوں کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میل جول رکھنے والے سب منافق تھے۔

لوامع التنزیل میں ہے کہ اذان کو سن کر کفار کی ایک جماعت حضورؐ کی خدمت میں آئی اور کہنے لگی یہ آپ نے کیا نئی چیز جاری کی ہے۔ آپؐ سے پہلے جو انبیاء تھے انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ چیخنا اور بلند آواز سے لوگوں کو اپنی نماز کے متعلق بلانا عقلاً درست نہیں۔ یہ کہہ کر وہ مؤذن کے کلمات کی تمسخرانہ انداز میں نقل کرتے ہوئے چل دیتے تھے۔

مدینہ کا ایک نصرانی جب اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ سنتا تو بے ساختہ کہتا خدا جھوٹے کو جلا کر خاک کرے ایک دن یہ نصرانی بے خبر پڑا سو رہا تھا اس کا لڑکا کسی ضرورت سے اس کی خوابگاہ میں آگ لے کر آیا۔ اتفاقاً ایک چنگاری اس کے فرشِ خواب پر جا گری اور چند منٹ بعد اس سے شعلے بلند ہوئے۔ تھوڑی دیر میں وہ اور اس کے بال بچے اور سارا گھر جل کر خاک ہو گیا۔

تمام ادیان اپنی عبادت کا اعلان غیر فطری طور پر کرتے ہیں یعنی اشرف المخلوقات کی عبادت کا اعلان کرایا جاتا ہے ارذل مخلوق سے جیسے گھنٹہ، سنکھ، ترہی ان سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس مقصد کے لیے ان کو بجایا جا رہا ہے۔ آیا یہ گھنٹہ اسکول کا وقت بتا رہا ہے یا کسی مرنے والے کی موت کی خبر دے رہا ہے یا سنکھ کسی سادھو نے کسی دروازہ پر بھیک مانگنے کے لیے پھونکا ہے یا کوئی تفریحاً ایسا کر رہا ہے یا کسی مندر میں عبادت کے لیے پھونکا جا رہا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام میں جو عبادت کا اعلان کرتا ہے وہ آدمی کرتا ہے اور حَیَّ عَلَى الصَّلٰوۃ کہہ کر بتاتا ہے کہ وہ نماز کے لیے بلا رہا ہے کسی اور کام کے لیے نہیں۔

اسی طرح اسلام کے تمام احکام جن میں کسی مولوی مُلّا نے ترمیم نہیں کی ہے سب فطری اور عقلی ہیں۔ اذان میں جس کسی نے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کا اضافہ کیا ہے وہ حقِ ہدایت پورا نہیں کرتا۔ یہ کلمہ صبح کی اذان میں کہا جا رہا ہے۔ لیکن جو شخص سو رہا ہے اور مکلف نہیں اس پر اس کلمہ کا کیا اثر یا جو قرآن پڑھ رہا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ نماز سونے سے ضرور بہتر ہے میں تو سو نہیں رہا قرآن پڑھ رہا ہوں۔ ہاں جو لوگ نیم خوابی کی حالت میں ہیں ان پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے جب حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اے جاگنے والو چاہے کوئی کام بھی کر رہے ہو اسے چھوڑ دو کیونکہ ہر عمل سے نماز بہتر ہے۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۝۶۰ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ

اے رسول تم ان سے کہہ دو کیا میں تمہیں بتا دوں کہ خدا کے نزدیک سب سے سخت تر سزا کن لوگوں کے لیے ہے۔

سنو، جس پر خدا نے لعنت کی۔ جس پر اس کا غضب نازل ہوا۔ جن میں سے بعض کو بندر اور سؤر بنایا گیا اور جس نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کی پوجا کی یہ لوگ درجہ کے لحاظ سے سب سے بدتر اور راہِ راست سے بہت دُور پڑے ہوئے ہیں۔ اے مسلمانو جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ کفر کو دل میں چھپائے ہوئے آتے تھے۔

وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور کفر ہی لے کر نکلے اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا چھپائے ہوئے تھے تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ گناہ اور سرکشی کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ حرام روزی کھاتے ہیں۔ کتنا بُرا ہے وہ عمل جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو اسلام کی عداوت دل میں چھپائے ہوئے تھے مگر اس لیے ظاہری مسلمان بن گئے تھے کہ قتل سے محفوظ رہیں اور مالِ غنیمت میں ان کو حصہ ملتا رہے۔ اسلام کے احکام پر عمل کرنے سے کتراتے تھے اور شیطانی عمل کی طرف لپکتے تھے آخر غضبِ الٰہی میں آ گئے۔ بندر بنے سؤر بنے مگر پھر بھی عبرت نہ ہوئی۔ تفسیرِ صافی میں ہے کہ جو بندر اور سؤر بنائے گئے وہ اصحابِ سبت تھے اور طاغوت کی پوجا کرنے والے اور گئو سالہ پرست تھے۔

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

اللہ والے اور علماء ان کو جھوٹ بولنے اور حرام مال کھانے سے کیوں نہیں روکتے جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں وہ بہت ہی بُرا ہے۔ یہودی کہتے ہیں خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے (بخیل بن گیا ہے) انہی کے ہاتھ باندھے جائیں اور ان پر خدا کی پھٹکار پڑے (خدا کے ہاتھ کیوں بندھتے) اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ تو جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اے رسول جو کتاب تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اس سے رشک و حسد ان کے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر کو بڑھا دے گا۔ ہم نے (ان کی یہ نافرمانی دیکھ کر) ان کے درمیان عداوت اور کینے کی بنیاد قیامت تک کے لیے ڈال دی جب یہ لوگ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو خدا اُسے بجھا دیتا ہے اور یہ لوگ فساد برپا کرنے کے لیے روئے زمین پر دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور اللہ تو فساد کرنے والوں کو دوست رکھتا ہی نہیں۔

علمائے یہود و نصاریٰ باوجودیکہ اپنی قوم میں طرح طرح کی بدکاریاں دیکھتے تھے مگر ڈر اور لالچ کی وجہ سے روکتے نہ تھے۔ وہ کھُلم کھُلا حرام مال کھاتے تھے مگر علماء کو انہیں ٹوکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ یہودی آنحضرتؐ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے بڑے مالدار تھے جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ مدینہ کے ان باشندوں سے جو بعد میں مسلمان ہو کر انصار کہلائے سُود میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر کے اپنی دولت کو بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کی کفر نوازی اور اسلام دشمنی کی بنا پر ان کو تجارت اور باغات کی آمدنی میں خسارہ ہونے لگا۔ بس کہنے لگے کہ رب بخیل ہو گیا ہے۔ خدا نے ان کے اس قول کی تردید میں فرمایا کہ اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں وہ بخیل نہیں۔ خدا کی لعنت ہو ان کہنے والوں پر (یہ اپنی سرکشی اور بے ایمانی کی سزا بھگت رہے ہیں)۔ قرآن کے نازل ہونے کی وجہ سے یہ رشک و حسد کی آگ میں جلے مرتے ہیں۔ اور ان کا کفر اور ان کی بغاوت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی سزا ان کو یہ مل رہی ہے کہ ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی ہے اور ایک دو نہیں ان میں اکہتر فرقے بن گئے ہیں اور ان میں آئے دن جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک رہے گا۔ جب کبھی یہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے ان کو شکست ہی نصیب ہوئی۔ اس طرح جب انہوں نے فساد برپا کرنا چاہا تو اسکی لپیٹ میں خود ہی آ گئے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو خدا کے نیک بندے اس کی لپیٹ میں کیوں آ جاتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ نیک بندے اس لیے مبتلائے عذاب ہوتے ہیں کہ انہوں نے غلط کاروں کو بُرے کام کرنے سے روکا کیوں نہیں۔ اگر وہ نہ مانتے تھے تو ان کا بائیکاٹ کیوں نہ کیا۔ پس گویا ان کے جرائم میں وہ بھی شریک تھے ان کے نہ ٹوکنے سے گنہگاروں کی ہمت بڑھ گئی۔

حضرت شعیبؑ کو وحی ہوئی کہ میں تمہاری قوم کے ایک لاکھ آدمیوں پر عذاب نازل کروں گا جن میں چالیس ہزار بد ہوں گے اور ساٹھ ہزار نیک انہوں نے عرض کی خداوندا بد تو خیر عذاب کے مستحق ہیں ہی لیکن نیکوں پر کیوں عذاب نازل ہو گا۔ وحی ہوئی اے شعیب چونکہ ان لوگوں نے بدوں کی طرف سے غفلت کی اور مجھ سے سرکشی کرنے پر نہ ان پر غصہ کیا اور نہ اظہارِ نفرت، نہ ان کو چھوڑ کر ہجرت کی بلکہ ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے رہے اس بنا پر وہ ان کے شریکِ حال رہے۔

یہودی علماء پر جو عذاب آئے اس کی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے روکا نہیں اور نہ نفرت کا اظہار کیا۔ یہ قانون صرف یہودیوں

ہی کے علماء کے لیے نہیں ہے بلکہ مسلمان علماء کے لیے بھی ہے۔ یہاں بھی یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے علماء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کرتے۔ نہ ان کو نیک کاموں کا خصوصیت سے حکم دیتے ہیں نہ ان کا بائیکاٹ کرتے ہیں نہ ہی برائیوں سے روکتے ہیں۔ اس کا خوفناک منظر ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ علماء کے وقار کو اس زمانہ میں جو زبردست دھچکا لگا ہے اس کا خاص سبب یہی ہے۔ اس فرض ناشناسی کی بنا پر پبلک کی نظر سے ان کی وقعت گر گئی ہے۔ قرآن میں یہ قصے یوں ہی وقت گزاری کے لیے نہیں سنائے گئے بلکہ اس لیے کہ مسلمان ان سے سبق حاصل کریں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

ع ۹ / ۱۲

اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور ہم سے ڈرتے بھی تو ہم ان کے گناہوں سے درگزر کرتے اور ان کو نعمتوں سے بھرے باغوں میں داخل کر دیتے۔ اگر وہ لوگ احکام توریت و انجیل پر اور ان کے رب کی طرف سے جو صحیفے نازل کیے گئے تھے ان پر عمل کرتے رہتے تو ان کے اُوپر اور نیچے سے رزق ان پر برس پڑتا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو میانہ رَو ہیں اور اکثر ایسے ہیں جو بُرے کام کرتے ہیں۔ اے رسُول تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اب اس کی تعلیم کر دو اور اگر تم نے اب بھی کر کے نہ دکھایا تو تم نے اس کو یعنی میری رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہ دیا اور (تم ڈرو مت) اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے رکھے گا۔ اللہ کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

ان آیات سے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد خلافتِ امیرالمومنینؑ کا ذکر ہے۔ ربط سابق کو لاحق سے یہ ہے کہ یہودی صرف اس وجہ سے غلط کاری کے راستہ پر لگے کہ انہوں نے خدا کی کتابوں کا درس اُن لوگوں سے حاصل نہ کیا جو اس کے

ذمہ دار بنائے گئے تھے یعنی انبیاؑ اور اوصیائے انبیاؑ۔ اور ان کی بجائے اپنی ہدایت کی باگ ڈور اپنی قوم کے عالموں کے سپرد کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گمراہ ہو گئے۔ پس اے رسول چونکہ تمہاری مدتِ حیات ختم ہونے والی ہے لہٰذا اپنی امت کو اس شخص سے رُوشناس کرا دو جو تمہارے بعد تمہاری امت کی ہدایت کا ذمہ دار ہو گا۔

تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت حج آخر سے واپسی کے وقت جب حضورؐ مقام غدیرِ خم پر پہنچے تو نازل ہوئی ہے۔ یہ آیت چند باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے :

۱۔ خلافتِ علی علیہ السلام کے تعین و تقرر کے متعلق اس سے پہلے کوئی حکم آچکا تھا مگر حضورؐ نے دشمنوں کی مخالفت کے خوف سے اس کو اپنی امت سے بیان نہیں کیا۔

۲۔ غدیرِ خم ایک ایسی منزل تھی کہ حضرت کے تمام ساتھی حج سے واپسی پر ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے اس کے بعد وہ مختلف راستوں میں تقسیم ہو جاتے، لہٰذا یہ تبلیغ کرنا ضروری تھی۔

۳۔ اس امر کی تبلیغ ایسی ضروری تھی کہ اگر اس کو پورا نہ کیا جاتا تو کارِ رسالت اس حد تک ناکام رہتا گویا کچھ کیا دھرا ہی نہ تھا۔

۴۔ صرف تبلیغ یعنی حکم سُنانا ہی کافی نہ تھا بلکہ عملاً اپنے خلیفہ و جانشین کا تقرر کر کے امت کو دکھا دینا ضروری تھا تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نے ان کو دیکھا ہی نہ تھا صرف نام سُنا تھا لہٰذا ہم نے علیؑ سے علیِّ اعلیٰ (خدا) سمجھا تھا۔

۵۔ لوگوں سے مخالفت کا امکان اتنا زیادہ تھا کہ آپ ان کے کھُلم کھُلا اس حکم کی تبلیغ نہیں کر سکے تھے۔

۶۔ غدیرِ خم پر آپؐ ایسے وقت پہنچے کہ حدتِ آفتاب مابین آسمان و زمین آگ برسا رہی تھی۔ کہیں درخت کا سایہ نام کو نہ تھا کیونکہ غدیرِ خم کوئی منزل نہ تھی۔ ایسی کڑی دھوپ میں جلتی بلتی ریت پر لوگوں کو بٹھا کر اس حکم کی تبلیغ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس خلافت کا رسالت سے کوئی بڑا گہرا تعلق ہے ورنہ لوگوں کو اتنی زحمت کیوں دی جاتی۔

۷۔ اعلان کی صورت یہ تھی کہ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو پالانِ شتر کا ایک منبر بنایا گیا۔ اس پر چادر ڈالی گئی۔ اور حضورؐ اس پر تشریف فرما ہوئے۔ علی علیہ السلام کو منبر کے پاس اپنے داہنے ہاتھ کے قریب کھڑا کر لیا۔ پہلے ایک طولانی خطبہ بیان فرمایا اپنے مرنے کی خبر دی۔ اپنی تبلیغ کا مفصل ذکر کیا۔ اپنے بعد اپنے اہلبیتؑ سے تمسک کا حکم دیا۔ پھر فرمایا لوگو! کیا میں تم پر تمہارے نفسوں سے زیادہ صاحبِ حکومت و تصرف نہیں؟ ہر طرف سے آواز آئی ضرور ایسا ہی ہے۔ تب فرمایا، مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔ (جس کا حاکم میں ہوں اس کا حاکم علی بھی ہے)۔ پھر علیؑ کے حق میں دُعا فرمائی "یا اللہ جو اس کی مدد کرے اس کی مدد تو بھی کر جو اس کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو۔ جو اسے ذلیل کرے تو بھی اسے ذلیل کر جو اس سے لڑے تو بھی اس سے لڑ۔"

۸۔ جب فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ فرمایا تو علیؑ کا بازو پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ سفیدئ زیرِ بغل نمایاں ہو گئی۔ یعنی نام لے کر سُنایا اور بازو پکڑ کر دکھایا۔ اشارہ کر کے سمجھایا۔ اس سے زیادہ مؤثر معرفت اور کیا ہو گی۔

۹۔ سب نے مبارکباد دی۔ حضرت عمرؓ نے بھی ان الفاظ میں مبارکباد دی۔ بَخٍّ بَخٍّ لَكَ يَا ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ اَلْيَوْمَ اَصْبَحْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ (اے علیؑ، مبارک ہو مبارک ہو کہ آپ آج سے میرے بھی مولا بن گئے اور تمام مومنین و مومنات کے بھی)۔

١٠۔ حسان بن ثابتؓ نے یہ تو یرِ مسرت سُن کر نہایت جوشیلے انداز میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا ۔

فَقَالَ لَهٗ قُمْ یَا عَلِیُّ فَاِنَّنِیْ　　رَضِیْتُکَ مِنْ بَعْدِیْ اِمَامًا وَّ ھَادِیًا

رسولؐ نے فرمایا، اے علیؑ کھڑے ہو جاؤ، میں نے اپنے بعد تمہیں امام و ہادی بنانا پسند کر لیا۔

جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اُن کو لکھ دیا۔ اب ضرورتِ خلافت اور لفظِ مولیٰ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنی ہے۔ اس حدیث میں مولا کے دوست اور ناصر کسی وجہ سے نہیں ہو سکتے ۔

(١) آیۂ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (مومن آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں) کے بعد غدیرِ خُم میں اس اہتمام سے علیؑ کی دوستی کا اعلان ایک غیر ضروری کارروائی قرار پائے گی۔

(٢) اگر مولا کے معنی دوست و ناصر ہوتے تو حضرت عمرؓ کی مبارکباد بے معنی قرار پاتی ہے۔ کیونکہ جب وہ پہلے سے علیؑ کے دوست تھے تو یہ کیوں کہا کہ آج سے تم میرے اور ہر مومن و مومنہ کے دوست ہو گئے۔ ورنہ اس قول سے ثابت ہو گا کہ وہ علیؑ کے دوست پہلے سے نہ تھے ۔

(٣) اگر مولا کے معنی حاکم اور اولیٰ بالتصرّف کے نہ تھے تو حسان بن ثابتؓ نے اماماً و ہادیاً کا لفظ کیوں استعمال کیا۔

(٤) اگر مولا کے معنی دوست و ناصر تھے تو حرث بن نعمان نے جو عربی زبان کا اہلِ زبان تھا، طیش میں کیوں آیا اور خدا سے اپنے اُوپر عذاب نازل کرنے کی دُعا کر کے ہلاک کیوں ہوا ؟

(٥) اگر علیؑ کی دوستی اتنی اہم تھی کہ بغیر اس کے اعلان کے کارِ رسالت ناتمام رہتا تھا تو پھر آنحضرتؐ کے بعد علیؑ سے دشمنی کیوں روا رکھی گئی۔ اس صورت میں لازم آئے گا کہ جو مسلمان علیؑ کے دوست نہ تھے وہ رسولؐ کے بھی دوست نہ تھے ۔

(٦) بطور براعت استہلال جب حضورؐ نے پہلے یہ فرمایا تھا، اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ (کیا میں تمہارے نفسوں پر تم سے زیادہ اولیٰ بالتصرّف نہیں ہوں۔) تو اس کے بعد مولا بمعنی دوست لینا بلاغت سے گرا دینا ہے۔ جب تک مولا بمعنی اولیٰ نہ ہو کلام کا لطف غائب ہو جاتا ہے ۔

(٧) جب تک کسی تحریک کی بقا کا دوامی بندوبست نہیں کیا جاتا، کچھ دن بعد وہ تحریک مردہ بن کر رہ جاتی ہے اور محرّک کی تمام محنت برباد ہو جاتی ہے۔ ہر تحریک کو آگے بڑھانے والے کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک کی رُوح اور اس کام کی حقیقت کو سمجھے ہوئے ہوتے ہیں صرف مُردہ باد یا زندہ باد کہنے والوں کے سہارے کوئی تحریک نہیں چلتی۔ خدا نے اپنے رسولؐ کو یہی بتایا کہ اگر تم نے اپنی نبوّت کی بقا کا قیامت تک کے لیے بندوبست نہ کیا اور اپنا جانشین مقرر کیے بغیر دُنیا سے چلے آئے تو اسلام کے بدن سے اس کی رُوح نکل جائے گی صرف ڈھانچہ رہ جائے گا۔ نام رہے گا معنویت رُخصت ہو جائے گی۔

(٨) حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان یُوں تو سرکارِ دو عالمؐ بار بار کرتے رہے لیکن اس شدّ و مد سے اعلان کبھی نہ ہوا تھا جیسا کہ ١٨ ذی الحجہ ١٠ھ میں مقامِ غدیرِ خُم میں کیا گیا۔

(٩) اس امر کو سمجھتے ہوئے کہ لوگ غدیرِ خُم کے اعلان کو بھول جائیں گے یا نظر انداز کر دیں گے حضورؐ وقتِ آخر ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ مگر ایسا لکھنے کا موقع نہ دیا گیا۔ بہر حال حُجت ہر طرح تمام کر دی گئی۔ آگے اسلام جانے اور مسلمان ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

اے رسولؐ تم کہو اے اہلِ کتاب جب تک تم توریت و انجیل اور صحیفوں پر جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں عمل نہ کرو گے تو تمہارا مذہب کچھ بھی نہیں۔ تمہارے ربّ کی طرف سے جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اس کے رشک و حسد (میں یہ لوگ مرے جاتے ہیں) اور اُن میں سے بہتیروں کی بغاوت اور کفر پرستی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ پس تم اس کافر قوم پر ذرا افسوس نہ کرو۔ بے شک جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور یہودیوں میں اور نصرانیوں میں سے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لے آئے ہیں اور اُنہوں نے اچھے اچھے کام کیے ہیں، ان کے لیے (روزِ قیامت) نہ خوف ہو گا نہ حُزن ۔

یہودیوں اور نصرانیوں کے پاس توریت بھی تھی اور انجیل بھی اور انبیاءؑ کے صحیفے بھی، مگر عمل میں کورے تھے پھر ایسے مذہب سے کیا فائدہ۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کو سُن سُن کر اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی توجہ اس طرف دیکھ کر آتشِ حسد و بغض سے جلے مرتے تھے اور ان کی سرکشی اور کفر پرستی بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ یعنی وہ ہر تعلیمِ قرآن سے انکار کرنے پر تُلے بیٹھے تھے ۔ رسولؐ سے کہا جاتا ہے تم ان کافروں کی حالت پر ذرا افسوس نہ کرو، مرتے ہیں تو مرنے دو۔ ہاں جن یہود و نصاریٰ وغیرہ نے اسلام قبول کر لیا، خدا اور آخرت پر ایمان لے آئے، بے شک وہ عذابِ آخرت سے بے خوف ہو گئے ۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا

وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہدو پیمان لے لیا تھا اور ہم نے ان کے پاس اپنے رسولوں کو بھی بھیجا۔ بس جب کوئی رسول ان کے پاس ان کی مرضی کے خلاف حکم لے کر آیا تو ایک گروہ نے تو ان کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ نے انہیں قتل کر ڈالا اور یہ سمجھ لیا کہ ایسا کرنے میں ان کے لیے کوئی خرابی نہ ہو گی۔ پس اندھے بہرے بن گئے۔ (کہ حق بات نہ دیکھتے تھے نہ سنتے تھے)۔ پھر اللہ سے انہوں نے توبہ کی۔ پھر ان میں سے اکثر اندھے بہرے بن بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس کا دیکھنے والا ہے۔ بے شک ان لوگوں نے کُفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو بس مسیح بن مریم ہیں حالانکہ مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی۔ بے شک جو شرک باللہ کرے گا تو اللہ نے اس پر جنّت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔

باوجودیکہ بنی اسرائیل اپنے انبیاءؑ کے سامنے اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا پُورا پُورا اقرار کر چکے تھے مگر پھر بھی ان کی یہ حالت رہی کہ جب بھی اپنی مرضی کے خلاف حکم سُنتے تو فوراً اس نبی کو جُھٹلانے لگتے۔ اور جب وہ ذرا سختی سے کام لیتے تو ظالم ان کو قتل کر ڈالتے۔ وہ تو آیاتِ الٰہی کو نہ پڑھتے تھے نہ سُنتے تھے بس جو کچھ ان کے دل میں آتا تھا کر بیٹھتے تھے۔ بعد میں کچھ تو ان میں سے اپنی بداعمالی پر نادم ہو کر اللہ سے توبہ کرتے تھے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہ توبہ ٹوٹ جاتی تھی اور پھر وہی شرارتیں کرنے لگتے تھے۔ نصارٰی نے تو یہ غضب ڈھایا کہ مسیح کو خدا مانتے تھے۔ حالانکہ مسیح نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ یہی اپنی امّت سے کہتے تھے کہ اس خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا ربّ ہے۔

قرآنِ کریم میں جا بجا اہلِ کتاب کی مذمّت وارد ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کثرت انبیاءؑ ان میں پیدا ہونے کے نہ اُن کی ایمانی قوّت درست ہوئی نہ اخلاقی۔ یہودیوں سے زیادہ دُنیا میں کوئی قوم غلط کاری، سفّاکی، بے ایمانی و بداخلاقی میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ نیز جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ یہودی سب سے زیادہ اسلام کے دشمن تھے لیکن علمائے نصارٰی ان سے کہیں زیادہ نرم دل تھے اور اسلام کی طرف مائل بھی تھے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٦﴾

بُھلا کفر کیا اُن لوگوں نے جو کہتے تھے کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔ حالانکہ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو کچھ یہ لوگ بکواس کر رہے ہیں اگر اس سے باز نہ آئے تو سمجھ لیں کہ جو لوگ ان میں سے کافر رہ جائیں گے ان پر دردناک عذاب نازل ہو گا تو یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں توبہ کیوں نہیں کرتے اور اپنے قصوروں کی معافی کیوں نہیں مانگتے۔ اللہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح بن مریم تو بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں ان کی ماں بھی خُدا کی سچّی بندی تھیں وہ دونوں (عام آدمیوں کی طرح) کھانا کھاتے تھے۔ اے رسول غور تو کرو ہم اپنے احکام کیسے کیسے صاف صاف بیان کرتے ہیں پھر دیکھو تو یہ لوگ کہاں بھٹکے جا رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی ناکارہ چیزوں کی عبادت کرتے ہو جن کو نہ نقصان پہنچانے کا اختیار ہے نہ نفع کا۔ اللہ تو سب کی سُنتا اور ہر بات کو جانتا ہے۔

نصارٰی کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کارخانۂ عالم تین کے یدِ قدرت سے چل رہا ہے۔ ایک خدا دُوسرے رُوح القدس تیسرے مسیح بن مریم۔ یہ تینوں مل کر ایک خدا بن گئے ہیں۔ ایک تین ہیں اور تین ایک ہیں ان کو وُہ اقانیم ثلاثہ کہتے ہیں۔ یہ کیسا غلط اور خلافِ عقل عقیدہ ہے۔ ذرا اس پر غور کیجئے:

ا۔ اگر یہ تین ہر بات میں اتفاقِ رائے رکھتے ہیں تو ان تین کی ضرورت کیا۔ جب سب کی رائے ایک ہی ہے تو یہ سب کام ایک ہی ذات انجام دے سکتی ہے اور اگر اُن کی رائے میں اختلاف ہے ایک کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ تو اس صورت میں نظامِ عالم برقرار کیسے رہ سکتا ہے۔ اس میں فساد کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ جبکہ ہر ایک اپنی مرضی کے مطابق چاہتا ہے۔

۲۔ اگر ایک کو دُوسرے کی احتیاج ہے تو محتاج اِلَی الغیر مدبّرِ عالم اور قادرِ مطلق نہیں ہو سکتا۔
۳۔ اگر مسیحؑ خدا کے جزو ہیں تو جب تک وہ پیدا نہ ہوئے تھے وجودِ خدا ناقص تھا اور جب نہ رہیں گے تو پھر ناقص ہو جائے گا۔
۴۔ جب بطنِ مریمؑ سے مسیحؑ پیدا ہوئے تو وہ حادث ہوئے یعنی پہلے نہ تھے پھر ہوئے اور خدا حادث نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اس کے لیے تو کوئی وقت و زمانہ نہیں کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا پس حادث و قدیم ایک ذات کیسے ہو گئے۔
۵۔ ذاتِ واجب الوجود خدائے واحد میں ایسی کیا کمی تھی جس کو پورا کرنے کے لیے اُس نے رُوح القدس اور مسیحؑ کو اپنا شریکِ کار بنایا۔ اور مسیحؑ نے اس کے ساتھ رہ کر کائنات کی کارسازی میں کیا خدمت انجام دی۔
۶۔ کیا ایسی کمزور ذات بھی خدا کہلائی جا سکتی ہے جس کو لوگ پکڑ کر بعقیدہ نصاریٰ سُولی پر چڑھا دیں اور وہ گھبرا کر خدا سے فریاد کرے، اِیلِیْ اِیلِیْ لِمَا سَبَقْتَنِیْ (اے میرے معبُود تُو نے مجھے ان دشمنوں میں کیوں چھوڑ دیا)۔
۷۔ مذکورہ بالا آیت میں مسیحؑ اور مریمؑ کے حدوث کا اللہ تعالیٰ نے یہ ثبوت بیان فرمایا ہے کہ وہ دونوں تو عام آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے تھے یعنی محتاجِ غذا تھے اپنی ذات کی بقا کے لیے۔ بے شمار موقعوں پر خدا کے محتاج تھے پھر وہ خدا کیسے ہو گئے۔
۸۔ مسیحؑ کو خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرنے والے اس پر غور نہیں کرتے کہ جب مسیحؑ خود خدا کی عبادت کرتے تھے تو اُن کی عبادت کیسے جائز ہوگی۔ وہ تو نہ بذاتِ خود کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت رکھتے تھے نہ نقصان پہنچانے کی جو کرتے باذنِ خدا کرتے تھے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾

اے رسول یہ کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب تم اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو۔ اور نہ اس قوم کی خواہشاتِ بد کی پیروی کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکی ہے جنہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور صحیح راستہ (خدائی راستہ) سے خود بھی بھٹک گئے۔ بنی اسرائیل کے کافروں پر داؤد اور عیسٰی بن مریم نے لعنت کی ہے۔ یہ اس بنا پر کہ اُنہوں نے خدا کی نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کر گئے تھے اور جس بُرے کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس سے باز نہ آئے اور کیے چلے گئے اور جو کام وہ کرتے تھے کیسا بُرا تھا تم اے رسول ان یہودیوں میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ کفّار سے دوستی رکھتے ہیں جو سامان پہلے سے ان لوگوں نے اپنے واسطے مہیا کیا ہے وہ کتنا بُرا کام ہے (جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ ان پر غضبناک ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی خدا کے سب سے زیادہ نافرمان بندے تھے۔ جن پر انبیاءؑ نے لعنت کی ہو جن پر خدا کا غضب نازل ہو ان کی نجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہودیوں کا اس پر یہ کہنا کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ ہم اللہ کے دوست ہیں ہم کو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں، مجنوں کی بڑ سے زیادہ نہیں۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾

اگر یہ یہودی اللہ اور رسول پر اور اس کتاب پر جو رسول پر نازل کی گئی ہے ایمان لائے ہوئے ہوتے تو کافروں کو اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر لوگ بدکار ہیں۔ اے رسول ایمان والوں سے سخت ترین عداوت رکھنے والے یہودی ہیں اور مشرکین۔ ان سے دوستی کرنے میں سب سے زیادہ قریب اُن لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ عالم اور عابد ہیں اور وہ تکبّر نہیں کرتے۔

یہ آیت عام نصاریٰ کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ نصارائے حبشہ کے بارہ میں ہے کیونکہ جب جناب جعفرؓ مع اپنے ساتھیوں کے حبشہ پہنچے تھے اور نجاشی بادشاہِ حبشہ نے قرآن اور آنحضرتؐ کے معجزات کو سُنا تھا تو وہ ایمان لے آیا تھا۔ اور جب جعفرؓ وہاں سے واپس ہوئے تھے تو اُس نے ستّر علما کو اُن کے ساتھ کیا تھا۔ جب یہ لوگ آنحضرتؐ کے سامنے آئے تو حضرتؐ نے ان کے سامنے سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کی وہ علما اسے سُن کر بہت روئے اور ایمان لے آئے۔ کہنے لگے قرآن انجیل سے کتنا مشابہ ہے۔

فہرست موضوعات

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ساغر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی

۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا احمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی

۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم